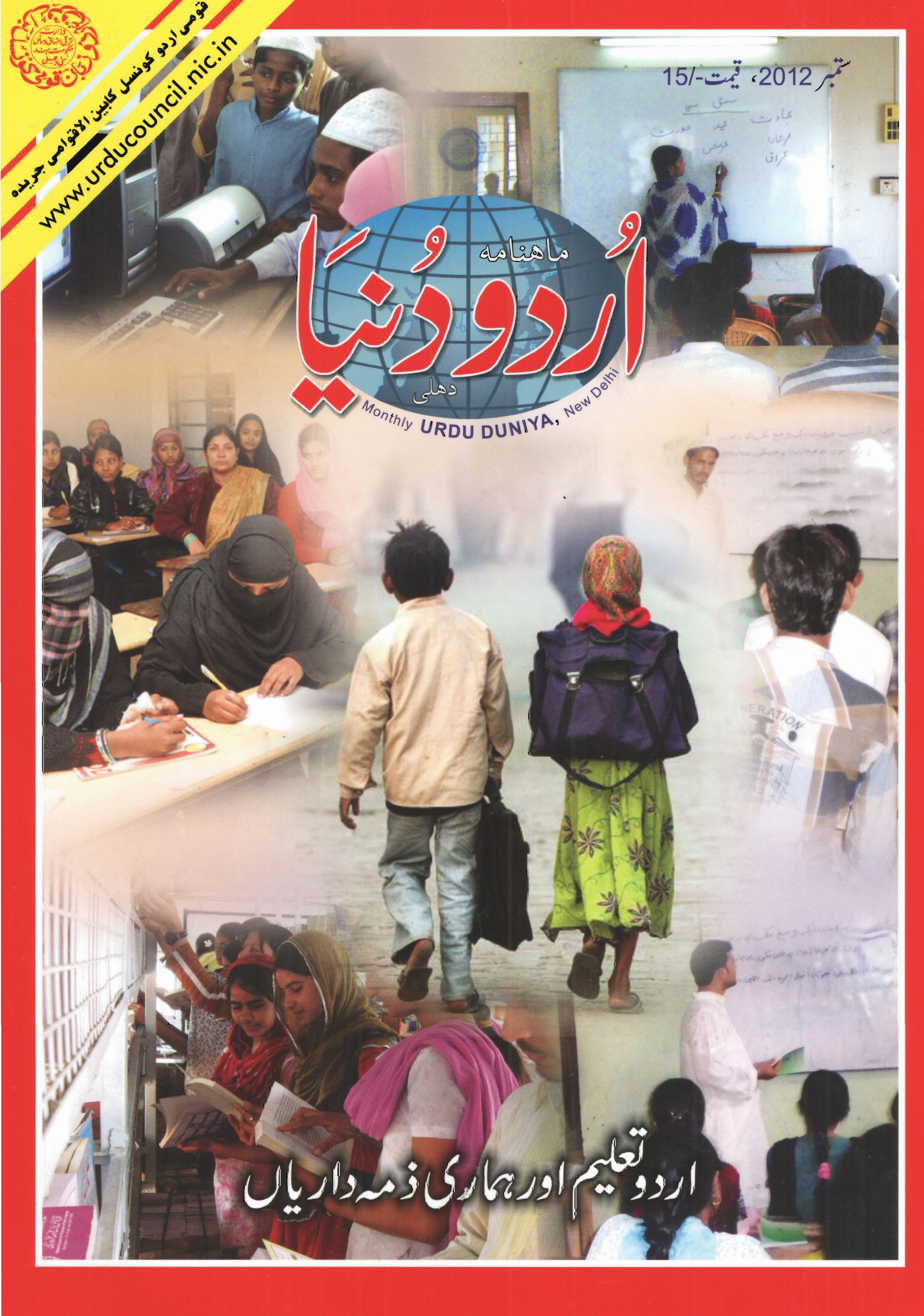

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in
ستمبر 2012، قیمت -/15
ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
اردو تعلیم اور ہماری ذمہ داریاں

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

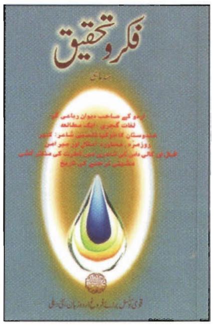

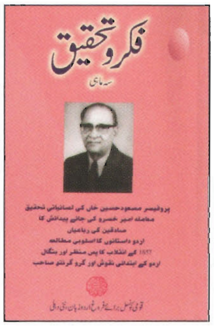

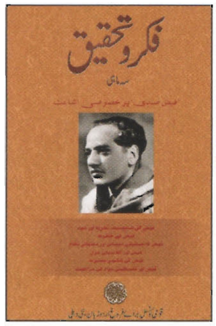

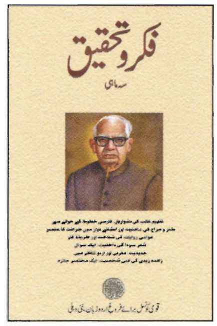

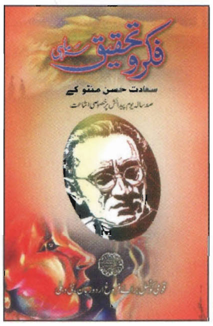

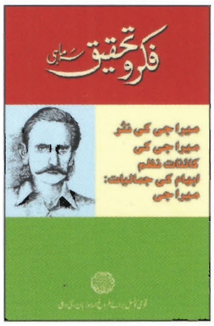

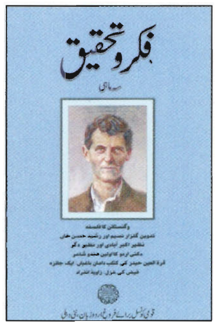

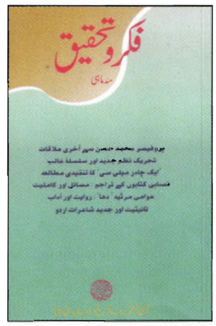

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com

مشمولات

ماہنامہ اردو دنیا

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:14، شمارہ:09، ستمبر 2012

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا

انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000

(شعبۂ ادارت:49539009)

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

email: urduduniyancpul@yahoo.co.in

urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7

آر کے پورم، نئی دہلی - 110066

فون: 26109746

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون: 24415194 - 040

اداریہ

ہماری بات — 2

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 3

انٹرویو

گوپال داس نیرج — فاروق ارگلی — 6

شخصیات

کرشن چندر! تجھے سلام — مہاراجکر سنگھ ایشر — 10

خراج عقیدت

ڈاکٹر شریف احمد — مظہر احمد — 13

کور اسٹوری

اردو اساتذہ، اردو تعلیم ... — عبدالقادر شمس — 15

اردو کی تدریس اور نصابی کتابیں — محمد اطہر مسعود — 19

زبان و تعلیم

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا مستقبل — محمد افروز عالم — 22

اردو نصاب تعلیم اور چند اہم ادارے — مشتاق صدف — 26

ادبی مباحث

مومن خاں مومن ... — شاکر علی صدیقی — 28

فن پارے کی ترجمانی کے مختلف انداز — مجید بیدار — 31

عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری — محمد کلیم محی الدین — 34

قرۃ العین حیدر عنوانات کے آئینے میں — محمد عرفان — 37

صحافت

کیرلہ کے اخبارات ... — ریاض احمد — 40

ہم نے جنھیں بھلا دیا

مہدی نظمی: شخصیت اور شاعری — سیدہ عصمت جہاں — 42

مشاہیر ادب/نظم

نوح ناروی — عزیزہ بانو — 44

انتخاب کلام — ن م راشد — 47

مشاہیر ادب/نثر

راہی معصوم رضا — ادارہ — 50

نمک — راہی معصوم رضا — 51

فلم

سنیما اور ثقافت — کنور پال سنگھ — 54

تہذیب و ثقافت

ثقافت اور تہذیب میں فرق — مناظر عاشق ہرگانوی — 58

ہماری مطبوعات

ہیرا انجھا — کیفی اعظمی — 60

کیریئر گائڈ

اداکاری میں کیریئر — مالک اشتر نوگانوی — 65

دوسری زبانوں سے

چمپک درخت — سمتیند رناڈک — ترجمہ: محمد ہادی رہبر — 68

صحت

آنکھ، کان، ناک اور گلے کی بیماریاں — زینت سلطانہ — 71

سائنس

زہریلی سبزیوں سے نجات — راشد جمال فاروقی — 74

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف — 76

اشتہار

66واں یوم آزادی — 82

ٹیلی ایڈیشن

اردو دنیا ٹی وی — ادارہ — 84

عالمی اردو نامہ — ادارہ — 85

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 87

ہماری بات

یہ مہینہ ہر سال اپنے پہلے ہفتے میں 'یوم اساتذہ' کی تقریبات کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور تحریک دیتا ہے کہ ہم اساتذہ کے جملہ حالات، ان کے مسائل اور ان کے معیار تدریس کی طرف توجہ دیں، تمام صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کہاں پر کیا کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن جیسے عظیم فلسفی اور ماہر تعلیم کے یوم پیدائش (5 ستمبر 1888) پر منائے جانے والے اس دن کی خاص اہمیت یہی ہے کہ تعلیم و تدریس کے مقدس و محترم پیشے سے وابستہ ان لوگوں کی خدمات پر گفتگو ہوتی ہے جو ملک و قوم کے مستقبل کی تعمیر میں سب سے بڑا حصہ لیتے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہم اردو والے بھی اس طرف توجہ دیتے ہیں؟ 'یوم اساتذہ' پر تمام اساتذہ کی بات ہوتی ہے، لیکن کیا اردو کے مدرسین بھی اس موقع پر کبھی ہماری گفتگو کا حصہ بنتے ہیں؟

سچ یہ ہے کہ اردو زبان کے حال و مستقبل کے بارے میں مرثیہ گوئی اور نوحہ گری ہمارا شعار بن چکا ہے۔ بہت کچھ ہونے پر بھی کچھ نہ ہونے کی شکایتیں دن رات ہمارے لبوں پر رہتی ہیں۔ طرح طرح کے مطالبے ہمارے خلاق ذہن تراشتے رہتے ہیں۔ لیکن اردو اساتذہ کی طرف ہماری توجہ کسی بھی یوم اساتذہ پر نہیں کی جاتی۔ وہ کن حالات میں اردو پڑھاتے ہیں، کتنا معاوضہ انھیں اپنی خدمات کا ملتا ہے، سماج میں ان کا کیا رتبہ ہے، ان کے معیار تدریس اور تعلیمی تربیت کا کیا حال ہے، اس بارے میں کچھ سوچنے کی ہمیں فرصت ہی نہیں ہے، جب کہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اردو کے فروغ کو اردو اساتذہ سے الگ کر کے آپ نہیں دیکھ سکتے۔ بلکہ اردو زبان کیا، دنیا کی کسی بھی زبان کے وجود کو اس زبان کے معلمین سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو اساتذہ کے حالات مجموعی طور پر کم و بیش ویسے ہی ہیں جیسے ملک کے دیگر استادوں کے ہیں۔ لیکن اردو میں صرف وہ مدرسین کسی قدر بہتر حالات میں ہیں جو اعلیٰ تعلیم سے جڑے ہوئے ہیں یا پھر ثانوی درجات کے ان ٹیچروں کا حال نسبتاً ٹھیک ہے جو مستقل سرکاری ملازمت میں ہیں۔ باقی بیش تر اردو اساتذہ کا حال یہ ہے کہ قدم قدم پر ان کا استحصال ہوتا ہے، پرائیویٹ ادارے انھیں کم از کم مقررہ اجرت سے بھی کم تنخواہ دے کر کام لیتے ہیں، اور اس معمولی تنخواہ کے لیے بھی انھیں مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ مدرسوں میں اردو اساتذہ کا حال اور بھی برا ہے، جب کہ انھی مدرسوں کی بدولت اردو خواندگی میں توسیع بھی ہوئی ہے۔

لیکن مسئلے صرف اردو اساتذہ کے معاشی حالات تک ہی محدود نہیں ہیں۔ اردو کی نصابی کتابوں کی بروقت عدم دستیابی، اساتذہ کے کام کرنے کے حالات، ان کے تدریسی معیار کو اپ ڈیٹ کرنے کے نظم کی کمی، اردو کی تدریس سے متعلق مخصوص تربیت کے فقدان اور نظم و نسق کے مسائل بھی ہیں جن کا اردو کے اساتذہ کی کارکردگی سے گہرا تعلق ہے اور جن کی ہم اردو والوں کو فکر کرنی ہوگی۔ سرکاری سطح پر جو کچھ ہو سکتا ہے وہ سرکار کر رہی ہے، اور قومی اردو کونسل نے بھی اس سلسلے میں متعدد اقدامات کیے ہیں۔ لیکن پرائیویٹ تعلیمی اداروں اور دینی مدرسوں میں اردو اساتذہ کے مجموعی مسائل کا حل نکالنے کے لیے اردو سے محبت رکھنے والوں کو ہی آگے آنا ہوگا۔ تبھی ہم حقیقی معنوں میں یہ کہہ سکیں گے کہ 'یوم اساتذہ' اردو اساتذہ کا بھی دن ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو کے اساتذہ، اردو کی گاڑی کے پہیوں کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے بغیر یہ گاڑی ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔

آپ کی بات

وکاس گپتا

A-37، نزد درگا مندر، شادی پور، دہلی 96

'اردو دنیا' اگست 2012 کا شمارہ ملا۔ محترم وسیم بریلوی صاحب کا انٹرویو بے حد پسند آیا۔ اپنے آخری سوال میں نصرت ظہیر صاحب نے وسیم صاحب کی محبت کا ذکر کیا ہے کہ ''اس عمر میں بھی ماشاء اللہ آپ کی صحت قابلِ رشک ہے اور شخصیت میں وہی چمک اور دل کشی اب تک باقی

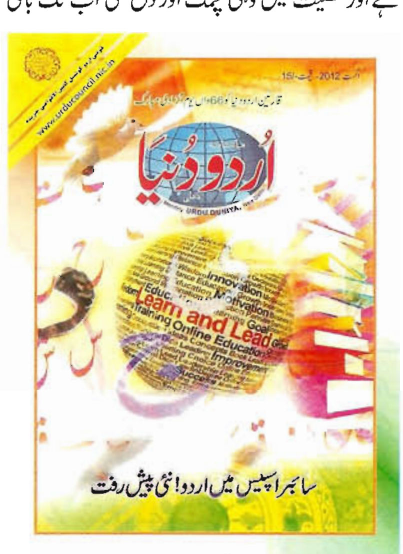

ہے جو پچاس برس پہلے تھی اس کا کوئی خاص راز ہے؟ ولیم شیکسپیئر نے Cleopatra کے لیے کہا تھا: "Age cannot wither her, not custom stoic her infinite variety." افسوس کہ ولیم شیکسپیئر نے ہمارے وسیم صاحب کو نہیں دیکھا ورنہ یقیناً وہ یہ بات اردو کے اس عظیم شاعر کے لیے کہتا۔

اخلاق اثر

صادق منزل، چوک امام باڑہ، بھوپال 462001

آپ کا انٹرویو 'ٹائمز آف انڈیا' میں پڑھ لیا تھا اور ٹیلی میگزین پروگرام 'اردو دنیا' بھی دیکھ لیا تھا جس میں آپ کا استقبال کیا گیا تھا۔ عملی اقدامات کا منتظر تھا جو رواں ماہ کے ٹیلی اردو دنیا میں دیکھ لیا۔ مونتاژ Montage اور ارتقائی مونتاژ (Progressive Montage) میں اہم تبدیلیاں کی گئی ہیں اور غیر متعلقہ افراد کو ان کا قد دکھا دیا گیا ہے۔ برسوں سے پنڈت آنند موہن زتشی کو نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی وفاداری پر حرف نہیں آنے دیا۔ ان کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔ 'اردو دنیا' کے تازہ شمارے میں آپ نے بڑے عالمانہ انداز میں زبان و مذہب کے مقام، دونوں کے بدلتے ہوئے رشتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ سنسکرت اور ہبرو عرصہ دراز تک ایک مذہب کی میراث رہیں۔ ان زبانوں کے ادب نے انسانوں کی عکاسی کی۔ بھاس کے لافانی ڈرامے آج کے مخلوط معاشرے کے داغ و درد کی عکاسی کرتے ہیں۔ سلام بن رزاق کا انٹرویو بہت خوب ہے۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر حواس بیدار ہو جاتے ہیں۔ کاغذ سے مہاراشٹر کی مٹی کی بو اور آب و ہوا کی خنکی محسوس ہونے لگتی ہے۔ انتظار حسین اور فاروقی پر رائے زنی شخصی ہے۔ فاروقی پر کسی بھی رائے دینے والے کے ادبی حسب و نسب کو دیکھنا ضروری ہے۔ 'خبرنامہ' میں شہروں کے پریس ریلیز شامل کیے گئے ہیں۔ شہر نہیں اداروں کے پریس ریلیز ہوتے ہیں۔ اقبال اعزاز 'اردو میں تخلیقی ادب' پر دیا جاتا ہے۔ مدھیہ پردیش کی تہذیب و ثقافت کے کتابچے کے مطابق 09-2008 کا قومی اقبال اعزاز پروفیسر گوپی چند نارنگ کو 'مشہور شاعر و ادیب' کی حیثیت سے دیا گیا ہے۔ 20 مارچ 2012 کو ان کو اپنی تخلیقات پیش کرنا تھیں مگر وہ اسی دن صبح کی پرواز سے دہلی لوٹ گئے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

'اردو دنیا' جون 2012 کا شمارہ حسن طباعت اور کتابت کا بہترین مرقع ہے۔ بڑے غور اور دل چسپی سے مضامین سے بہت زیادہ مستفید ہوا: (1) فخر الدین علی احمد (2) بچوں کی تعلیم: جدید نفسیات (3) عبد المغنی کی اقبال شناسی (4) سیماب اکبرآبادی (5) عہد مغلیہ کے مغربی سیاح (6) گنگا جمنی تہذیب کا سنگم الہ آباد۔ کاش محترم وزیر برائے فروغ انسانی وسائل تعلیم کو انڈسٹری نہ بننے دیں اور اس کے خلاف موثر اقدامات کریں۔ پبلک اسکولوں کی ہزارہا ہزار کی فیس کو کم کریں اور سرکاری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام کریں اور اردو اساتذہ کا تقرر کریں۔ 'اردو دنیا' جولائی 2012 کا شمارہ بھی موصول ہوا اور یہ شمارہ بھی مولانا عبدالماجد دریابادی کے دو پرانے شناس 'ایک مثالی ہوئی تہذیب اور مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط' جن کے ساتھ خاکسار کا نوٹ بھی شامل تھا شائع نہ ہوئے اور نہ 'اردو دنیا' کے جون 2012 کے بعض مضامین کے بارے میں خاکسار کے تاثرات شائع نہیں کیے گئے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد (اے پی)

'اردو دنیا' کا جولائی 2012 کا شمارہ وقت پر ملا۔ اس کا سرورق بھی فکر انگیز اور علمی آگاہی سے مزین ہے کیونکہ پیشہ ورانہ تعلیمی لیاقت سے فرد کے معاشی و اقتصادی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ مدیر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب نے ہماری بات میں اردو کے تعلق سے نئی باتوں کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو کا کوئی مذہب نہیں۔ یقیناً لیکن مختلف مذاہب والے زبانوں کو اپنا لیتے ہیں تاکہ معاشرہ اور مذہب کی ترویج و اشاعت ہو۔ اداریہ جامع مگر مختصر ہوتا ہے۔ اس میں عمومی موضوعات کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔ اردو کے افسانہ نگار سلام بن رزاق کا انٹرویو ادبی وادبیت سے لبریز ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کو افسانے کے بارے میں حقائق سے کام لیا ہے۔ دیگر ادبی موضوعات اور رسائل کے بارے میں سچائی کا اظہار کر دیا ہے۔ مرادآباد پیتل کے کام کے لیے مشہور ہے۔ ہاتھرس چھاپہ خانہ اور چاقو کے لیے مشہور ہے۔ ایسے مضامین سے ماضی کی یاد تازہ ہونے کے ساتھ شہر مرادآباد کی صنعتی زندگی سے قارئین کو آگہی حاصل ہوئی ہے۔ کلاسیکی ادب میں پریم چند پر عمدہ مضامین و تعارف ہے۔ دیگر مشمولات اور ذیلی عنوانات کے تحت جو مواد پیش کیا گیا ہے۔ وہ قاری کو علمی و عمومی، تہذیبی، ثقافتی، اور ادبی بصیرت و آگہی عطا کرتا ہے۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

اڈیٹر ماہنامہ میڈیا پوسٹ، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

جولائی 2012 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ 'اردو دنیا' کی اشاعت اردو کی بہترین خدمت ہے۔ یہ احساس زندہ ہوتا ہے کہ اردو پوری دنیا میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ ہے۔ خبرنامہ اور علاقائی و قومی خبریں اس بات کی تحریک دیتی ہیں کہ ہمارے شہر میں بھی اردو کا کام ہو۔ آپ کا اداریہ 'ہماری بات' اس بار بھی بہت برمحل اور غور طلب ہے۔ سلام بن رزاق کا انٹرویو، مجاز اور سرجن زہراوی کی شخصیت پر مضمون جانکاری میں اضافہ کرتا ہے۔ دیگر کالم کے مضامین معیاری بھی ہیں معلوماتی بھی اور بے حد دلچسپ بھی۔ پیشہ ورانہ تعلیمی لیاقت مسائل اور امکانات، سہارنپور اور مرادآباد شہر کے بارے میں اس شمارے میں شامل کر کے وہاں کے مسائل سے آگاہ کیا ہے جن لوگوں نے یہ مضامین پڑھے ہیں اور ان کا حل ان کے پاس ہو براہِ کرم وہ ان مسائل کو دور کرنے کی ضرور کوشش کریں۔

چودھری شرف الدین

نعمت اللہ روڈ، نعمت اللہ بلڈنگ، امین الدولہ، لکھنؤ

'اردو دنیا' کا مطالعہ کافی عرصے سے کر رہا ہوں۔ معیاری مضامین، دیدہ زیب چھپائی مہنگا کاغذ اور بہت مناسب قیمت ہر بار خواہش ہوتی کہ مبارکباد پیش کروں مگر بات ٹلتی رہی۔ جون 2012 کا شمارہ سامنے ہے۔ جس میں ایک مضمون خالد حسین خاں کا بوم میرٹھی پر ہے ہم جیسے 85-80 سال کی عمر کے لوگوں کو پرانا زمانہ یاد آ گیا۔ خادم نے بوم میرٹھی خیر نگر کے پاس جہاں ہاپوڑ گڑھ مکتیسر جانے والی بس کھڑی ہوتی تھیں کتابچے بیچتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ مگر 1940 کی بات ہے۔ اور کتابچے خریدتا بھی تھا۔ 2-2 کے یہ کتابچے رتن اینڈ کو دریبہ کلاں دہلی سے چھپا ہے۔ بعد سعی بسیار 15 دن سرگرداں رہا اور کئی عدد کتابچے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ میر جنرل پبلشنگ ہاؤس تحصیل بازار میرٹھ میں چھپے ہیں ایک کتاب جناب سید اعجاز ہاپوڑ میرٹھی نے 8/10 قبل رجسٹری سے بھیجی تھی وہ 2000 کتابوں کے ڈھیر میں لائبریری کی جگہ بدلنے سے کہیں گم ہو گئی ہے۔ کتابچوں میں کسی میں لکھا ہے۔ شیر خاں بوم ساکن ہاپوڑ وارد حال میرٹھ محلّہ چمار دروازہ سابق چپراسی، ان بوسیدہ کتابچوں میں 37 غزلیں ہیں جو بوم میرٹھی نے مشاعروں میں پڑھی ہیں۔ مشاعرہ میرٹھ محلّہ قینچی والا۔ محلّہ جلی کوٹھی، سکندر راو ضلع علی گڑھ، قصبہ بسولی ضلع بدایوں، جلی پور میں پوری ایٹہ، باندہ، ریاست نابھ، انبالہ، ہاپوڑ، میر مکان آل حسین رئیس، اسی طرح اور کتابچے ہوں گے جن میں ہندوستان بھر کے مشاعرے شامل ہوں گے۔ ایک روداد پڑھ رہا تھا کہ آزادی سے بہت پہلے 1925 میں آگرہ میں بڑا مشاعرہ ہوا جس کو سیماب اکبرآبادی نے ترتیب دیا تھا، دور دور سے شعرا آئے تھے۔ جناب فانی بدایونی جو اس

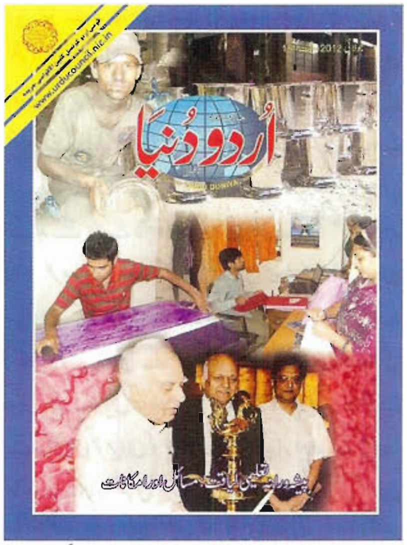

زمانے میں حیدرآباد میں رہتے تھے، آئے تھے۔ لکھنؤ سے ابھرتے شاعر جناب سراج لکھنؤ بھی گئے۔ ان کے شعر ادھم مچاتے تھے:

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

سراج لکھنوی نے پڑھا:

کچھ اور مانگنا مرے مشرب میں کفر ہے
لا اپنا ہاتھ دے مرے دست سوال میں

بہرحال جب بوم میرٹھی کا نام پکارا تو چاروں طرف سے شور کی آواز آئی اس کا مطلب یہ ہے وہ 1935 میں مشہور ہو چکے تھے۔ جناب خالد حسین خاں نے جناب حفیظ میرٹھی اور شمیم جے پوری کے لیے تعریفی کلمات پیش کیے ہیں۔ یہ اپنے وقت کے بڑے شاعر ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بوم میرٹھی کو ان کے زمانے کے بڑے شعرا نے بڑھنے نہیں دیا اور بوم کی موجودگی تک برا سمجھتے تھے۔ غالباً وجہ یہ تھی کہ بوم غریب، مسکین، نادار اور محتاج تھا مگر مشاعروں کو لوٹ لینے کا فن آتا تھا۔ بوم محوِ خواب سامعین کو جھنجھوڑ دیتے تھے۔

میرے پاس امریکہ کا گرین کرڈ تھا اور واشنگٹن کے ان مشاعروں میں جاتا تھا۔ 1990 میں Voiceof America کے اردو سیکشن سے فون آیا کہ آپ 'انجمن ترقّی اردو' اترپردیش کے صدر ہیں۔ آپ سے انٹرویو چاہتے ہیں۔ دن اور وقت طے ہو گیا۔ وقت مقررہ پر پہنچا۔ 4 عہدہ دار دفتر اس وقت موجود تھے، ایک کا تعلق بہار سے، دوسرے صاحب آزاد کشمیر کے۔ تیسری مسز کاظمی جو افضل محل لکھنؤ سے وابستہ تھیں اور چوتھے رضوی صاحب تھے لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی۔ دانش محل کتاب گھر کو برابر یاد کرتے تھے۔ اصل وطن ان کا میرٹھ تھا۔ اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی۔ انٹرویو رضوی صاحب کو لینا تھا۔ جب اسٹوڈیو کو جانے لگے تو راقم نے پوچھا رضوی صاحب آپ میرٹھ میں کون سے محلے میں رہتے تھے۔ بولے میرٹھ کے پاس ایک بستی ہے 'دھولڑی' میں رک گیا پوچھا آپ کا تعلق 'قتل تمیزن' سے تو نہیں۔ وہ اچھل پڑے اور کہنے لگے بڑی پرانی بات آپ کو یاد ہے۔ میں نے کہا یہ بوم میرٹھی کی مہربانی ہے۔ رضوی صاحب بہت متاثر ہوئے گویا ان کے گھر تک رسائی تھی۔ بوم میرٹھی قتل تمیزن سے زیادہ مشہور ہو گئے تھے۔

بات دراصل یہ تھی میرٹھ میں ایک ویلی بازار ہے جو کسی زمانے میں بازارِ حسن تھا۔ ایک خاندان کوٹھے پر رہتا تھا۔ دولڑکیاں حسن میں نگینہ اور گانے میں ماہر ایک نواب زادہ کا تعلق ایک بہن تمیزن سے ہو گیا۔ اس سے نکاح کر لیا اور گھر لے آئے مگر کچھ عرصے بعد تمیزن واپس ویلی بازار چلی آئی۔ لڑکے کے والد نواب صاحب بھی 'تمیزن' سے ملے اور بتلایا لڑکا پریشان ہے۔ مگر ان سے بھی کچھ بدتہذیبی سے بات کی۔ یہ خبر صاحبزادہ تک پہنچ گئی۔ وہ اپنے نوکر اور بندوق لے کر ویلی بازار کوٹھے پر چڑھ گئے اور تمیزن پر کارتوس داغ دیتے۔ وہ موقعہ پر ختم ہو گئی۔ چاروں طرف افراتفری مچ گئی۔ صاحبزادہ گرفتار ہو گئے۔ مقدمہ چلا۔ مگر اس واقعہ 'قتل تمیزن' کو بوم میرٹھی نے منظوم کر کے چھپوا دیا۔ یہ مغربی اضلاع کے گاؤں گاؤں تک پھیل گیا۔ مگر افسوس مجھے یہ منظوم قتل تمیزن کہیں نہ ملا۔ 40 سال بلند شہر کے ایک قصبہ میں کچھ سنا رہے تھے:

میرٹھ میں ایک رہتے تھے خادم حسین خاں
فضلِ خدا سے ان کی تھیں دو لڑکیاں جواں

نمونہ کے لیے دو 70 سال پرانے کتابچے روانہ کر رہا ہوں۔

ایم راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا 480001 (مدھیہ پردیش)

'اردو دنیا' جولائی 2012 کا شمارہ دیکھا جس کا ہر

مضمون علمی تحقیقی اور ادبی حیثیت رکھتا ہے۔قلم کاروں کا اسلوب نگارش انفرادی نوعیت کا حامل ہے۔ سلام بن رزاق سے رحمان عباس کی گفتگو اچھی لگی۔بچوں کے ادب میں پھولوں کی سی معصومیت، تتلیوں کی سی رنگینی اور پرندوں کی سی چہکار ہونی چاہیے، ترجمہ دو زبانوں، دو تہذیبوں اور دو ملکوں کے درمیان ایک پل کا کام کرتا ہے۔ رومانیت، غنائیت اور آوارگی یہ تین عناصر ہیں جن سے مجاز کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے۔ مجاز کی غزلیں آج بھی سرسبز اور شاداب لگتی ہیں۔مہدی حسن نے غزل گائیکی کو اُس مقام تک پہنچا دیا جہاں اس نے موسیقی کے ایک گھرانے کی حیثیت اختیار کرلی۔ ابن صفی نے اپنی زندگی جاسوسی ادب کے لیے وقف کردی تھی۔ان کے ناولوں میں انسانی نفسیات کی موثر عکاسی ہے،ان کے ناولوں پر پاپولر کا ٹیگ لگا کر ادب کے خاص دھارے سے الگ کردیا گیا۔شاعری سے لے کر افسانوی ادب تک مختلف اصناف پر ان کے دستخط نمایاں نظر آتے ہیں۔ منشی پریم چند نے ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا۔ زندگی کو دیہات کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں جا کر دیکھا۔ انھوں نے بے زبانوں کو زبان دی۔

شمیم دیوبندی

(صدر بزم سخن)، فیض کلینک لال مسجد دیوبند

جولائی 2012 کا شمارہ تمام رنگ و آہنگ کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔حسب معمول خوب صورت بھی ہے اور خوب سیرت بھی۔ اگر بات ہماری بات سے شروع کی جائے تو یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ آپ کی اداریے کی ایک سطر ہی گاگر میں ساگر بھر گئی ہے۔ ''زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اردو کا بھی نہیں ہے۔ اسے کسی ایک مذہب کے جاننے والوں نے نہیں بلکہ اس ملک کے تہذیبی و ثقافتی اختلاط نے پیدا کیا ہے۔'' آپ نے بالکل درست فرمایا ہے۔آپ کے اس تخیل نے ذہن و زبان کو جلا بخشی ہے۔ واقعی اردو ہماری گنگا جمنی تہذیب ہے۔ کور اسٹوری اپنی کہانی خود اپنی زبانی بیان کر رہی ہے۔ مراد آباد کے برتن بناتے مزدور کی تصویر دل کو اندر تک جھنجھوڑ گئی۔ گوشۂ مضامین میں زبیر رضوی کا مجاز—— کچھ باتیں، مغیث احمد علیگ کا بطور خراج عقیدت مہدی حسن: مجھے تم کبھی بھی بھلا نہ سکو گے، بہت عمدہ لگے۔ گوشۂ ابن صفی پڑھ کر دل کے کئی دروازے وا ہوئے، ابن صفی کا یہی کمال ہے کہ ہر زاویے سے ان کا جادو قاری کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ آپ کا زبان و تعلیم کا گوشۂ ہمیشہ درس و تدریس کے نظریے سے بڑا قیمتی ثابت ہوتا ہے۔ اس گوشے سے استاد سے لے کر شاگرد تک حسب ضرورت ہمیشہ استفادہ کرتے ہیں۔ پریم چند آج پھر، کرکٹ میچ کے ذریعے بھرپور منورجن کر گئے۔ سائنس، کتابوں کی دنیا، ٹیلی ایڈیشن جہاں تک کارگر ثابت ہوئے۔ وہیں عالمی اردو نامہ اور خبر نامہ اردو ادب کا نایاب خزانہ ثابت ہوا۔ اس خوبصورت شمارے کے

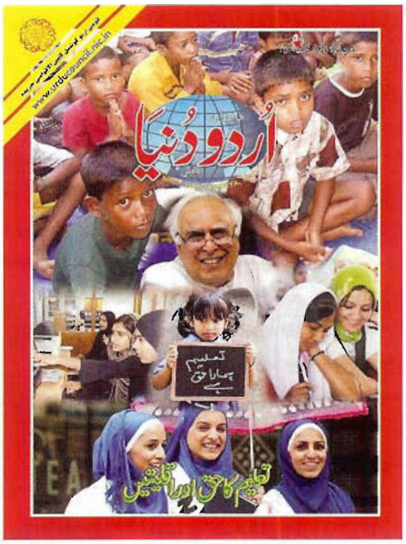

لیے آپ کو اور تمام تر قلمکاروں کو مبارکباد۔ قبول فرمائیں۔

محمد توحید الحق

اسماعیل پورہ، کامٹی، ضلع ناگپور

'اردو دنیا' برائے جولائی کے اداریے بعنوان 'ہماری بات' میں بڑے پتے کی بات کہی گئی کہ ''اردو زبان کی ترقی میں حائل رکاوٹیں، مسلمانوں کی مجموعی پسماندگی سے بھی جڑی ہوئی ہیں۔'' ملکِ عزیز میں جب تک مسلمان خود کو 'مظلوم' سمجھتے رہیں گے، ان کی پسماندگی دور نہیں ہوسکتی۔ ہمیں چاہیے کہ پوری ہمت، حوصلے اور مثبت رویے کے ساتھ اپنی تعمیر میں لگ جائیں:

مرد باید کہ ہراساں نہ شود
مشکلے نیست کہ آساں نہ شود

گوشۂ ابن صفی دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ نصرت ظہیر صاحب نے ترجمے میں ابن صفی کی تاریخ پیدائش 26 جولائی لکھی ہے جبکہ لئیق رضوی صاحب نے 26 اپریل 1928 بتائی ہے۔ ابن صفی کے نام اور اُن کے ناولوں کی طرح ان کی تاریخ پیدائش بھی تو پراسرار نہیں؟

ترجمے میں جو تاریخ تھی وہ مضمون نگار صاحبہ کی دی ہوئی تھی۔ صحیح تاریخ پیدائش کہتے ہیں کہ خود ابن صفی کو بھی معلوم نہیں تھی۔ (ادارہ)

رحیم رضا

رضا منزل، کھرنی پورہ، بیاول ضلع جلگاؤں

اپنی مصروفیات اور دیگر ادبی رسائل کو ایک طرف کر کے ہمیشہ 'اردو دنیا' کا مطالعہ کرتا ہوں ہر ماہ پابندی سے اتنا خوبصورت، معیاری اور معلوماتی میگزین جسے بلاشبہ عالمی میگزین کا درجہ دیا جانا چاہیے۔ اس کی اشاعت پر ادارہ اور آپ کے معاونین قابلِ مبارکباد ہیں۔ ہماری بات سے لے کر، زبان و تعلیم، ادبی مباحث، مشاہیر ادب، تہذیب و ثقافت، سائنس اور سماج، کمپیوٹر تربیت جیسے جدید موضوعات پر دلچسپ اور معلوماتی تحریر کے علاوہ کتابوں کی دنیا اور بہت کچھ یعنی کوزہ میں سمندر ہے۔ جون 2012 کے شمارے میں عبدالمغنی کی اقبال شناسی، سیماب اکبرآبادی پر مضمون و منتخب کلام، تنقید پر اچھوتی تحریر ذہنی تعصب اور معروضیت نیز محمد الیاس اعظمی کی فخرالدین علی احمد پر دلچسپ اور معلوماتی تحریر بے حد پسند آئی۔ البتہ گزشتہ دو تین ماہ سے ادب اطفال پر مبنی بچوں کا گوشہ کی کمی بری طرح کھلتی ہے۔

ایس ایم عباس

88 تارتلہ، جونپور، یوپی

مئی کے شمارے میں کلیات حفیظ پر میرا مضمون قارئین میں اکثر پسند کیا گیا، دور دراز سے پیغامات آئے اور رسائل بھی۔ اس عنایت و کرم فرمائی کے لیے میں بے

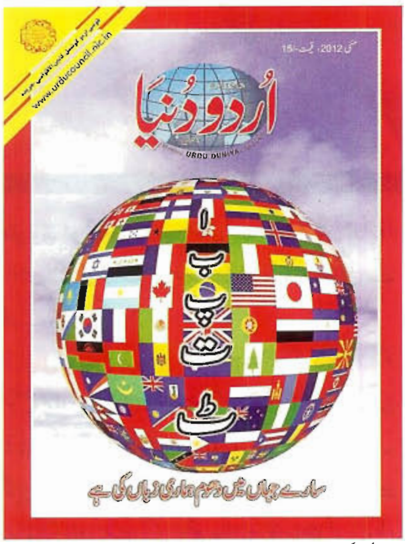

حد شکر گزار ہوں۔ آپ کے بہت سارے خانے اور گوشے ہیں۔ عرصہ بعد اردو دنیا دیکھا تھا۔ ذوق و شوق، محنت و جدت دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔ کوئی صاحب رسالہ چپکے سے اٹھا لے گئے۔ اصاب کے التفات ہیں۔

□

فاروق ارگلی

غزل کی زبان سیکھ لیں تو ملک کا ہر مسئلہ حل ہو جائے: نیرج

گوپال داس نیرج ہندی کے وہ بزرگ شاعر ہیں جنھیں اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ شہرت اور عوامی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے انہیں ہندی کا ساحر لدھیانوی کہا جا سکتاہے۔ نیرج ہندی کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ہندی شاعری کو اردو شاعری کے ڈکشن سے آشنا کرایااور ہندی میں شعریات کی ایک ایسی زمین تیار کی جس میں اردو کی شعری اصناف بالخصوص غزل نے غیر معمولی نشوونما پائی اور آج وہ ہندی کی مقبول ترین صنفِ سخن بن چکی ہے۔ گیت پڑھنے کے منفرد انداز اور دلوں میں اُترجانے والی آواز نے انہیں عہد کا ہر دلعزیز شاعر بنایا۔ اپنی علمیت اور غیرمعمولی جودتِ طبع سے نیرج نے ہندی شاعری میں گیت نگاری کے فن کو ایک نیا موڑ دیا۔ گیت کو پریم، ملن اور برہا، خوشی اور غم کے رومانی موضوعات سے نکال کر انھوں نے زندگی کے گوناگوں تجربات، احساسات اور عصری مسائل کے اظہار کا خوبصورت، مؤثر اور طاقتور وسیلہ بنادیا۔ نیرج کی بے پناہ مقبولیت کا راز ہے ان کی عام فہم زبان ،اُردو غزل کا رنگ و آہنگ اور کلاسیکی تغزل کی غنائیت۔نیرج نے اُردو، برج بھاشااور سنسکرت آمیز ہندی بھاشا کے متوازن امتزاج سے ہندی ادب میں ایک نئے لب و لہجے کو جنم دیا جو ہندستان کی مشترکہ گنگاجمنی تہذیب کی آواز بن گیا۔ وہ گزشتہ نصف صدی سے کوی سمّیلنوں کی جان اور مشاعروں کی شان تصور کیے جاتے رہے ہیں۔ نیرج کی بے پناہ مقبولیت اور عوامی پسندیدگی میں ان کی وجیہہ شخصیت، کشادہ ذہنی، سادہ لوحی اور انسان دوستی کا بھی بڑا دخل ہے۔ درحقیقت نیرج محبتوں کے شاعر ہیں، اپنے ساٹھ برسوں سے زیادہ طویل تخلیقی سفر میں انھوں نے ایک مصرعہ ایسا نہیں کہا جس میں کسی فرد، قوم، ملک ، مذہب یا دوسروں کی تہذیب و روایات کے تئیں تنافر یا بے گانگی ظاہر ہوتی ہو۔ اپنے عہد کے اس نامور شاعر کی پوری زندگی صلحِ کل، سچائی اور انسانیت نوازی سے عبارت ہے۔اردو کے معتبر ادیب و صحافی فاروق ارگلی نے 31 جولائی کو علی گڑھ میں 'اُردو دُنیا' کے لیے نیرج صاحب سے خصوصی انٹرویوکے لیے ملاقات کی۔ 87سالہ بزرگ شاعر نے پیرانہ سالی کی نقاہت اور گھٹنوں کی سخت تکلیف کے باوجود اپنی مخصوص زندہ دلی کے ساتھ تمام سوالوں کے جواب دیے۔فاروق ارگلی 1996 میں عالمی اُردو کانفرنس کی فراق صدی تقریب میں ان سے ملے تھے اور اب 17سال بعد انہیں دیکھا تو محسوس کیا کہ اس دوران تقاضۂ عمر اور مسلسل علالت کے باوجود ان کے چہرے پر پہلے جیسی چمک اور لہجے میں وہی کھنک برقرار ہے جس سے دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے ان کے لاکھوں پرستار انہیں پہچانتے ہیں۔ پیش ہیں نیرج سے طویل گفتگو کے کچھ اقتباسات، جن میں مجاز ،حفیظ جالندھری اور جگر مرادابادی جیسے اردو کے مایہ ناز ادیبوں سے ان کے دیرینہ روابط کی بھی جھلک ملتی ہے۔ ادارہ

فاروق ارگلی: آپ ہندی کے وہ شاعر ہیں جو اُردو والوں کے بھی محبوب ہیں، براہِ کرم اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیں؟

گوپال داس نیرج: میرا جنم 4 جنوری 1925 کو موضع پراولی ضلع اٹاوہ میں ہوا تھا۔ پتاجی کا دیہانت اس وقت ہوگیا تھا جب میں صرف ساڑھے چھ سال کا تھا۔ بچپن بڑی دشواریوں میں گزرا لیکن میری ماں نے مجھے ایمانداری اور ہمت کے ساتھ حالات کا سامنا کرنے کی تعلیم دی۔ پھوپھا کے گھر ایٹہ میں رہ کر انٹرنس پاس کیا۔ پھر حالات ایسے ہوئے کہ ایٹہ سے اٹاوہ آ گیا۔ یہاں مین پوری میں تمباکو کی دُکان پر نوکری کی اور ٹائپنگ کا کام سیکھا۔ پھر حالات کانپور لے گئے، لکھنؤ میں رہا، مختلف نوکریاں کرتے ہوئے تعلیم جاری رکھی۔ فرسٹ کلاس میں بی اے کیا، پھر ہندی ساہتیہ میں ایم اے کیا۔ سرکاری ملازمت کی، کالج میں پڑھایا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شاعری کی۔ یہ قدرت کا انعام ہے کہ میری شاعری نے مجھے عزت، شہرت اور دولت سب کچھ دیا۔

ارگلی: آپ کا شعری سفر کب اور کیسے شروع ہوا؟

نیرج: گیت گانے اور لکھنے کا سلسلہ تو آٹھویں نویں جماعت سے ہی شروع ہوگیا۔ میری آواز اچھی تھی، اسکول میں سب میرا گانا بہت پسند کرتے تھے۔ دوسروں کی رچنائیں گاتے گاتے طبیعت موزوں ہوتی گئی، کویتائیں وجود میں آتی گئیں۔ یہ 1942 کی بات ہے، تب میں دہلی آ گیا تھا، یہاں مجھے سپلائی محکمے میں 67 روپے ماہوار تنخواہ پر ٹائپسٹ کی نوکری مل گئی، ان دنوں میں ایک ڈھابے میں پندرہ روپے ماہوار پر کھانا کھاتا۔ تیس روپے ماں کو بھیجتا اور تنگی ترشی میں بھی مستی سے وقت گزارتا۔ ایک دن اخبار میں پڑھا کہ پہاڑ گنج میں آریہ سماج سبھا کی طرف سے کوی سمّیلن ہونے جا رہا ہے۔ میں وہاں پہنچ گیا، کوی سمّیلن کے آیوجک تھے شری شمبھو ناتھ، میں نے ان سے گزارش کی کہ مجھے بھی کویتا پڑھنے کا موقع دیں۔ انھوں نے کہا کہ کرونیش جی سے ملو، کرونیش جی بہت بڑے کوی تھے۔ انھیں میری صورت دیکھ کر شاید ہمدردی ہوگئی، دوتین کویوں کے بعد مجھے مائک پر جانے کا موقع مل گیا۔ اس وقت میں نے یونہی اپنا نام بتادیا 'بھاؤک اٹاوی'۔ میں نے اپنی کویتا بڑی محنت سے پڑھی، مجھ کو جیون آدھار نہیں ملتا۔ سامعین نے خوب داد دی، تین بار پڑھوایا گیا۔ مجھے پانچ روپے کا انعام بھی ملا۔ میں نے زندگی میں لاکھوں کمائے ہیں مگر ان پانچ روپیوں کی خوشی

کا کوئی بدل نہیں ملا۔ میں دلّی میں مشہور ہوگیا، کوی سمّیلنوں میں بلایا جانے لگا، لوگ طعنے مارتے تھے کہ میں بڑے شاعروں کا کلام چوری کرتا ہوں، لیکن میں نے اس طرف توجہ نہیں دی اور ابھیاس جاری رکھا۔ کچھ دوستوں کے مشورے پر باقاعدہ نیرج تخلص اختیار کیا۔

اردو دنیا: آپ نے ہندی ساہتیہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، لیکن آپ کی شاعری میں اُردو رنگ اور لہجہ بہت نمایاں ہے، کیا آپ نے اُردو پڑھی ہے؟

نیرج: اُردو پڑھنا ضروری نہیں، یہ زبان تو ہمارے پورے ماحول، پورے سماج کی روح میں رچی بسی ہے، سیکھنے کے لیے کوشش نہیں توجہ کی ضرورت ہے۔ میں جب کانپور اور لکھنؤ میں رہا تو وہاں کی علمی و ادبی فضا نے بہت کچھ سکھا دیا۔ وہیں پہلی بار مجاز ردولوی سے ملا تھا، اس کے بعد کئی بار مشاعروں میں ساتھ رہا۔ اسی دور میں یہ بات میرے ذہن میں جم گئی تھی کہ گوڑھ (ادق) ہندی کویتا عوام میں مقبول اسی لیے نہیں ہوتی کہ اس کی زبان غیر مانوس ہے جب کہ اُردو کے اشعار اپنی سادگی، روانی اور مٹھاس کی وجہ سے زبردست قبولیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ گنگا جمنی سنسکرتی سے پیدا ہونے والی یہ ہندوستانی زبان کئی صدیوں سے بھارتیہ سماج پر راج کر رہی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اُردو کو ہندی سے ملاکر آسان لہجے میں اپنی بات کہنی شروع کی، میری کوشش کو امید سے زیادہ سراہنا اور عوام کا پیار ملا۔ میرے ایک ایک مجموعے کے بیس بیس ایڈیشن چھپے، بعض چاہنے والوں نے پچیس پچیس، پچاس پچاس جلدیں خریدیں اور دوستوں کو تحفے میں دیں۔

اردو دنیا: آپ نے پہلی بار کس مشاعرے میں کب شرکت کی؟

نیرج: شاید یہ بات 1944 کی ہے۔ ان دنوں شملہ کانفرنس اور گاندھی-جناح مذاکرات ہوئے تھے۔ چونکہ ہندو مسلم ایکتا کی بھاؤنا میرے خون میں شامل ہے، اس لیے ان دو بڑے رہنماؤں کی ملاقات سے متاثر ہوکر میں نے ایک گیت لکھا۔ ''آج ملا ہے گنگا جل سے جل زمزم کا۔'' دلّی کے ایک کوی سمّیلن میں اس دن میں یہی گیت پڑھ رہا تھا، بہت داد ملی، منچ سے اُترا تو ایک بزرگ شخصیت نے پاس بلاکر پوچھا ''صاحبزادے! آپ کیا کرتے ہیں؟'' میں نے کہا ''ٹائپسٹ ہوں، سپلائی محکمے میں؟'' پوچھا ''کیا تنخواہ ملتی ہے؟'' میں نے کہہ دیا ''ساٹھ روپے۔'' بولے ''کل میرے آفس میں آجائیے۔'' میں وہاں گیا، وہ سانگ اینڈ پبلسٹی کے ڈائرکٹر کا آفس تھا۔ جانتے ہیں یہ ڈائریکٹر صاحب کون تھے؟ وہ تھے اُردو کے مشہور شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری، جن کی شہرت اُردو میں ویسی ہی تھی جیسی رام دھاری سنگھ دنکر جی کی ہندی میں۔ حفیظ صاحب نے فرمایا ''اپنی شاعری کے ذریعے سرکاری اسکیموں کی پبلسٹی کا کام دیکھو، جگہ جگہ کوی سمّیلن، مشاعرے کراؤ۔''

مجھے حفیظ صاحب کی محبت اور یہ کام بہت اچھے لگے۔ میں نے سرکار کی طرف سے کئی شہروں میں کوی سمّیلن کرائے، ان دنوں بنگال میں خوفناک قحط پڑا تھا۔ کلکتہ میں کوی سمّیلن منعقد کرانے گیا تو بھوک اور اکال کے ایسے دل دہلا دینے والے منظر دیکھے کہ روح لرز اُٹھی۔ میں نے اسی کیفیت میں ایک گیت لکھا ''میں ودروہی ہوں، جگ میں ودروہ کرانے آیا۔'' قومی جذبے سے شرابور یہ گیت بہت پاپولر ہوا سنہ 1945 میں دہرہ دون میں ایک سرکاری کوی سمّیلن کرایا۔ وہاں میں نے یہی باغیانہ گیت پڑھا جسے لوگوں نے بہت پسند کیا، لیکن وہاں کے ڈپٹی کلکٹر رشید بخاری صاحب نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں کہا کہ ''نیرج! اب دہلی واپس مت جانا، شاید تم وہاں گرفتار کرلیے جاؤ۔ حکومت کے زیر اہتمام جلسے میں اسی کے خلاف ایسی شاعری پڑھنا سنگین جرم ہے۔''

بخاری صاحب کی بات سن کر میں دلّی نہیں گیا۔ میں ان دِنوں شاہدرہ میں رہتا تھا۔ وہاں کا جو ساز و سامان، کتابیں وغیرہ تھیں وہیں رہ گئیں اور میں لکھنؤ پہنچ گیا۔ دہرہ دون کے اس سرکاری کوی سمّیلن میں حضرت جگر مرادآبادی نے مجھے وہ گیت پڑھتے سنا تھا۔ اگلے دن دہرہ دون میں ایک بڑا مشاعرہ بھی ہونے والا تھا۔ ازراہِ پسندیدگی جگر صاحب نے مشاعرے کی دعوت بھی دی لیکن میں رُکا نہیں، کئی ماہ بعد ایک دن لکھنؤ میں ان سے ملاقات ہوئی، اس دن شہر میں بہت بڑا مشاعرہ تھا، جگر صاحب نے مجھے وہاں پڑھنے کا حکم دیا، وہ صدر مشاعرہ تھے، مشاعرے کا آغاز مجھ سے ہی ہوا، جگر صاحب نے ایک کے بعد ایک تین کویتائیں پڑھوائیں، بہت پسند کیا، مجھے درازیٔ عمر کی دعا دی۔ وہ تھا میرا پہلا مشاعرہ جو غزل کے بادشاہ کے سامنے پڑھا گیا۔ جگر صاحب کا ترنم غضب کا تھا۔ میں نے بہت سے بڑے شاعروں کو جگر صاحب کے انداز میں پڑھتے سنا ہے۔

اردو دنیا: آپ نے خود بھی بہت اچھی غزلیں کہی ہیں، یہ تحریک کس طرح ملی؟

نیرج: اُردو کے نامور غزل گو شاعروں کا ساتھ بڑھا، ان سے قربتیں بھی رہیں، شکیل بدایونی ان دِنوں بی اے کرچکے تھے۔ وہ مشاعروں کی نظامت کیا کرتے تھے، اس وقت میں صرف ہائی اسکول پاس تھا، ملازمت اور شاعری کے ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ شکیل صاحب سے گہرا دوستانہ ہوگیا غزل سے رشتہ بھی گہرا ہوتا گیا۔ مجھے یاد ہے میں نے اسی زمانے میں جذبی صاحب کی مشہور غزل ''اپنی سوئی ہوئی دُنیا کو جگالوں تو چلوں'' کی زمین پر ایک گیت لکھا تھا۔ ''ایسی کیا بات ہے، چلتا ہوں، ابھی چلتا ہوں، گیت اِک اور ذرا جھوم کے گالوں تو چلوں۔'' میں کہوں تو غزل سرتاپا جادو ہے، جو میری کویتا کے سر چڑھ کر بولا۔ میں نے غزل کی بحروں اور زمینوں کو اپنی غزل گیتکا میں ڈھالا بھی، خود بھی غزل کہی۔

اردو دنیا: تمام اصنافِ شاعری یعنی اُردو کی کاویہ شیلیوں میں آپ کو صرف غزل سے ہی اتنی دلچسپی کیوں ہے؟

نیرج: اس لیے کہ اُردو غزل میں قدیم روایتی دوہے کی طرح کم شبدوں میں بڑی سے بڑی بات کہنے کا جادوئی وسیلہ ہے۔ دو مصرعوں میں دیا گیا پیغام سیدھا سننے والے کے دل تک پہنچتا ہے، دنیا کی کوئی اور شیلی اور بھاشا اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ سوچنے، عمل کرنے، گفتگو کرنے اور زندہ رہنے کا سلیقہ سیکھنا ہے تو غزل کے پاس جانا ہوگا۔

اردو دنیا: اُردو اور ہندی میں بہترین نظمیہ شاعری موجود ہے جو بیحد اثر انگیز بھی ہے؟

نیرج: غزل کے ایک شعر کے سامنے چار صفحے کی نظم کا تاثر نہیں کے برابر ہے۔ پابند نظموں کی تو پھر بھی کچھ اہمیت ہے لیکن مغرب کی نقالی میں ترقی پسندی، جن واد اور نئے پن کے نام پر جو آزاد نظم پیدا ہوئی وہ تو کتابوں میں ہی دفن رہے گی، شاعری تو وہی ہے جو عام لوگوں کے ہونٹوں پر مچلتی ہو، غزل کا ایک شعر شاعر کو صدیوں کی زندگی دے دیتا ہے، یاد نہیں پڑتا کب سنا تھا لیکن وسیم بریلوی کا یہ شعر ذہن میں بسا ہوا ہے:

جہاں بھی جائے گا یہ روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا کوئی مکاں نہیں ہوتا

یہ غزل کا کمال ہے کہ آج ہندی میں زور شور سے غزل کہی جارہی ہے، مجھے تو اس کا گیان قدرت نے بہت پہلے دے دیا تھا۔ دراصل اُردو زبان اور غزل میں جو بات خوبصورتی سے کہی جاسکتی ہے وہ روایتی ہندی یا دیش کی کسی اور بھاشا میں کہی ہی نہیں جاسکتی۔ میں کانگریس کے سیکولر جمہوری نظریے کا قائل ہوں لیکن 1976 میں ایمرجنسی کے خلاف آواز اُٹھائی۔ سنسد جانے والے راہی، کہنا اندرا گاندھی سے، بچ نہ سکے گی اب دلّی، جے پرکاش کی آندھی سے، اُنھی دنوں فنا کانپوری صاحب کی غزل سن کر میں حیران رہ گیا۔ زباں بندی اور اظہار کی

پابندیوں کے خلاف وہی بات، وہی تیکھا طنز لیکن کیسی نرمی اور کتنا سلیقہ:

اندھیروں کو نکالا جارہا ہے
مگر گھر سے اُجالا جا رہا ہے
چبھوئے جائیں گے تلوؤں میں نشتر
ابھی کانٹا نکالا جارہا ہے

یہ ہے اُردو غزل۔ ہندی کے کویوں کو اُردو شاعری کا یہ فن سیکھنا چاہیے، مگر یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے، اس کے لیے کھلا ذہن اور ریاضت چاہیے۔ میں نے اُنھی دنوں اظہار کی پابندی کے خلاف غزل کا یہ شعر کہا تھا:

اسی اُمید پہ کرلی ہے آج بند زباں
کل کو شاید میری آواز وہاں تک پہنچے

تو یہ ہے غزل کا اثر جو میری شاعری پر پڑا۔

فاروق: اپنی کوئی غزل...؟

نیرج: (بات پوری کرنے کا موقع دیے بغیر مسکرا کر) سنئے، اسی غزل کے کچھ شعر:

ہم تری چاہ میں اے یار کہاں تک پہنچے
ہوش یہ بھی نہ جہاں ہے کہ کہاں تک پہنچے
صدیوں صدیوں نہ وہاں پہنچے گی دُنیا ساری
ایک ہی گھونٹ میں مستانے کہاں تک پہنچے
وہ نہ گیانی ہیں نہ دھیانی نہ برہمن نہ وہ شیخ
وہ کوئی اور تھے جو تیرے مکاں تک پہنچے
یہ تو معلوم ہے خاموش ہے بستی ساری
پر نہ معلوم یہ خاموشی کہاں تک پہنچے

میں نے 1956 میں ایم اے کیا تھا، تب کملا پتی ترپاٹھی جی نے بیحد قدر دانی کی، وہ ساہتیہ کاروں کا بڑا سمّان کرتے تھے۔ خیر یہ لمبی کہانی ہے۔ سنہ 1955 سے 1970 تک پوسٹ گریجویٹ کالج میرٹھ اور علی گڑھ کے دھرم سماج کالج میں پڑھاتا رہا۔ اس کے بعد آزادانہ لکھنا پڑھنا اور شاعری۔''

ارگلی: آپ فلمی نغمہ نگار کے طور پر بھی بہت مشہور ہوئے۔ آپ کے درجنوں گیت آج بھی بہت مقبول اور سدابہار ہیں۔ لیکن یہ چھٹی اور ساتویں دہائی میں لکھے گئے۔ فلموں میں آپ کیسے پہنچے اور پھر آپ نے یہ مشغلہ جاری کیوں نہیں رکھا؟

نیرج: 1960 میں میرے سمّان میں ایک کوی سمّیلن بمبئی میں ہوا تھا جس میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ سورگیہ وائی بی چوان مہمانِ خصوصی تھے، انھوں نے پانچ ہزار روپے اور شال سے میرا سمّان کیا، وہاں میں نے اپنے گیت سنائے، سامعین میں مشہور پروڈیوسر آر چندرا بھی تھے جنھوں نے 'برسات کی رات' جیسی کامیاب میوزیکل فلم بنائی تھی، چندرا صاحب بھی علی گڑھ کے رہنے والے تھے۔ میرا گیت انھیں اس قدر پسند آیا کہ اگلے ہی دن مجھے اپنی نئی فلم 'نئی عمر کی نئی فصل' کے لیے سائن کرلیا۔ فلم کا جو نغمہ ''کارواں گزر گیا غبار دیکھتے رہے'' سب سے زیادہ مقبول ہوا وہ میرا ایک پرانا گیت تھا جو میں کئی سال پہلے ریڈیو پر پڑھ چکا تھا۔ پاکستان تک سے اس کی پسند کیے جانے کی چٹھیاں آئی تھیں۔ وہی گیت میں نے جوں کا توں میوزک ڈائریکٹر کے حوالے کردیا تھا۔ فلم بننے اور ریلیز ہونے میں پانچ سال لگ گئے تھے، یعنی 1965 میں یہ ریلیز ہوئی، فلم تو فلاپ تھی مگر اس کے گانے اور میوزک ہٹ ہوئے۔ 1967 میں دیوآنند نے اپنی فلم 'پریم پجاری' کے گانے لکھنے کے لیے بمبئی بلوایا۔ میں نے کالج سے دو سال کی چھٹی لی اور بمبئی پہنچا۔ ایس ڈی برمن کی موسیقی میں فلم کا ٹائٹل سانگ بہت پسند کیا گیا۔ ''پریم کے پجاری ہم ہیں، رس کے بھکاری ہم ہیں'' ایس ڈی برمن نے اپنے ہی ایک گیت 'جھنورا دھیرے سے جانا بگین میں'' کی پیروڈی مجھ سے لکھوائی ''دھٹمل دھیرے سے جانا کھٹین میں۔'' ایک اور گیت جو بے پناہ ہٹ ہوا وہ تھا ''جیون کی بگیا مہکے گی مہکے گی چہکے گی''۔ میری دو فلموں کی سلور جبلی ہوئی۔ مجھے بہترین گیت کار کا فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ ایک بار موسیقار شنکر نے میرا گیت رجیکٹ کرتے ہوئے کہا ''میری بنائی ہوئی دُھن پر گیت لکھو، یہ نہیں چلے گا'' میں نے اسی وقت وہ کاغذ پھاڑ دیا۔ شنکر بولے ''ناحق پھاڑ ڈالا، آگے کبھی استعمال ہو جاتا، میں نے کہا، شریمان! میں جوٹھن سینت کر نہیں رکھتا۔ ٹیون بنایئے۔ ٹیون بنی، میں نے گیت لکھا '' لکھے جو خط تجھے، وہ تیری یاد میں، ہزاروں رنگ کے، فسانے بن گئے۔'' رفیع نے گایا۔ آج تک ہٹ گیتوں میں شامل ہے۔ میں نے پانچ برس فلم انڈسٹری میں کام کیا۔ اس دوران میں نے تقریباً سوا سو گانے لکھے۔ سو سے زیادہ ہٹ رہے، میں نے کوشش کی کہ فلمی گیتوں میں ادبی وقار قائم رہے، سستاپن نہ ہو، دیکھیے ''شوخیوں میں گھولا جائے پھولوں کا شباب، اس میں پھر ملائی جائے تھوڑی سی شراب''، ''پھولوں کے رنگ سے، دل کی قلم سے'' جیسے نغموں میں جو تاثر ہے اس کی ہر طرف سراہنا ہوئی۔ دل آج شاعر ہے، غم آج نغمہ ہے، کال کا پہیہ گھومے رے بھیا، جیسے رادھا نے مالا جپی شیام کی، رنگیلا رے، یہ سارے گیت آج بھی ریڈیو، ٹی وی پر پسند کیے جارہے ہیں۔ راج کپور کی بہت بڑی فلم 'میرا نام جوکر' کے لیے گیت لکھا: اے بھائی ذرا دیکھ کے چلو۔ شنکر جی سے اس بے ملکھڑے انترے والی نثری نظم کی دُھن نہیں بن سکی۔ راج بھی پریشان، بول سچویشن کے مطابق بہت اچھے تھے، میوزک ڈائریکٹر کے ہار مان لینے کے بعد میں نے خود طرز بنائی اور اسی طرح گا کر سنایا جیسے منا ڈے نے یہ گانا گایا ہے۔ راج کپور بہت خوش ہوئے۔ 'میرا نام جوکر' راج کپور کا بہت بڑا سپنا تھا۔ فلم بھی اچھی بنی، مگر باکس آفس پر ناکام ہوگئی۔ راج کپور پر جو کچھ بیتی وہ ایک الگ تکلیف دہ کہانی ہے، خود میرا من بھی فلمی گیت کاری سے اُچاٹ ہوگیا، اس کا ایک کارن یہ بھی تھا کہ پروڈیوسروں کی بدقسمتی سے فلمیں تو فلاپ ہوگئیں مگر سنگیت سپرہٹ ہوگیا، کئی پروڈیوسر ڈائرکٹر لوگ کھِلّی اُڑانے لگے کہ جس کو فلم پٹوانی ہو اور گانے ہٹ کروانے ہوں وہ نیرج کو سائن کرلے۔ فلم جگت کو ہاتھ جوڑ نمسکار کیا اور علی گڑھ واپس آکر اپنے کالج میں پڑھانے لگا۔

ارگلی: تیس چالیس سال پہلے کے مشاعروں اور کوی سمّیلنوں میں آپ نے وقت کے ساتھ کیسی تبدیلیاں محسوس کیں؟

نیرج: زبردست پری ورتن دیکھا ہے۔ پہلے تہذیب تھی، لوگ ادبی شوق کے ساتھ شاعروں کو سننے جمع ہوتے تھے۔ اچھے شعر یا کویتا پر داد ملتی تھی، بری پر ہوٹنگ بھی ہوتی تھی، لیکن تہذیب کے دائرے میں۔ اب زیادہ تر سننے والے سمے کاٹنے، تفریح کرنے اور ہوہلّا مچانے جاتے ہیں، شاعر بھی اب زیادہ تر شاعر نہیں رہ گئے اداکار، ممیکری کرنے والے اور چٹکلے بازی یا جذبات بھڑکانے والی تُک بندیاں سنا کر پیسہ کما رہے ہیں۔ اب کہاں ہیں نرالا، سوہن لال دویدی، دنکر، مہادیوی ورما، اور جگر، جوش، مجاز، فراق، احسان دانش، نشور واحدی، آل احمد سرور اور فنا کانپوری جیسی مہان ہستیاں۔ پرانے سنسکار، آداب، رکھ رکھاؤ سب ندارد ہے، سب کچھ کمرشیل ہوگیا ہے، پورے سماج میں یہ پریورتن دیکھا جاسکتا ہے۔ اب پڑھائی لکھائی، گیان اور بصیرت حاصل کرنے کے لیے نہیں صرف اپنی نوکری پانے کے لیے ہے۔ اس کل یگ میں ترقی بھی خوب ہوئی ہے، لوگ امیر بھی ہوئے ہیں، لیکن روحانی اور اخلاقی طور پر دیوالیہ اور کھوکھلے ہوگئے ہیں۔ آج کا طالب علم استاد کو ملازم سمجھتا ہے، اس سے زیادہ گراوٹ اور کیا ہوسکتی ہے۔

ارگلی: آپ اتر پردیش بھاشا سنستھان کے سربراہ رہ چکے ہیں، آپ کو کابینی وزیر کا درجہ حاصل تھا، اس عہدے پر آپ کے تجربات کیسے رہے؟

نیرج: میں سیاسی آدمی کبھی نہیں رہا، لیکن میں اٹاوہ کا باشندہ ہوں، اٹاوہ ہی ملائم سنگھ جی کا وطن ہے، وہ بہت نیچے سے جدوجہد کرتے ہوئے بلندیوں تک پہنچے، میں نے ان کا سنگھرش ایمانداری اور محنت کا وہ دور دیکھا ہے۔ ملائم سنگھ بھی میری زندگی کے ان کٹھن راستوں کے گواہ ہیں۔ ظاہر ہے یہ قدرے مشترک ہم دونوں کے درمیان ایک خاص رشتے کی بنیاد ہے۔ پریم اور سمان کا یہ رشتہ کسی نہ کسی طرح اپنا کام کرتا رہا۔ بھارت سرکار نے مجھے پدم شری اور اس کے بعد پدم بھوشن سے سمانت کیا تب بھی یہ رشتہ سرگرم رہا تھا اور جب وہ پچھلی بار مکھیہ منتری تھے، تو مجھے بنادیا اتر پردیش راج بھاشا سنستھان کا کارگزار چیئرمین! کابینی درجہ، لال بتی کی گاڑی، لکھنؤ میں سرکاری رہائش، اس وقت اودھی، بھوجپوری، ہندی اور اُردو کی ترقی کے لیے بہت سے منصوبے میرے دل میں تھے، لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ منسٹر اور چیف منسٹر بھی نوکرشاہی کے دفتری نظام میں وہ سب کچھ نہیں کرسکتے جو وہ دل سے کرنا چاہتے ہیں۔ میں سال بھر سے زیادہ اس کرسی پر ٹک نہیں سکا۔ دو تین الگ الگ بھاشاؤں کے کوی سمیلن اور 'دلّی کی آخری شمع' کا تمثیلی مشاعرہ یاد رہیں گے۔ اُردو کے اس تاریخی تمثیلی مشاعرے میں بہادرشاہ ظفر کا کردار میں نے نبھایا تھا۔ یہ پروگرام اتنا دلچسپ تھا کہ ملائم سنگھ جی پانچ منٹ کے لیے اُدگھاٹن کرنے بڑی مشکل سے آئے تھے۔ پہلا سین دیکھا تو پالتی جما کر بیٹھ گئے اور پروگرام ختم ہونے تک وہاں جمے رہے۔ مگر ہاں اس عہدے پر رہتے ہوئے لوگوں کی سیوا کا موقع ملا، درجنوں کے بگڑے کام بن گئے، جسے سچائی اور ایمانداری پر دیکھا اسی کی سفارش کی، غلط لوگوں کو ہمیشہ کی طرح قریب نہیں آنے دیا۔

ارگلی: آپ ایک حساس شاعر ہیں، ملک کے موجودہ حالات میں آپ کیسا محسوس کرتے ہیں، خاص طور پر جب ہر طرف بدعنوانی، لاقانونیت، ملاوٹ، رشوت، اخلاقی جرائم اور دہشت گردی کے مسئلے ہیں...

نیرج: آج کی سب سے بڑی سمّیا نیچے سے اوپر تک پھیلا بھرشٹاچار اور بدعنوانی ہے۔ یہ سب دیکھ کر من بہت دُکھی رہتا ہے۔

ارگلی: کیا حالات کے درست ہونے کی کوئی امید باقی ہے؟

نیرج: امید کبھی نہیں مرتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب قانون بنایا جانا چاہیے کہ دوبار سے زیادہ کوئی لیڈر الیکشن نہ لڑسکے۔ 65 سال سے زیادہ عملی سیاست میں رہنے پر پابندی ہو، البتہ بزرگ لیڈروں کو صلاح مشورے کو سمان دیا جاسکتا ہے۔ ایک سال دو سال ایم پی ایم ایل اے رہنے والوں کو بھی شاہانہ سہولیات اور پنشن دینے کا سلسلہ بند ہو۔ اسمبلی امیدوار گریجویٹ، پارلیمنٹ امیدوار ایم اے پاس ہو، اصل بات یہ ہے کہ الیکشن بہت کاسٹلی ہوگئے ہیں، جو کروڑوں خرچ کرکے جیتے گا وہ بھرپائی ضرور کرے گا۔ الیکشن میں ٹی وی پر پارٹیوں کے لیڈروں کی بحث دکھائی جائے، جس کا مینی فیسٹو عوام کو پسند ہو اسے ہی لوگ ووٹ دیں۔ اخراجات کے لیے ہر آدمی پر الیکشن فنڈ کے طور پر چھوٹا سا ٹیکس لگادیا جائے۔ میں سوچتا ہوں کہ اتنا بھی ہوجائے تو بھرشٹاچار کی جڑ کمزور ہوجائے گی، سخت ترین قانون بنائے جائیں اور ان پر تیزی سے عمل ہو تو جرائم کا نام ونشان باقی نہ رہے۔

ارگلی: اور آج کی دنیا کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

نیرج: یہ دُنیا بھر میں جہاں جہاں بھی لوگوں کے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہورہی ہے، میں اُن کے حق میں سوچتا ہوں، مجھے انسانیت سے پریم ہے، پڑوسی ملکوں سے امن اور دوستی کی کامنا کرتا ہوں، میں نے تو پاکستان کے خلاف بھی کبھی ایک لفظ نہیں کہا، میں ایک درویش ہوں اور درویش ہمیشہ پریم اور پیار کی بات کرتا ہے، ہاں امریکہ جو آج سارے کمزور دیشوں کے ساتھ دادا گیری کرتا رہتا ہے، جب عراق پر تیل کے مفاد کے لیے امریکہ نے جنگ تھوپ دی تھی میرا ضمیر خاموش نہیں رہا، میں نے صدام کی ہمت اور جذبے کی تعریف میں لکھا تھا:

بارود کے پہاڑ پر وہ نام لکھیں گے
ہم کربلا کا پھر نیا انجام لکھیں گے
مردانگی کا ذکر کہیں جب بھی چھڑے گا
اس وقت سبھی فخر سے صدام لکھیں گے

میں سمجھتا ہوں کہ اگر آج کی سیاست اور سماج ساہتیہ اور غزل کی بھاشا سیکھ جائیں تو دیش سے یہ ساری برائیاں، نفرت، تعصب، فرقہ پرستی اور آتنک واد سب جڑمول سے ختم ہوجائیں۔

ارگلی: کچھ لوگ کہتے ہیں اُردو کا مستقبل دن بہ دن تاریک ہوتا جارہا ہے۔ آپ کا شمار عظیم محبانِ اُردو میں ہوتا ہے۔ آپ کیا سوچتے ہیں؟

نیرج: اُردو بھارت ورش کی ایک زندہ، طاقتور، رسیلی زبان ہے، اس زبان کا مستقبل کیسے تاریک ہوسکتا ہے، جس کے نغمے کشمیر سے کنیا کماری تک گونج رہے ہیں، فلموں اور ٹیلی ویژن نے اُردو کو غیر ہندی اُردو والوں تک اس طرح پہنچا دیا ہے کہ اب اس کے بول، اس کے الفاظ، محاورے لوگوں کی زبان پر ہیں۔ یہ سچ ہے کہ آج اُردو کی تعلیم کو نظرانداز کیا جارہا ہے، ہر طرح اُردو کے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے، لیکن ایک بار پھر دنیا دیکھے کہ مجبوراً وہ سب کرنا ہوگا جو آزادی کے بعد اس دیس میں نہیں کیا گیا۔

ارگلی: بس آخری سوال، آپ نئی نسل کے قارئین کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

نیرج: دل کے کعبے میں نماز پڑھ یہاں وہاں بھرمانا چھوڑ
جو کچھ بولے ہیں پیغمبر وہی کہا سب سنتوں نے
لیکن اس کے معنی بدلے سارے بھرشٹ مہنتوں نے
پنڈت مُلّا سب جھوٹے ہیں ان سے ہاتھ ملانا چھوڑ
دل کے کعبے میں نماز پڑھ...

□

FAROOQ ARGALI, 25, Ganesh Park, Rasheed Market, Delhi-110051
E-mail: argali70@gmail.com

نام: گوپال داس
تخلص: نیرج
تاریخ پیدائش: موضع پراولی، ضلع اٹاوہ، یوپی
تعلیم: ایم اے (ہندی)
سرکاری ملازمت: 1935 تا 1942
لکچرر: دھرم سماج کالج علی گڑھ 1955 تا 197
کویتا کے مجموعے: سنگھرش، انتر دھونی، وبھاوری، پران گیت، درد کیا ہے، بادر برس گئیو، نیرج کی پاتی، دوگیت، ملکی، اساوری، گیت بھی اگیت بھی، ندی کنارے، لہر پکارے، کارواں گزر گیا، تمھارے لیے، پھر دیپ جلے گا، نیرج کی گیتکائیں، نیرج چناولی (تین جلدوں میں)
فن و شخصیت پر کتابیں: ہمارے لوک پریہ گیت کار گوپال داس نیرج، از شیر جنگ گرگ، ایک مست فقیر نیرج، از پریم کمار
مترجم: میرس میٹلنگ کے انگریزی ڈرامے کا ہندی ترجمہ، نیل پنکھی
تالیف: پنت کاویہ، کلا اور درشن
مرتبہ: ہندی کی رباعیاں، ہری ونش رائے بچن، ایک یگانتر، ہندی کے شرنگار گیت
ادارت: ہندی سہ ماہی 'لَے'
غیرملکی اسفار: امریکہ، کناڈا، آسٹریلیا، برطانیہ، نیپال وغیرہ
ایوارڈ واعزازات: پدم شری 1991، پدم بھوشن 1997، ٹیگور واچسپتی جے پور 1984، ساہتیہ واچسپتی، ساہتیہ سمّیلن 1991، ودیا واچسپتی بھاگلپور 1995 ڈاکٹر آف لٹریچر (اعزازی) بھیم راؤ امبیڈکر یونیورسٹی آگرہ 2006
انعامات: • ساہتیہ سنگم ممبئی (پانچ ہزار روپے) 1969، • عالمی اُردو کانفرنس نئی دہلی (گیارہ ہزار روپے) • 1990 ہندی سنستھان اتر پردیش (اکیس ہزار روپے) • 1990 ہندی اُردو اکادمی لکھنؤ (دس ہزار روپے) • 1999 ملک و بیرون ملک متعدد ایوارڈز واعزازات
پتہ: میرس روڈ، جنک پوری، علی گڑھ (یوپی)

مہاراجکر سنگھ ایشر

کرشن چندر! تجھے سلام

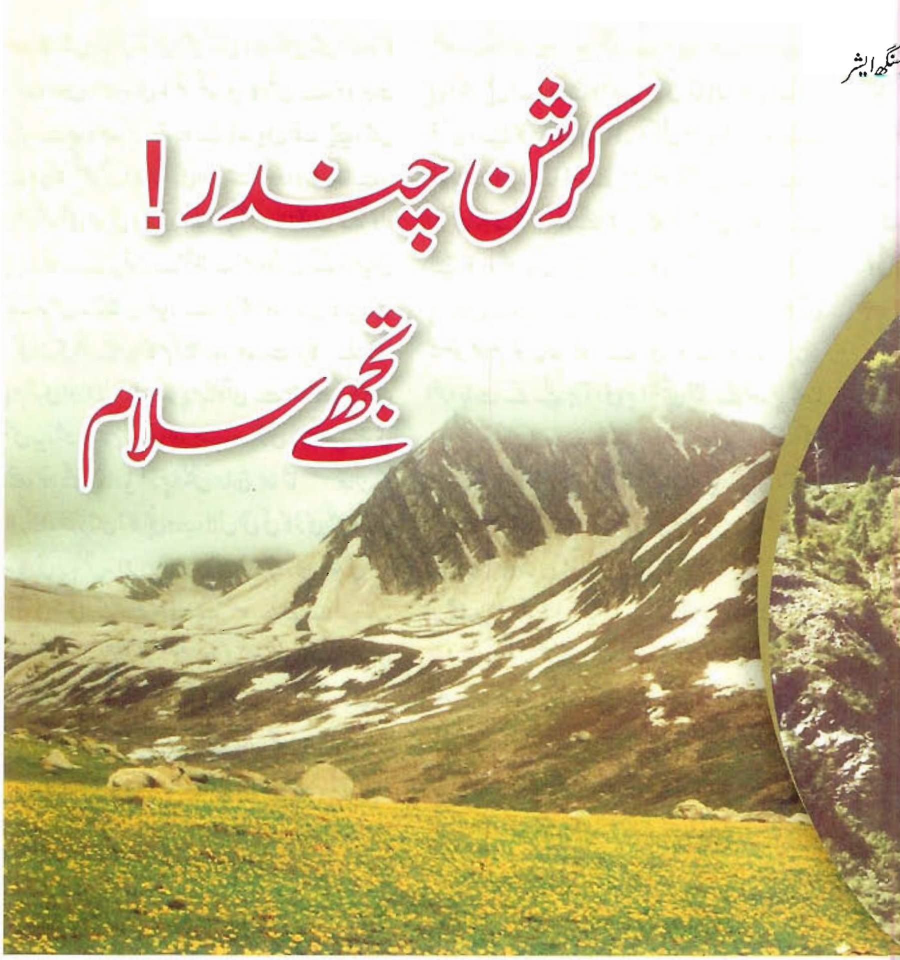

سلسلہ کوہ
پیرپنچال کے
جنوب مغربی ڈھلوانوں
کے دامن میں واقع تاریخی شہر 'پونچھ' اپنی مشترکہ تہذیب وثقافت کا خوشگوار وحسین امتزاج ہے۔ یہ شہر ریاست جموں وکشمیر کے دارالخلافہ جموں سے دوسو چالیس کلومیٹر دور شمال، مغرب میں سطح سمندر سے تین ہزار پانچ سوفٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ برفیلے پانی کی دوندیوں کے درمیان اپنے حسن و جمال کے ساتھ بے شمار تاریخی آثار چڑھاؤ کی عظیم کہانیاں زبانِ حال سے سنانے کو ہر دم بے تاب نظر آتا ہے۔

اِس شہر کے، ایک گھر کے آشیانے سے پرواز کر کے ایک ادبی نام دنیا کی وسعتوں میں پھیل گیا ہے۔ ایک متوسط درجے کے خاندان میں پروان چڑھنے والے اِس شہر کے لڑکے نے فطرتی حسن کی محبت میں مبتلا ہو کر نوکِ قلم سے اردو ادب کو اپنی ظرافت اور شوخ مزاجی سے ایسے فن پارے دیے جن کی مقبولیت صرف ہندوستان اور پاکستان تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ روس اور مشرقی جرمنی تک پھیل گئی۔

کرشن چندر کا شمار اردو کے بلند پایہ ادیبوں میں ہوتا ہے۔ اردو دنیا کے شہرہ آفاق افسانہ نگار کرشن چندر کی پیدائش 23 نومبر 1913 کو راجستھان کے قصبہ بھرت پور میں ہوئی۔ ان کے والد پیشے سے ایک ڈاکٹر تھے۔ ان کے ہاتھ میں شفا تھی۔ اور بے حد غیور انسان تھے۔ کسی انگریز ریزیڈنٹ سے کسی بات پر الجھنے اور لڑ پڑنے کی وجہ سے ملازمت چھوڑ کر وہ راجہ پونچھ کی ریاست میں بطور میڈیکل افسر فائز تھے۔

کرشن چندر کی عمر ابھی پانچ سال ہی تھی جب وہ اپنے پنجاب سے پہلی بار پونچھ آئے۔ انھوں نے پہلی بار جب 'حاجی پیر' درّے کو عبور کیا تو اپنی ماں اور چھوٹے بھائی مہندر ناتھ (جو اُس وقت ایک سال کے تھے) 'حاجی پیر' پر ماں کی انگلی پکڑ کر حاضری دی۔ حاجی پیر کے مجاور شرف الدین نے مزار سے اکیاون پیسوں کی نیاز پر دعا پڑھ کر مزار کی مٹی چکھنے کے لیے کرشن چندر کو دی۔ کرشن چندر کو حاجی پیر کا بیٹھا بنا دیا۔

پنجاب کے میدانوں اور شہر لاہور کی گلیوں میں پلا کرشن چندر تب یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ''ایک پہاڑ ختم ہوتے ہی کیوں دوسرا پہاڑ شروع ہوجاتا ہے۔'' کہیں میدان کی صورت نظر نہیں آتی۔ حاجی پیر درّے پر زندگی میں پہلی بار اُسے نیچے دور میلوں تک پھیلی پونچھ کی گھاٹیاں، وادیاں، مرغزار، پہاڑ، برفیلی چوٹیاں، جنگل، آبشار، ندیاں، کھیت، اور گاؤں کسی رنگین خوبصورت کتاب کے مصور اور ان کی طرح درخشاں لگے۔ زندگی میں پہلی دفعہ اُسے یہاں فطرت کے حسن کا اندازہ ہوا۔ کرشن چندر کے لیے پونچھ بھلے ہی مادرِ وطن نہ سہی لیکن عملی طور پر انھیں اس مٹی سے انس رہا اور مرتے دم تک خطہ پیر پنچال کے اِس مردم خیز علاقے سے جڑے رہے۔ پونچھ سے انھیں اِس قدر محبت تھی کہ اپنی وصیت کو لکھتے وقت اِس شہر کو اپنی آخری آرام گاہ کے لیے انتخاب کیا۔

پونچھ سے کرشن چندر کا عشق بے پناہ تھا۔ انھوں نے اپنا بچپن اور جوانی پونچھ میں اپنے والدین کے ساتھ گزاری۔ وہ پانچ سال کی عمر میں مینڈھر کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔ آٹھویں جماعت تک کی تعلیم حویلی ہائی اسکول، پونچھ سے حاصل کی۔ انھوں نے درسی

طور پر پانچویں جماعت تک اُردو پڑھی ہے اور بقول ان کے اِسی اردو مضمون کی وجہ سے وہ اسکول میں ہر روز ٹیچر سے پٹتے رہتے تھے۔ کرشن چندر کو خود سے یہ شکایت رہی کہ وہ اُردو، فارسی اور سنسکرت میں سے کسی بھی زبان پر دسترس حاصل نہ کرسکے۔ اُن کے ٹیچر کے نزدیک اخبار پڑھنا سوخرابیوں کی جڑ ہے۔ یہ اُن کے ہی ماسٹر بلاقی رام کی مہربانی تھی جن کی روز روز کی پٹائی سے تنگ آکر انھوں نے ان پر 'پروفیسر بلیکی' کے عنوان سے ایک اردو مضمون ہفتہ وار اخبار 'ریاست' جو دہلی سے مشہور صحافی دیوان سنگھ مفتون کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، اشاعت کے لیے بھیج دیا۔

طالب علمی کے زمانے میں کرشن چندر کے کئی شوق تھے۔ کھیلوں میں انھیں کرکٹ کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ وقتی طور پر ہاکی، فٹ بال، گھڑ سواری، موسیقی اور مصوری سے بھی رغبت رہی۔

پونچھ شہر کے گلی کوچے سڑکیں اور میدان اُن کی سرگرمیوں کے گواہ رہ چکے ہیں۔ چھوٹی عمر میں ایک موقع پر اپنے والد کے ساتھ پونچھ کے سینٹر ہال میں تھیٹر ڈرامہ دیکھنے گئے۔ گھر واپس آکر والد سے پوچھا!

'عشق' کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ کرشن چندر کی والدہ نے حیرت سے اپنے ڈاکٹر خاوند کی جانب نظر اٹھا کر دیکھا اور ان سے کہا۔

''لو— اب دو جواب۔ کہ عشق کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ میں کہتی تھی نا... نہ لے جاؤ بچے کو تھیٹر۔''

کرشن چندر نے سولہ سال کی عمر میں 1929 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ان کے والد نے انھیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لاہور اپنے بڑے بھائی کے پاس بھیج دیا۔

کرشن چندر کا پہلا افسانہ 'یرقان' ہے۔ جسے انھوں نے پونچھ (جموں وکشمیر ریاست کا ایک سرحدی شہر) میں 1935 میں لکھا تھا۔ اُس زمانے میں وہ یرقان کے مرض میں مبتلا تھے۔ دوسرا افسانہ 'مصور کی محبت' اور تیسرا افسانہ 'جہلم میں ناؤ پر' ہے جو رسالہ 'ہمایوں' لاہور میں شائع ہوا کرشن چندر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز رومانیت سے کیا۔ 'لاہور سے بہرام گلہ تک' گرجن کی ایک شام، 'مٹی کے صنم' میں (سلسلہ وار ناول) پونچھ اور اِس کے گرد و نواح کا پس منظر پیش کیا ہے۔ کرشن چندر نے تقریباً ڈھائی سو افسانے لکھے ہیں جو 26 مجموعوں میں شائع ہوئے ہیں۔ کرشن چندر کے ہاتھوں میں ایسا تیز رو قلم تھا کہ شاید ہی اردو کا کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا مقابلہ کرسکے۔ ان کے اکیس مجموعوں کا روس کی دس زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان مجموعوں کی نشر و اشاعت کی تعداد آٹھ لاکھ پینسٹھ ہزار بتائی گئی ہے۔

اردو کے معتبر و مستند افسانہ نگار کرشن چندر بھی ترقی پسند مصنّفین کی تحریک میں شامل تھے۔ پنجاب میں جب صوبائی انجمن بنی بہت سے نوجوان ادیب و شاعر اِس میں شامل ہوئے۔ کرشن چندر، فیض، بیدی، ندیم، مرزا ادیب، مخمور جالندھری، ظہیر کاشمیری اور اشک سرفہرست تھے۔ کچھ دنوں بعد پنجاب کی انجمن کے سکریٹری منتخب ہوگئے۔ پنجاب کی انجمن نے کرشن چندر کو کلکتے کی کانفرنس میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔

کرشن چندر
Krishan Chander

پونچھ سے کرشن چندر کا عشق بے پناہ تھا۔ انھوں نے اپنا بچپن اور جوانی پونچھ میں اپنے والدین کے ساتھ گزاری۔ وہ پانچ سال کی عمر میں مینڈھر کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔ آٹھویں جماعت تک کی تعلیم حویلی ہائی اسکول، پونچھ سے حاصل کی۔ انھوں نے درسی طور پر پانچویں جماعت تک اُردو پڑھی ہے اور بقول ان کے اِسی اردو مضمون کی وجہ سے وہ اسکول میں ہر روز ٹیچر سے پٹتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر احمد حسن کی تحریر کے مطابق کرشن چندر کی ترقی پسندی کو ان کی افسانہ نگاری میں اتنا دخل ہے کہ وہ اپنے مقصد اور اصولوں کو کبھی پس پشت ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے۔

پونچھ، مینڈھر اور حاجی پیر کے آس پاس کا علاقہ ان کی ابتدائی کہانیوں کا پس منظر رہا ہے۔ علی آباد کی سرائے، برف کے پھول، پہلا ناول، شکست، گرجن کی ایک شام، جہلم میں ناؤ پر، اگنی، مصور کی محبت اور یرقان اِسی علاقے میں تخلیق کیں۔ ان کے پہلے ناول کا پورا پس منظر حاجی پیر، علی آباد کا جنگل اور مینڈھر کا علاقہ رہا۔

کرشن چندر 1974 میں آخری مرتبہ اپنی دوسری اہلیہ سلمیٰ صدیقی، اپنی بہن سرلا دیوی اور بھائی مہندر ناتھ کے ہمراہ پونچھ آئے۔ فلمز ڈویژن حکومت ہند کی طرف سے کرشن چندر پر ایک ڈاکیومینٹری فلم بنا رہی تھی۔ انھوں نے پونچھ شہر میں نو روز تک قیام کیا۔ ان کے اعزاز میں پونچھ کے ادیبوں اور شاعروں نے ایک غیر معمولی ادبی تقریب منعقد کی جس کی صدارت مشہور ادیب دینا ناتھ رفیق کررہے تھے۔ گیتا بھون پونچھ میں بھی ایک خصوصی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف ادیب اور صحافی دیانند کپور نے کی تھی۔ پونچھ کے معروف شاعر جناب سجاد پونچھی، ضلع انتظامیہ کی طرف سے ان کے رابطہ عامہ پر مامور کیے گئے تھے۔ نامور صحافی اور ادیب چراغ حسن حسرت جن کا تعلق بھی پونچھ سے ہے، کرشن چندر کے ان کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔

طارق علی میر کے مطابق پونچھ کے شاعر ڈاکٹر لیاقت جعفری نے انھیں بتایا تھا کہ کرشن چندر نے پونچھ کے صحافی اور ادیب جناب ایوب شبنم کو ایک خط تحریر کیا تھا جس میں انھوں نے اپنے آخری ایام، اپنے لڑکپن کی طرح پونچھ میں گزارنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ جس کے لیے وہ دومیل نامی جگہ پر ایک گھر تعمیر کرنے کے خواہش مند ہیں۔ لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا کیونکہ اس خط کے پہنچنے کے کچھ دن بعد کرشن چندر ممبئی میں وفات پاگئے۔

یہ سچ ہے کہ معجزۂ فن کی نمود مصنف کے خونِ جگر سے ہوتی ہے۔ اگر کرشن چندر نے اپنے افسانوں کی تخلیق خونِ جگر سے نہ کی ہوتی تو اُسے اتنی مقبولیت نصیب نہ ہوتی۔

پروفیسر احتشام حسین کی تحریر کے مطابق ان کے افسانوں میں تازگی اور شگفتگی، شادابی اور رعنائی ہے، زبان کی لطافت، تشبیہوں کی جدت، اسلوب کی ندرت، موضوع اور طرزِ بیان کی ہم آہنگی، موضوع اور مواد کی سماجی اہمیت، انسانیت کا درد اور اُس کی ترقی کی اُمید، یہ باتیں جس افسانہ نگار میں اکٹھی ہوجائیں وہ ساحری کرسکتا ہے۔ کرشن چندر اِس لحاظ سے ساحر ہیں اگر وہ کبھی کبھی یہ احساس نہ دلائیں کہ حسن صرف پہاڑوں اور وادیوں میں ہے اُن کے افسانوں سے یہ ترغیب نہ پیدا ہو کہ 'فطرت' بذاتِ خود حسین اور مکمل ہے تو شاید تخیلی حیثیت سے بھی اُن کے جادو پر شک نہ کیا جاسکے۔ کرشن چندر کے افسانے پڑھے جانے کا اور غور وفکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔''

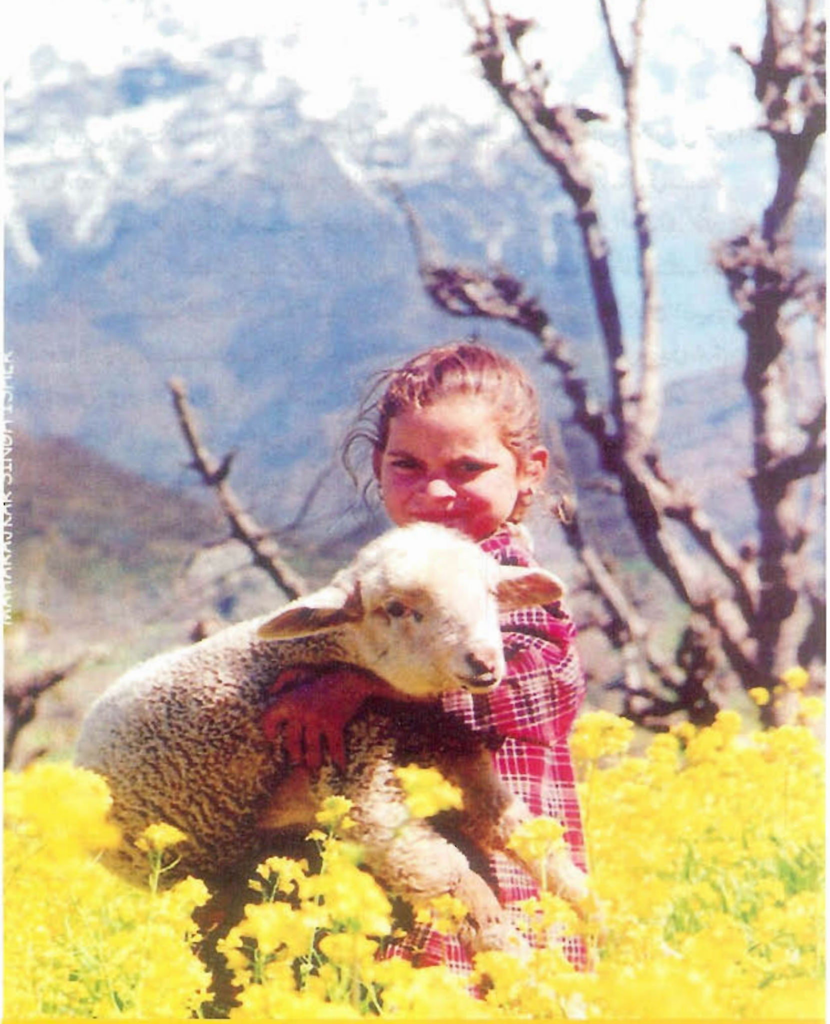

کرشن چندر کے سلسلہ وار ناول 'مٹی کے صنم' سے تحریر

(میں ایک شہر تھا — پونچھ)

پونچھ کے دن میرے لیے بہتے پانی کے دن تھے اور سورج مکھی کے پھولوں کی طرح آفتاب کے گرد طواف کرنے کے دن تھے ... میں ایک زمین — ایک دھرتی — ایک شہر — ایک سیارہ تھا جو مسرت کے گرد چکر لگاتا تھا۔ میرے وہ دن کھلے نیلے آسمان میں سفید بادلوں کی طرح گزر گئے — وہ گھڑیاں آج بھی یاد کے کسی اونچے بھورے ٹیلے پر لمحوں کی لمبی لمبی ڈنڈیوں پر، نرگسی پھولوں کی طرح جھکی ہوئی مجھے تکتی ہے۔

کتنے ہی راستے ہیں میرے دل میں جو — پونچھ کی وادی کو جاتے ہیں ... کبھی شمال ... کبھی مشرق ... کبھی جنوب ... کبھی مغرب۔ جدھر سے چلتا ہوں — پونچھ پہنچ جاتا ہوں۔

بڑے ٹیڑھے ٹیڑھے کوہستانی کٹھن راستے ہیں۔ مگر جدھر سے بھی جاؤ جب پونچھ قریب آتا ہے تو دل کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔ پہاڑ پھٹنے لگتے ہیں۔ ایک طرف سے بے تار کا دریا آتا ہے ... علی آباد کی جانب سے ... دوسری طرف سے پونچھ کا دریا جس وادی میں ان دونوں دریاؤں کا سنگم — وہیں پر پونچھ کا شہر ہے۔

کہتے ہیں کہ پچھلے زمانے میں ایک راجہ پن نش تھا۔ اُس نے سب سے پہلے اس وادی میں شہر بسایا۔ اُسی کے نام پر اُسے پن نش گری کہا گیا۔ بعد میں بگڑ کر پُن نش کا 'پُن نچھ' اور پُن تچھ سے پونچھ ہو گیا۔

پنجاب اور سری نگر سے آنے والے لوگ اِس نگری کا بہت مذاق اڑاتے ہیں۔ مجھے بہت برا لگتا ہے۔ میں اکثر ان لوگوں سے لڑتا ہوں ... مگر دل میں قائل بھی ہوں کہ واقعی اس خوبصورت چھوٹے سے نگر کا نام بگاڑنا نہیں چاہیے تھا۔ پُن نش نگر ہی رہتا تو کتنا اچھا ہوتا مگر چیزیں بگڑتی ہیں اور بدلتی ہیں۔ یہ مجھے اس وقت معلوم نہ تھا۔ گزشتہ پچاس برسوں میں یہ شہر کتنا بگڑا اور بدلا ہے میں آپ کو بتانا بھی نہیں چاہتا کیونکہ میں نے آج تک اپنی ماں کے چہرے کی جھریاں نہیں گنیں۔ اکثر اوقات تو مجھے وہ جھریاں نظر بھی نہیں آتی ہیں۔ پھر اپنے شہر کے بگڑنے کا حال کیا بتاؤں گا؟

کرشن چندر اپنے ناول 'مٹی کے صنم' میں ایک تحریر اِس طرح لکھتے ہیں:

''ہم اپنے والد کے پاس پونچھ آ گئے۔ پھر یہی علاقہ ہمارا گھر ہو گیا، میرا وطن ہو گیا۔ جس میں مختلف نسلیں اور جاتیاں، دھرم اور مذہب، خواب اور عقیدے، مختلف رنگوں کی ڈوریاں بٹتے، آپس میں الجھتے سلجھتے، گھلتے ملتے، جلوۂ حسن ہزار رنگ کی طرح آشکار ہوتے تھے۔ وہ شہر جس کے آئینہ خانے میں، میں نے پرانے ہندوستان کی مل بیٹھ کر امن چین سے رہنے کی بھری ہوئی روایت دیکھی تھی۔ اِس شہر کے عکس اکثر میری تنہائیوں میں چمک اٹھتے ہیں اور یاد دلاتے ہیں اُس خوبصورتی کی جسے ہم نے اپنی حماقت سے جلا وطن کر دیا ہے۔

کیسے میں اُس شہر کو بھلا دوں؟

اُن کی وصیت کے مطابق اُن کے جسم خاکی کی راکھ اور استھیوں کا کچھ حصہ، ان کے بھائی مہندر ناتھ دوسرے رشتہ داروں اور دوست، احباب نے بڑی عقیدت کے ساتھ دریائے پونچھ میں سپرد آب کیا۔ جب کہ کچھ راکھ اور استھیاں پونچھ کے قدیم باغ 'فوارے والے باغ' میں موجود چنار کے درخت کے سایہ تلے سپرد خاک کر کے سفید سنگِ مرمر کی ایک یادگار بنائی گئی ہے۔ انگریزی زبان میں کندہ ایک کتبہ اِس یادگار پر لگا ہے۔ شہر پونچھ کے قدیم داخلی دروازے کے پاس واقع فوارے والے باغ کو اب 'کرشن چندر پارک' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پارک کے شمالی سرے میں موجود تالاب کے سامنے کرشن چندر مرحوم کا ایک پورٹریٹ نما مجسمہ نصب کیا گیا ہے۔ یہ پاک شہر پونچھ کی اب بھی شان اور جان ہے۔ اِس پارک کے پاس سے گزرتی پختہ سڑک سے تیز رفتار گاڑیوں میں سفر کرنے والے اکثر ایک طائرانہ نظر ڈال کر گزر جاتے ہیں۔ نئی نسل کے بہت کم ایسے اشخاص ہیں جو اس باغ میں کرشن چندر مرحوم کی اِس یادگار سے یا اُس کی اُردو دنیا کے لیے ادبی خدمات سے واقف ہوں۔

پونچھ اور راجوری کے ادب شناس لوگوں کے لیے یہ یادگار کسی 'مزار کی زیارت' سے کم نہیں۔ کرشن چندر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے زبان یہی کہتی ہے۔

کرشن چندر تمہیں — سلام!

■

Maharajkar Singh Isher, Gen. Sec. Anjuman-e-Khuddam-e-Adab, Rajouri-185131 (J&K), Mob. 9858521000

مظہر احمد

ڈاکٹر شریف احمد

''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے''

مورخہ 20 جولائی 2012 کی دوپہر استادِ محترم ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی نے یہ جاں سوز خبر دی کہ استادِ محترم ڈاکٹر شریف احمد اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ گزشتہ چند مہینوں سے وہ بے حد بیمار تھے اور دلی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ انھیں دل کے عارضے کے ساتھ ساتھ سانس کی تکلیف بھی تھی۔ وہ اپنے پیچھے اہلِ خانہ کے علاوہ دوستوں اور شاگردوں کے ایک وسیع حلقے کو سوگوار چھوڑ گئے۔

مرحوم ڈاکٹر شریف احمد کی شخصیت کے تعلق سے ایک بات جو سب سے زیادہ مشہور ہے اور جس کا اعتراف ہر خاص و عام نے کیا ہے، یہ ہے کہ اسم بامسمیٰ تھے۔ یعنی جیسا نام ویسی سیرت۔ شریف صاحب کی شرافت، منکسر المزاجی اور متانت وفطانت کی دوست دشمن سبھی معترف تھے۔ اسی لیے ان کے نام کی مناسبت اور معنوی پہلو یعنی شرافت کی صفات سے انھیں یاد کرتے تھے۔ کمال احمد صدیقی نے اس سلسلے میں ایک شعر بھی کہا ہے:

آپ کا نام ہے شریف احمد
آپ تو اسم بامسمیٰ ہیں

ڈاکٹر شریف احمد کی پیدائش امروہہ کے ایک متوسط اور معزز خاندان میں یکم اپریل 1930 کو ہوئی۔ والدِ محترم کا اسم گرامی جمیل احمد سید تھا۔ جمیل صاحب کی سات اولادوں میں شریف صاحب چوتھے نمبر پر تھے۔ شریف صاحب کی ابتدائی تعلیم امروہہ میں ہوئی۔ امام المدارس ہائی اسکول سے 1950 میں میٹرک اور 1952 میں انٹرمیڈیٹ کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کیے۔ بعد ازاں ممبئی منتقل ہونے کے بعد اسماعیل یوسف کالج جوگیشوری سے بی اے آنرس اردو اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اسی دوران ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ ان کے ابتدائی مضامین ممبئی کے اخبار و رسائل کی زینت بنے۔ اس کے علاوہ ترقی پسند ادبی تحریک اور IPTA سے بھی اسی دوران منسلک ہوئے۔ ڈاکٹر شریف احمد کی ملازمت کا آغاز 1957 میں کرناٹک کالج دھاروار سے ہوا یہاں وہ اردو فارسی کے اُستاد مقرر ہوئے۔ ایک سال بعد ان کا تقرر الفنسٹن کالج ممبئی میں بطور لکچرر ہو گیا۔

ممبئی کے دورانِ قیام وہاں کے ادبی حلقوں میں نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور ان کے حلقۂ احباب میں عصمت چغتائی، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، راجندر سنگھ بیدی جیسی مقتدر شخصیات شامل تھیں۔ بطور خاص اختر الایمان سے ان کے مراسم نہایت دوستانہ تھے۔ اکثر و بیشتر ان کے گھر تشریف لے جاتے اور محفل آرائی و گفت و شنید کا سلسلہ تادیر جاری رہتا۔

1958 میں شریف صاحب کا تقرر بحیثیت لکچرر شعبۂ اردو جموں کشمیر یونیورسٹی میں ہوا۔ یہاں انھوں نے تقریباً چار سال درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ اس دوران پروفیسر شکیل الرحمٰن (جمالیات والے) حامدی کاشمیری، کمال احمد صدیقی اور قاضی غلام محمد سے ان کے دوستانہ مراسم قائم ہوئے اور اس قرابت و محبت کا سلسلہ تادمِ مرگ قائم رہا۔ دوران آل انڈیا ریڈیو سری نگر سے ان کی تقاریر اور تبصرے نشر ہوتے رہے۔ اکثر ملاقاتوں میں قیام سری نگر کے واقعات و حالات نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے اور دوستوں کا تذکرہ محبت و عقیدت کے ساتھ کرتے۔

1962 میں ڈاکٹر شریف احمد شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی ایوننگ کلاسز سے بطور لکچرر وابستہ ہو گئے اور یہیں سے 1995 میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس دوران ایک مرتبہ صدرِ شعبۂ اردو بھی رہے۔

ڈاکٹر شریف احمد سے چند تصانیف بھی منسوب ہیں۔ 1978 میں 'مشاہدے' کے عنوان سے ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ منظرِ عام پر آیا۔ اس میں شامل اکثر مضامین 'آج کل'، 'شاہراہ' اور 'ہماری زبان' میں شائع ہو چکے تھے۔ علاوہ ازیں 'عبدالحلیم شرر فن اور شخصیت' کے عنوان سے ان کا تحقیقی مقالہ جس کے عوض انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔ 1989 میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی نگرانی میں شروع ہوا، جو بعد میں فاروقی صاحب کے بیرونِ ملک جانے کی وجہ سے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی نگرانی میں مکمل ہوا۔ عبدالحلیم شرر پر یہ کتاب ایک معتبر حوالے کا درجہ رکھتی ہے، جس میں انھوں نے شرر کے فکر و فن پر معروضی انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ اس کتاب کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ شرر پر کام کرنے والوں کے لیے یہ ایک اہم حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر شریف احمد کی ایک اور تالیف بعنوان 'تہذیب کی منزلیں (دو جلدیں)' ہے۔ اس کا موضوع عالمی تہذیب کی تاریخ ہے۔ اس کتاب میں مختلف تہذیبوں کے ارتقا اور شکست و ریخت سے بحث کی گئی ہے۔ بطور خاص مشرقی تہذیب کی اہمیت و افادیت پر زور دیتے ہوئے، اس کے فروغ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے مطالعے سے شریف صاحب کی تاریخ و تہذیب سے دلچسپی و مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر شریف احمد نے کئی ناولوں کے ترجمے بھی کیے۔ انگریزی کے نوبل انعام یافتہ ناول نگار ہیمنگ وے کے ناول 'اولڈ مین اینڈ دی سی' کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اس کے علاوہ جینندر کمار کے ناول 'تیاگ پتر' کا ترجمہ 'استعفیٰ' کے نام سے کیا ہے۔ علاوہ بریں انگریزی اور ہندی کے

متعدد مضامین کے تراجم مختلف اخبار و رسال میں شائع ہوئے۔ ریڈیائی تقاریر ان پر مستزاد ہیں۔

ڈاکٹر شریف احمد کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اردو زبان و ادب کے علاوہ انگریزی ادب سے ان کی دلچسپی اظہر من الشمس ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ، تہذیب اور مذاہبِ عالم کا مطالعہ بھی بے حد وسیع تھا اپنی تحریر و تقریر میں ان کے حوالے دیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر شریف احمد صاحب کا حلقۂ احباب بھی بے حد وسیع تھا۔ ان میں بعض بے حد اہم اور مقتدر شخصیات بھی تھیں۔ لیکن کبھی بھی انھوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے ان تعلقات کا استعمال نہیں کیا۔ سب سے دوستانہ مراسم تھے۔ شعبۂ اردو میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر مغیث الدین فریدی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، صدیق الرحمٰن قدوائی اور محمد حسن صاحب کے ساتھ ساتھ پروفیسر فضل الحق اور پروفیسر امیر عارفی سے ان کے مراسم قربت وصحبت سے عبارت تھے۔ پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر گوپی چند نارنگ ان کے محسنوں میں سے تھے، جنھوں نے دہلی یونیورسٹی کی وابستگی میں تعاون کیا تھا۔ وہ اکثر اس کا ذکر کرتے اور ان کے احسان مند رہتے۔

ان احباب کے علاوہ ان کے تعلقات کلیم الدین احمد، شکیل الرحمٰن، حامدی کاشمیری، قاضی غلام محمد سید عبداللہ، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور اور پروفیسر خورشید الاسلام سے بھی رہے۔ بطور خاص پروفیسر خورشید الاسلام سے گہرے مراسم تھے وہ جب دلی تشریف لاتے تو شریف صاحب کے یہاں ہی قیام کرتے اور بیشتر وقت ان ہی کے ساتھ گزارتے۔ شریف صاحب ان کی علمی صلاحیتوں کے معترف تھے اور اکثر ان کا ذکر کیا کرتے۔ نیز ان کی کتابیں نہ صرف خود پڑھتے بلکہ اپنے شاگردوں سے بھی پڑھنے کی ہدایت کرتے۔ خورشید الاسلام کے انتقال کے بعد ایک نشست میں راقم الحروف کے ساتھ تادیر ان کی باتیں کر کے انھیں یاد کرتے رہے۔

میری خوش بختی ہے کہ میرا شمار ان کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔ 1984 میں ایم اے میں داخلہ لیا تو دیگر اساتذہ کے ساتھ شریف صاحب بھی شعبے میں موجود تھے۔

شریف صاحب کا خاص موضوع فکشن تھا۔ ان کے لکچر مفصل اور بحوالہ ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہوا کرتے تھے۔ موضوع سے بھٹکنا ان کی فطرت نہ تھی۔ لکچر کی ابتدا آہستہ روی سے ہوتی اور پھر آہستہ آہستہ اس میں تیزی آتی جاتی۔ طبیعت میں ایک قسم کا ٹھہراؤ تھا جو ان کی تقاریر کے ساتھ ساتھ چال ڈھال اور زندگی کے دیگر معاملات میں بھی نظر آتا تھا۔ اکثر اردو میں بات کرتے کرتے انگریزی بولنا شروع کر دیتے اور پھر دیر تک انگریزی ہی بولتے رہتے۔ موضوع اردو ادب ہی ہوتا۔ اکثر ارشاد فرماتے کہ ایک زبان پر مہارت حاصل کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا، کم از کم دو زبانوں پر عبور ہونا ضروری ہے اور چونکہ انگریزی زبان و ادب پر دسترس رکھتے تھے اس لیے انگریزی سیکھنے کی تلقین کرتے۔ شاگرد ان سے خاص عقیدت و محبت رکھتے تھے اس لیے انگریزی سیکھنے کی تلقین کرتے۔ شاگرد شعبے کے علاوہ ان کے دولت کدے پر بھی حاضر ہوتے رہتے اور وہ خندہ پیشانی سے ان کے مسائل حل کرنے میں منہمک ہو جاتے اور یوں شاگردوں سے ان کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جاتا۔ اکثر میں اور میرے دوست فارغ التحصیل اور برسرِ روزگار ہونے کے بعد بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ سراج اجملی (علی گڑھ) رضی الرحمٰن (گورکھپور) اور احمد محمد احمد القاضی (ازہر یونیورسٹی، قاہرہ) دلی آتے تو شریف صاحب سے ضرور ملاقات کرتے۔ احمد قاضی نے ان ہی کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر طلعت گل (اہلیہ راقم الحروف) اور ڈاکٹر مجیب خاں ان کے آخری ریسرچ اسکالر ہیں۔

شریف صاحب کی شخصیت کا ایک خاص وصف ان کی بذلہ سنجی اور ظرافت تھی۔ بظاہر خاموش طبع اور سنجیدہ نظر آنے والے استادِ محترم جب بے تکلف ہوتے تو لطیفوں اور مزاح سے محفلوں کو زعفران زار کر دیتے۔ اپنے واقعات بھی سناتے اور کچھ مخصوص ساتھیوں اور شاگردوں کے پرلطف و پرمزاح واقعات بھی شامل گفتگو کرتے۔ اکثر شعبے میں ان کی شگفتہ بیانی وجہِ انبساط بنتی۔ ان کے فی البدیہہ لطیفے آج بھی بہت سے لوگوں کو ازبر ہیں۔

شریف صاحب کو مطالعے کا بہت شوق تھا اور یہ شوق آخر دم تک قائم رہا۔ ادب، فلسفہ، تاریخ، مذہب، سیاست، غرض کوئی موضوع ایسا نہ تھا جو ان کے زیر مطالعہ نہ رہا ہو۔ اردو اور انگریزی کی کتابیں حاصل کرنے کے لیے ان کی جستجو و خواہش دیدنی ہوتی تھی۔ جب تک کتاب حاصل نہ کر لیں چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ استاد محترم ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی، جاوید اقبال (لائبریری ذاکر حسین کالج) اور راقم الحروف سے کتابوں کی فرمائش کرتے۔ اکثر نئی کتابوں سے متعلق استفسار کرتے اور پڑھتے اور ملاقات ہونے پر ان سے گفتگو کرتے۔ بینائی متاثر ہونے کے باوجود مطالعے کا یہ شوق کم نہ ہوا تھا۔ اکثر پرانی کتابیں بھی ان کے زیر مطالعہ رہتیں اور اس طرح تجدید علم کرتے رہتے۔ آج کل کے ہم سہل انگار اساتذہ کتاب اولاً تو اٹھاتے ہی نہیں اور اگر پڑھ لیتے ہیں تو پھر دوبارہ اس کی طرف نظر بھی نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کے لیے شریف صاحب کا ذوقِ مطالعہ مثال سے کم نہیں۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ ایک بار بمبئی کے دورِ قیام میں مجھ سے ایک کتاب بذریعۂ ڈاک منگوا کر پڑھی تھی۔ یوں بھی جب بمبئی جاتے تو راقم الحروف سے چند کتابیں برائے مطالعہ لے جاتے۔ مطالعے کی اس کثرت نے انھیں لکھنے کا موقع نہیں دیا چنانچہ ان کی کتابوں کی تعداد بہت مختصر ہے۔ کبھی کبھی اس صورتِ حال پر افسوس کا اظہار کرتے اور اپنے شاگردوں کو تلقین کرتے کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہنا چاہیے۔

شریف صاحب کے گھر کے دروازے ہر خاص و عام کے لیے کھلے تھے رفیقِ کار، اہلِ وطن (امروہہ) اور شاگرد سب ان سے ملاقات کرتے، گھر اتنا کشادہ نہ تھا جتنا دل کشادہ تھا۔ ان کے دل میں ہر ایک کے لیے جگہ تھی۔ امروہہ کی مقتدر و معتبر شخصیات کا تذکرہ بے حد جذباتی انداز میں کرتے کہ سب سے مراسم تھے اور سب ان کی شرافت، علمیت کے معترف تھے۔

شریف صاحب موسیقی کے دلدادہ تھے، انھیں کلاسیکل موسیقی اور غزل گائیکی سے خاص دلچسپی تھی۔ کم ہی لوگ ان کی اس دلچسپی سے واقف ہیں۔ میں نے صرف سنا تھا کہ اکثر محفلوں میں شریف صاحب غزل سرائی کرتے تھے مگر کبھی دیکھا نہیں تھا۔ پچھلے چند سال ان کے پڑوس میں گزرے اور وہ میرے غریب خانے کو رونق بخشنے لگے تو اس شوق کا اندازہ ہوا۔ میرے پاس چند غزل سراؤں کا سرمایہ ہے۔ انھیں معلوم ہوا تو اکثر انھیں سنا کرتے۔ اس وقت ان کا انہماک اور آسودگی دیدنی ہوتی تھی۔ موسیقی کی باریکیوں سے آشنا تھے اور ان پر گفتگو بھی کرتے تھے۔

غرض یہ کہ ان کی کس کس خوبی کا تذکرہ کیا جائے۔ مشفق و محترم اُستاد اپنے شاگروں کے لیے خدا کی نعمت سے کم نہیں۔ ہم شاگردوں کی خوش بختی ہے کہ ہمیں ایسے اُستاد کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوتی۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین رہے نام اللہ کا۔

■

Dr. Mazhar Ahmad,3358, Kucha Jalal Bukhari (Lal Gali) Bazar Delhi Gage, Dariya Ganj, New Delhi - 110002

عبدالقادر شمس

اردو اساتذہ، اردو تعلیم اور ہماری ذمہ داریاں

اردوزبان کو درپیش مسائل کا جب ذکر ہوتا ہے تو ہم دنیا بھر کی باتیں کرتے ہیں، لیکن اردو اساتذہ کی طرف بہت کم ہمارا دھیان جاتا ہے جب کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کے کندھوں پر کاروان اردو کو آگے لے جانے اور اس زبان کے مستقبل کو سنوارنے کی سب سے زیادہ ذمہ داری ہے۔ اردو اساتذہ کے تدریسی معیار، ان کی روزی روٹی سے متعلق مسائل، اسکول کالجوں میں ان کے ساتھ برتی جانے والی بے توجہی اور ان کا استحصال ایسے مسائل ہیں جن کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اردو کی تدریس کے عمل کو گویا 'ثواب کا کام' سمجھ کر انجام دیں ، اور کسی قسم کی مراعات یا بہتر مشاہرے کی توقع نہ کیا کریں۔ ان تعلیمی اداروں میں جہاں دوسری زبانوں اور موضوعات کے اساتذہ موجود ہوں، اردو اساتذہ کو نسبتاً نچلے درجے کا استاد سمجھا جاتا ہے۔ 'یوم اساتذہ' (5ستمبر) کے موقع پرتحریر کئے گئے زیر نظر مضمون میں مجموعی طور پر ان ہی سب مسائل اور اردو تعلیم و تدریس کے سلسلے میں پیش آنے والی دشواریوں اور اردو سے محبت کا دم بھرنے والوں کی ذمہ داریوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ (ادارہ)

تعلیم وتدریس کے لحاظ سے ہندوستان میں اردو کی حالت، سردرات میں ٹھٹھری ہوئی اس بکری کی مانند ہے جو اپنے مالک کے ریوڑ سے بچھڑ گئی ہو اور جس کے دودھ سے استفادے کی کوشش تو ہر شخص کرتا ہے لیکن اسے گھاس کھلانے کی بات کوئی نہیں کرتا۔ وہ تو بے پناہ تاثیر اور قوت ترسیل رکھنے کی وجہ سے اردو زبان اتنی سخت جان ثابت ہوئی ہے کہ وہ نہ اغیار کی یلغار سے مٹ رہی ہے اور نہ اپنوں کی بے وفائی اس کا قصہ تمام کر پائی ہے۔ رہ رہ کر وہ اپنی افادیت اور ضرورت کو مزید مؤثر انداز میں باور کراتی رہتی ہے۔ جہاں تک اس میٹھی اور مؤثر زبان کے فروغ کی بات ہے تو عام طور پر اس کی پوری ذمہ داری حکومت اور سرکاری محکموں پر ڈال دی جاتی ہے جب کہ اردو کا فروغ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک محبان اردو شکایت کی روش چھوڑ کر خود اس کے فروغ کے لیے جدوجہد میں نہ لگ جائیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ حکومتوں کو کوسنے اور مختلف مجلسوں میں مطالبات کی طویل فہرست لہرانے کی بات تو سامنے آتی ہے لیکن جو مراعات اردو کو حاصل ہیں یا اردو کے فروغ کے لیے حکومتوں نے جو اقدامات کیے ہیں ان سے بھرپور استفادہ کرنے کے لیے نہ تو عوام سنجیدہ ہیں، نہ فدائین اردو اپنے فرائض کے تعلق سے سرگرم نظر آتے ہیں۔

> اردواساتذہ کوطرح طرح کے مسائل کاسامناہے، کہیں وہ مقامی انتظامیہ کی بے توجہی کے شکارہیں توکہیں بیوروکریسی کی سطح پرانہیں سوتیلے پن کااحساس ہوتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ اردوکی تدریسی خدمات پورے انہماک کے ساتھ اسی وقت انجام دے سکتے ہیں جب انہیں مقامی حمایت اور پذیرائی حاصل ہو۔ عام طورپر ہوتایہ ہے کہ خودوالدین اپنے بچوں‌کو اردو یا تو پڑھانا نہیں چاہتے یا ان کے نصاب میں اردوکی حیثیت آٹے میں نمک کے برابرھوتی ہے۔

فروغ اردو کے لیے سرگرم ماہرین نے بارہا یہ تجویز پیش کی ہے کہ اردو کو اسکولوں سے جوڑا جائے اور جس اسکول میں بھی اردو پڑھنے کی خواہش رکھنے والے دس طلبہ بھی موجود ہوں وہاں اردو اساتذہ کی تقرری عمل میں لائی جائے، چنانچہ حکومت نے اس تجویز کو کافی اہمیت دی اور مختلف اسکولوں اور فروغ اردو کی تحریک چلانے والی انجمنوں کو متوجہ کیا کہ وہ ایسے اسکولوں کی شناخت کریں لیکن حیرت کی بات ہے کہ وہ انجمنیں بھی حکومت کو تجاویز بھیجوانے میں پیچھے رہیں جو ہمیشہ اردو کے فروغ کی جدوجہد میں سرگرداں رہنے کا دعویٰ کرتی نظر آتی ہیں اور مختلف تعلیمی بورڈ و سرکاری محکموں کا رویہ بھی نہ اردو زبان کو اس کا واجب حق دلانے میں بہتر رہا اور نہ اردو اساتذہ کے لیے کوئی مثبت پیش رفت سامنے آئی۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ فروغ اردو کا 'بھونپو' بجانے کی بجائے بنیادی کام کرنے کی ضرورت ہے تبھی اردو عام ہوگی اور اردو اساتذہ کی تقرری کے ساتھ ساتھ اردو کو روزگار سے جوڑا جاسکے گا۔

اردو اساتذہ کی تقرری نہ کیے جانے کی شکایت یا اردو کو روزگار سے جوڑنے کی بات تو ہر کس و ناکس کرتا ہے لیکن حکومت کے تحت جتنے اردو ادارے ہیں ان سے نہ بچوں کو جوڑا جاتا ہے نہ عوام کو۔ ایسی بھی خبریں ہیں کہ

بہت سی ریاستوں میں درجنوں اسکول ایسے ہیں جہاں اردو کی تعلیم کے لیے استاد تو مقرر ہیں لیکن اردو پڑھنے والا کوئی نہیں، مجبوراً اردو کے استاد سے دوسرے مضامین پڑھوائے جاتے ہیں۔ یہی صورت حال اردو مترجمین کے تعلق سے پائی جاتی ہے، کیونکہ کسی دفتر میں اردو میں درخواستیں موصول ہی نہیں ہوتیں جس کے نتیجے میں اردو مترجمین سے دوسرے کام لیے جاتے ہیں۔

اردو اساتذہ کو طرح طرح کے مسائل کا سامنا ہے، کہیں وہ مقامی انتظامیہ کی بے توجہی کے شکار ہیں تو کہیں بیوروکریسی کی سطح پر انھیں سوتیلے پن کا احساس ہوتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ اردو کی تدریسی خدمات پورے انہاک کے ساتھ اسی وقت انجام دے سکتے ہیں جب انھیں مقامی حمایت اور پذیرائی حاصل ہو۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ خود والدین اپنے بچوں کو اردو یا تو پڑھانا نہیں چاہتے یا ان کے نصاب میں اردو کی حیثیت آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔ دوسری طرف انگلش میڈیم اسکولوں کی چکاچوند نے بھی اردو کو پسماندہ زبان باور کرانے کی کوشش کی ہے اور افسوسناک بات یہ ہے کہ انگلش میڈیم اسکولوں کی میڈیائی ہواخیزی کے دام میں والدین بھی آ گئے ہیں، چنانچہ انھیں اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں کہ ان کا بچہ اردو پڑھ پا رہا ہے یا نہیں، وہ تو بس انگریزی کی چاہ میں اردو فراموشی کے مجرمانہ عمل میں مسلسل مصروف نظر آتے ہیں۔ اردو کے فروغ میں حکومت کی کوتاہیاں تو سب کو نظر آتی ہیں لیکن اردو کو پسماندہ زبان باور کرانے میں خود اہل اردو کی کوتاہیاں اتنی زیادہ ہیں کہ کسی طور پر بھی انھیں معاف نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک فروغ اردو کے تعلق سے حکومت کی

یوم اساتذہ

عظیم استاذ کے فکر انگیز فرمودات

ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن
5 ستمبر 1888 - 17 اپریل 1975

ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن ایک جانے مانے دانشور، بہترین استاد، پرتاثیر مقرر، اچھے منتظم، کامیاب سفارت کار، محبِّ وطن اور مشہور ماہر تعلیم تھے۔ وہ ہندوستان کے ان جلیل القدر فرزندوں میں سے ایک تھے جن کے فکر وفلسفے کو عالمی سطح پر اہمیت دی گئی اور احترام کی نظر سے دیکھا گیا۔ ماہر تعلیم، عظیم فلسفی اور جدوجہد آزادی کے متوالے ڈاکٹر رادھا کرشنن گرچہ نائب صدر جمہوریہ (مسلسل دو مرتبہ) اور صدر جمہوریہ جیسے عہدوں پر فائز ہوئے لیکن انھوں نے اپنی زندگی کے اہم 40 سال ایک باوقار ٹیچر کے طور پر بسر کیے۔ ان کے اندر ایک مثالی استاد کے سارے اوصاف موجود تھے۔ چنانچہ وہ اپنے تدریسی عہد پر ہمیشہ نازاں رہے۔ 1962 میں جب وہ صدر جمہوریہ بنے تھے، اس وقت کچھ شاگرد اور مداح ان کے پاس گئے تھے۔ انھوں نے ان سے عرض کیا تھا کہ وہ ان کے یوم پیدائش کو ٹیچرز ڈے کے طور پر منانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا تھا کہ ''میری سالگرہ کو آپ سالگرہ کی بجائے ٹیچرز ڈے کے طور پر منائیں تو یقیناً یہ میرے لیے فخر کی بات ہوگی۔'' تب سے 5 ستمبر کو پورے ملک میں ٹیچرز ڈے کے طور پر منایا جارہا ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن تمام دنیا کو ایک تعلیم گاہ مانتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ ''تعلیم کے ذریعے ہی انسانی دماغ کا ہمیشہ استعمال کیا جانا ممکن ہے۔ اس لیے تمام دنیا کو ایک اکائی سمجھ کر ہی تعلیم کا انتظام کیا جانا چاہیے۔'' ایک بار برطانیہ کے ایڈنبرا یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کہا تھا کہ ''جب عالمی سطح پر اپنائی گئی پالیسی کی بنیاد عالمی امن کے قیام کی کوشش ہو تو انسانوں کو ایک ہونا چاہیے۔'' ڈاکٹر رادھا کرشنن اپنے دانشورانہ خیالات، دل کو چھو لینے والے نظریات اور ہنسانے، گدگدانے والی کہانیوں سے اپنے طلبا کو مبہوت کر دیا کرتے تھے۔ وہ طلبا کی حوصلہ افزائی کرتے تھے تاکہ وہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کو اپنی زندگی میں اتار لیں۔ وہ جس موضوع کو پڑھاتے تھے، پڑھانے سے پہلے خود اس کا اچھا مطالعہ کرتے تھے۔ فلسفہ جیسے سنجیدہ موضوع کو بھی وہ اپنے طرز تدریس سے آسان اور دلچسپ بنا دیتے تھے۔

رواں مہینے کے پانچویں دن ڈاکٹر رادھا کرشنن کا 125 واں یوم پیدائش 'یوم اساتذہ' کے طور پر منایا جارہا ہے تو ملک کے تعلیمی وتدریسی ماحول کے ساتھ اساتذہ کے حالات پر نظر

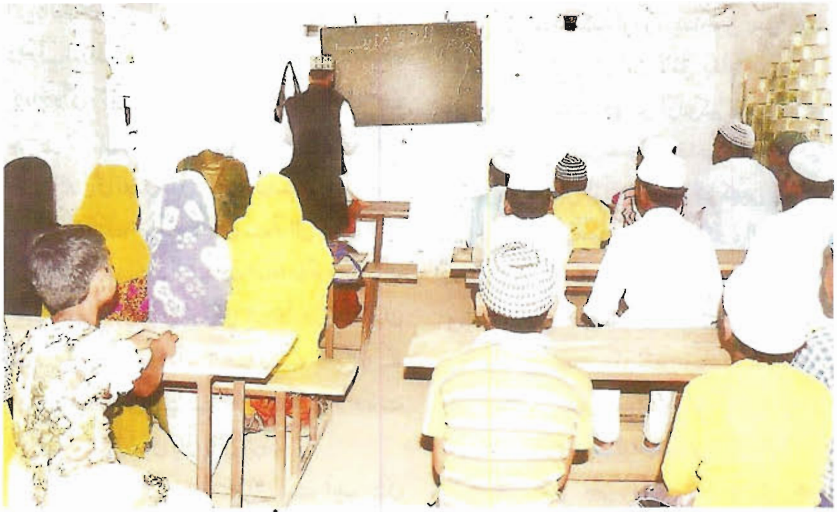

کارکردگی کا سوال ہے تو بلاشبہ بہت کچھ کیا جانا باقی ہے تاہم بہت کچھ کیا بھی جاچکا ہے اور فروغ اردو کی مہم جاری ہے۔ اردو نصاب کی تشکیل اور درسی کتابوں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ اردو اساتذہ اور مختلف ریاستوں کے سرکاری دفاتر میں اردو مترجمین کی تقرری بھی بڑے پیمانے پر ہوئی ہے۔ وزیراعظم کے پندرہ نکاتی پروگرام کے تحت اور مختلف اردو اکادمیوں کے زیراہتمام اردو اساتذہ کی تقرری اور ان کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح فروغ انسانی وسائل کی مرکزی وزارت کے تحت نوڈل ایجنسی کے طور پر کام کرنے والی 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' (این سی پی یو ایل) نے فروغ اردو کے لیے اردو کی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ اگر ہم قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ملک کی 22 ریاستوں میں 676 اردو سینٹروں کی ہی بات کریں تو ان سے ہزاروں افراد اردو سیکھ کر اس لائق بن چکے ہیں کہ وہ دوسروں کو بھی اردو سے آشنا کرسکیں۔ سیکڑوں افراد این سی پی یو ایل کے اردو مراکز سے فارغ ہوکر ملازمتوں میں

ہیں، اس کا سب سے زیادہ فائدہ مدارس میں پڑھنے والے طلبہ وفضلا اور ان لوگوں نے حاصل کیا ہے جو کسی وجہ سے اردو سے نابلد تھے۔ کونسل نے اپنے اردو عربی مراکز کے لیے تقریباً دو ہزار اساتذہ کی جزوقتی تقرری کرکے اردو کے فروغ کے لیے قابل لحاظ کام انجام دیا

ہے۔ قومی اردو کونسل نے نہ صرف اردو کے فروغ کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں بلکہ اردو کی معاون زبانوں، عربی اور فارسی کو بھی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ اردو کونسل کے کل 1245 سینٹرز میں 569 سے زائد عربی وفارسی کی تعلیم کے سینٹر قائم ہیں۔ دراصل قومی کونسل نے

ڈالنا ضروری ہوجاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ سات آٹھ برسوں میں تعلیم کے میدان میں قابل لحاظ بلکہ بعض انقلابی نوعیت کی تبدیلیاں آئی ہیں، نئی ٹیکنالوجی کے نئے تقاضوں کے تحت تعلیم وتدریس کے ہی نہیں بلکہ امتحانات کے طور طریقوں کو بھی بدلا جارہا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ استاد اور شاگرد کے درمیان، احترام وعقیدت کا جذبہ کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے، بیشتر طلبا آج اپنے اساتذہ کا اس طرح احترام نہیں کرتے جس طرح گزشتہ نسلیں کرتی تھیں۔ دوسری طرف اساتذہ میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو گزشتہ زمانے کے اساتذہ کی طرح تدریس کو ایک مشن مان کر چلتے تھے اور اسے محض روزگار اور آسائش وآرام کا وسیلہ نہیں سمجھتے تھے۔ ضرورت ہے کہ طلبا واساتذہ کے باہمی روابط میں شائستگی لانے کی کوشش کی جائے جس میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کے افکار ونظریات بے حد معاون ثابت ہوسکتے ہیں اور ان کی تشہیر وتبلیغ سے ایک نئی بیداری پیدا ہوسکتی ہے۔

تعلیم کے میدان میں ڈاکٹر رادھا کرشنن نے جو غیر معمولی خدمات انجام دیں وہ یقیناً ناقابل فراموش ہیں۔ وہ ہمہ جہت صلاحیت کے مالک تھے۔ اپنی زندگی میں کئی اعلیٰ عہدوں پر کام کرتے ہوئے بھی وہ تعلیم کے میدان میں مسلسل خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کا ماننا تھا کہ ''اگر صحیح طریقے سے تعلیم دی جائے تو سماج کی کئی برائیوں کو مٹایا جاسکتا ہے۔''

ڈاکٹر رادھا کرشنن کہا کرتے تھے کہ ''طلبہ کو صرف معلومات فراہم کرنا تعلیم نہیں ہے، بلاشبہ معلومات کی اپنی اہمیت ہے اور جدید دور میں ٹیکنالوجی کی معلومات بے حد اہم بھی ہے تاہم شخصیت کے مدبرانہ جھکاؤ اور اس میں جمہوری جذبے کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ یہ باتیں شخصیت کو ایک ذمہ دار شہری بناتی ہیں۔ تعلیم کا مقصد ہے علم کے تئیں ایثار کا جذبہ اور مسلسل سیکھتے رہنے کی فطرت۔ وہ ایک عمل ہے جو انسان کو علم اور مہارت دونوں فراہم کرتا ہے اور زندگی میں انقلاب آفریں تبدیلی کا راستہ ہموار کرتا ہے۔ ہمدردی، محبت اور اعلیٰ اقدار اور روایات کا فروغ بھی تعلیم کے مقاصد میں شامل ہیں، چنانچہ حصول تعلیم کے وقت ان جملہ شرائط پر توجہ دی جانی چاہیے''۔

وہ کہتے تھے کہ ''جب تک استاد تعلیم کے تئیں وقف اور پرعزم نہیں ہوتا اور تعلیم کو ایک مشن نہیں مانتا اس وقت تک اچھی تعلیم کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔'' وہ کئی سال تک درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ ایک مثالی استاد کی تمام خصوصیات ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ''استاد انھیں لوگوں کو بنایا جانا چاہیے جو سب سے زیادہ عقلمند ہوں۔ اساتذہ کو صرف اچھی طرح درس دے کر ہی مطمئن نہیں ہوجانا چاہیے۔ انھیں اپنے طلبا کی محبت اور جذبۂ احترام حاصل کرنا چاہیے اور احترام محض استاد بننے سے نہیں ملتا، اسے حاصل کرنا پڑتا ہے۔''

ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن نے یہ جان لیا تھا کہ ''زندگی مختصر ہے اور اس میں حاصل خوشیاں غیر معینہ ہیں، اس وجہ سے انسان کو سکھ دکھ میں ایمانداری سے رہنا چاہیے۔'' ان کا خیال تھا کہ ''موت ایک اٹل حقیقت ہے جو امیر وغریب تمام کو اپنا شکار بناتی ہے اور کسی بھی قسم کی تفریق نہیں کرتی۔ سچا علم وہی ہے جو آپ کے اندر کی جہالت کو ختم کرسکے۔ سادگی سے بھرپور اطمینان کی زندگی امیروں کی پرغرور زندگی سے کہیں بہتر ہے کیونکہ امیروں کی شان وشوکت میں بے اطمینانی وبے چینی ہوتی ہے۔ ایک خاموش دماغ بہتر ہے تالیوں کی ان گڑگڑاہٹوں سے جو ایوانوں اور درباروں میں سنائی دیتی ہیں۔'' وہ کہتے تھے کہ ''توصیف سے بہتر تنقید ہے کیونکہ تنقید انسان کو بہتر کارکردگی کے لیے ابھارتی ہے۔ سبھی مائیں اپنے بچوں میں اعلیٰ اقدار دیکھنا چاہتی ہیں، اس وجہ سے وہ بچوں کو خدا پر یقین رکھنے، گناہ سے دور رہنے اور مصیبت میں پھنسے لوگوں کی مدد کرنے کا سبق دیتی ہیں۔'' ڈاکٹر رادھا کرشنن سارے دنیا کو ایک اسکول مانتے تھے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن کے یوم ولادت پر انھیں بہترین خراج عقیدت یہ ہوگا کہ اساتذہ اپنی تمام تر صلاحیتیں طلبہ پر نچھاور کرنے کا عہد کریں کیونکہ اساتذہ کا جذبۂ ایثار، اخلاص اور ملک وقوم کے لیے ان کی فکرمندی ہی ملک وقوم کو صحیح معنوں میں بلند مقام پر پہنچا سکتی ہے۔ ■

— عبدالقادر شمس

اس راز کو سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ عربی و فارسی کی تعلیم سے نہ صرف اردو زبان کو فائدہ ہوگا بلکہ اردو والوں کے روزگار کا دائرہ بھی وسیع ہوگا کیونکہ بیشتر خلیجی اور وسط ایشیائی ملکوں میں یہی زبانیں بولی جاتی ہیں اور ان ملکوں سے لاکھوں ہندوستانیوں کی روزی روٹی جڑی ہوئی ہے۔

جہاں تک اساتذہ کا تعلق ہے تو ان کا بھی کونسل نے دھیان رکھا ہے۔ کونسل نے اردو اساتذہ کے لیے مختلف اردو کی کتابیں بھی شائع کی ہیں جو فروغ اردو زبان کے لیے نہایت مفید و کارآمد ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے تدریسی معیار کو فروغ دینے کے مقصد سے مختلف موضوعات پر ورک شاپ بھی کرائی جاتی رہتی ہیں۔

قومی کونسل کے اردو سینٹروں سے ایک بڑی اردو آبادی کو اس لائق بنایا جا سکتا ہے کہ وہ اردو سیکھ کر اردو کے ساتھ ساتھ اس ملک کی غیر معمولی خدمت انجام دے سکیں، لیکن ان اردو اساتذہ کو کہیں بچوں کی اور ان سے بھی زیادہ ان کے والدین کی عدم دلچسپی کی شکایت ہے تو کہیں طلبہ وطالبات کی عدم موجودگی کی۔ یہ معاملے وہ ہیں جن میں حکومتیں زیادہ کچھ نہیں کرسکتی۔ ایسے اساتذہ کی شکایت کو دور کرنا نہ صرف اردو عوام کی بلکہ اردو انجمنوں کی بھی بڑی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ اردو سے والدین کی دلچسپی اور اردو اسکولوں وسینٹروں میں بچوں کے داخلے کے لیے ملک گیر مہم چلانا ناگزیر ہے، جس کے لیے ہم سبھی کو آگے آنا ہوگا۔

ہندوستان کی کئی ریاستوں کے اسکولوں میں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کے اساتذہ کی تقرری ایک عرصے تک ہوتی رہی ہے اور بہت سے اقلیتی اسکولوں میں تو اردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ عربی کے اساتذہ کی بھی تقرری ہوتی تھی لیکن فی زمانہ اکثر ریاستوں میں اردو

قومی کونسل کے اردوسینٹروں سے ایک بڑی اردوآبادی کو اس لائق بنایا جا سکتا ہے کہ وہ اردوسیکھ کر اردوکے ساتھ ساتھ اس ملک کی غیرمعمولی خدمت انجام دے سکیں، لیکن ان اردواساتذہ کو کھیں بچوں کی اور ان سے بھی زیادہ ان کے والدین کی عدم دلچسپی کی شکایت ھے توکھیں طلبہ وطالبات کی عدم موجودگی کی۔ یہ معاملے وہ ھیں جن میں حکومتیں زیادہ کچھ نہیں کر سکتی۔ ایسے اساتذہ کی شکایت کو دورکرنا نہ صرف اردوعوام کی بلکہ اردو انجمنوں کی بھی بڑی ذمہ داری ھے۔ چنانچہ اردوسے والدین کی دلچسپی اور اردواسکولوں وسینٹروں میں بچوں کے داخلے کے لیے ملک گیر مہم چلانا ناگزیرھے، جس کے لیے ھم سبھی کو آگے آنا ھوگا۔

کے اساتذہ کی تقرری تو جاری ہے جب کہ فارسی اور عربی کو بے سود زبان سمجھ کر پوری طرح نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے ہندوستان میں ٹوٹتی ہوئی اردو زبان کو سنبھالا دینے کا ایک مضبوط و موثر منصوبہ این سی پی یو ایل نے یہ بھی بنایا کہ اس نے اردو سینٹروں کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی سینٹروں کے قیام کا بھی ملک گیر میکانزم تیار کیا ہے جس کے مثبت نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ یہ دیکھتے ہوئے این سی پی یو ایل کے اس منصوبے کو ملک کے تمام اسکولوں اور مدارس میں اپنانے کی ضرورت ہے۔ جن اسکولوں میں بھی دو درجن اردو پڑھنے کے خواہش مند طلبہ موجود ہوں وہاں این سی پی یو ایل کے ذریعے براہ راست یا رضاکار اداروں کے تعاون سے اردو اور عربی سینٹر کے قیام کو لازمی بنا دیا جائے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ محض چند برسوں میں اردو زبان انگڑائی لے کر نئی توانائی کے ساتھ اس طرح اٹھے گی اور ایک ایسا ماحول تیار ہوگا جس میں اردو کے موجودہ مسائل باقی نہیں رہیں گے۔

جہاں تک اردو زبان کی تعلیم و تدریس اور اردو اساتذہ کے مسئلوں کے سرکاری حل کا تعلق ہے تو اس کا ایک کارگر طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ این سی پی یو ایل کو پورے ملک میں اردو تعلیم کی مانیٹرنگ اتھارٹی بنا دیا جائے۔ اس طرح اردو کی تعلیم کو ایک قومی اور مرکزی درجہ بھی مل جائے گا اور وہ مختلف ریاستوں کی مختلف النوع مقامی ترجیحات و مصلحتوں کے منفی اثرات سے بھی محفوظ ہو جائے گی۔ اس تجویز کے تحت این سی پی یو ایل ملک کے اطراف میں اپنے ریجنل سینٹر قائم کر سکتی ہے جو اپنے حلقے میں اردو کی تعلیم اور اردو اساتذہ کے جملہ کوائف پر نظر رکھیں اور متعلقہ ریاستی تعلیمی بورڈوں سے اردو نصاب اور اردو کے دیگر حقوق حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہیں۔

اردو کی تعلیم وتدریس اور اردو اساتذہ کے مسائل ومشکلات کے حل کے لیے فی زمانہ این سی پی یو ایل سے بہتر کوئی ادارہ نظر نہیں آتا، اس لیے فروغ انسانی وسائل کی مرکزی وزارت اگر اس امکان پر غور کرے کہ این سی پی یو ایل کو اردو اساتذہ کی فراہمی کا بھی ایک مرکزی ادارہ بنا دیا جائے تو یہ ایک انقلابی قدم ثابت ہو سکتا ہے جس سے قومی اردو کونسل اردو اساتذہ کی فراہمی، ان کی تربیت اور ان کے جملہ مسائل کے حل کا ایک مضبوط مرکز بن جائے گی۔

یہی تجویز کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ ریاستی حکومتوں کے سامنے بھی رکھی جا سکتی ہے وہ اپنے یہاں قائم اردو اکادمیوں کو اردو تعلیم اور اردو اساتذہ کے معاملات کی نگرانی اور ان کے مسئلوں کو حل کرنے کے لیے ریاستی محکمہ ہائے تعلیم کے ساتھ رابطے و اشتراک کا ذمہ دار بنا دیں۔

لیکن موجودہ حالات میں اصل ذمے داری پھر بھی اردو سے محبت کرنے والے عوام کی ہی رہے گی کیونکہ جب تک وہ اردو کے فروغ پر نظر نہیں رکھیں گے، جب تک اردو کی تعلیم میں دلچسپی نہیں لیں گے تب تک نہ اردو تعلیم کے مسئلے حل ہوں گے نہ اساتذہ کے۔ صرف حکومت کے کرنے سے کچھ نہیں ہوگا!

■

Abdul Qadir Shams,H-19/1 O Block Shahab Masjid Road Batla House,Jamia Nagar New Delhi 110025

■ محمد اطہر مسعود خاں

اردو کی تدریس اور نصابی کتابوں کے مسائل

موجودہ دور میں ابتدائی و ثانوی درجات کے طلبا کو اردو کی تعلیم حاصل کرنے میں جو مسائل درپیش ہیں ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ایک طرف اچھے، تجربہ کار، ہمدرد، بےغرض اور پرخلوص اساتذہ کا فقدان ہے تو دوسری طرف سب سے بڑی پریشانی نصابی کتابوں کی عدم فراہمی اور عدم دستیابی ہے۔ عام شکایت یہ ہے کہ کتابیں وقت پر شائع نہیں کی جاتیں۔ بہ دقت تمام شائع ہو بھی جاتی ہیں تو ان کو اسکولوں، کالجوں اور مارکیٹ میں بک سیلرز کے پاس وقت پر نہیں پہنچایا جاتا۔ نیا تعلیمی سال شروع ہونے سے لے کر سالانہ امتحان سر پر آ جانے تک طلبا اردو کی کتابوں کے لیے سرگرداں اور پریشان رہتے ہیں۔ عام بک سیلرز کا رویہ اور طرزِ عمل بھی اردو کی کتابوں کے ساتھ نہایت گھٹیا، عامیانہ اور متعصّبانہ ہوتا ہے۔ وہ جان بوجھ کر سرکاری اداروں اور پریس سے کتابیں نہیں منگاتے یا آرڈر دیتے بھی ہیں تو اس امر میں کوئی سرگرمی نہیں دکھاتے کہ کتابیں وقت پر طلبا کو دستیاب ہوں سکیں۔ پھر اگر ان کے پاس کتابیں آ بھی جاتی ہیں تو ان کی بہتر طور پر اس طرح تشہیر نہیں کرتے، جیسی وہ دوسری زبانوں میں کرتے ہیں۔

عام طور سے اردو کی سرکاری نصابی کتابیں گھٹیا، ردی اور بیکار قسم کے اخباری کاغذ پر شائع کی جاتی ہیں ایسی کتابوں کو طلبا صحیح ڈھنگ سے پڑھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں کیونکہ ان میں کتابت و طباعت کا بھی کوئی معیار نہیں ہوتا جب کہ انگریزی اور ہندی (کے متفرق مضامین) کی کتابیں انتہائی نفیس، دیدہ زیب، بہترین، سفید، دبیز اور اجلے کاغذ پر شائع کی جاتی ہیں اور ان میں موجود تصاویر بھی بہت خوبصورت اور ملٹی کلر ہوتی ہیں جب کہ اردو کی کتابوں میں تصاویر انتہائی بھدی، گندی اور غیر واضح ہوتی ہیں۔ اردو کی کتابوں میں کتابت اور ہندی انگریزی کی کتابوں میں کمپیوٹر کمپوزنگ کی نفاست اور ان کے معیار میں بھی زمین آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔

زمانے، وقت، سماجی ضرورت اور عصری حالات و تقاضوں کے تحت اردو نصاب میں برسوں کوئی ترمیم، تحریف، تنسیخ اور حذف و اضافہ نہیں کیا جاتا۔ یہ رویہ ہر کلاس کی کتابوں کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔ اتر پردیش میں الہ آباد بورڈ ملک میں کسی بھی صوبے کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے، جس میں ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے مجموعی طور پر پچاس لاکھ سے زیادہ طلبا ہر سال امتحان کے لیے بیٹھتے ہیں۔ ایک نظر انٹرمیڈیٹ کی اردو نظم و نثر کی دونوں کتابوں بعنوان 'ادبی سی پارے' پر ڈالتے ہیں۔ ان کتابوں کا نصاب 1956 میں ترتیب دیا گیا تھا۔ دونوں کتابوں کا پیش لفظ یکساں ہے اور صفحات کی مجموعی تعداد محض 359 ہے۔ یہ کتابیں ابتداً لیتھو کی کتابت کرا کے لیتھو مشین پر شائع کی گئی تھیں۔ آج یہ بھلے ہی فلم بنا کر آفسیٹ سے چھپ رہی ہوں لیکن ان کی کتابت یا کمپوزنگ دوبارہ نہیں کرائی گئی ہے۔

تخلیقی ادب میں دس سال کے عرصے میں ہی کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور آ جاتی ہے لیکن ان کتابوں کو ادب کے عصری تقاضوں اور وقتی ضرورتوں سے دور ہی نہیں بلکہ محروم رکھا گیا ہے۔ کیا آج کے افسانے کا مزاج وہی ہے جو ساٹھ کی دہائی میں تھا؟ کیا آج کے طالب علم کو سرسید

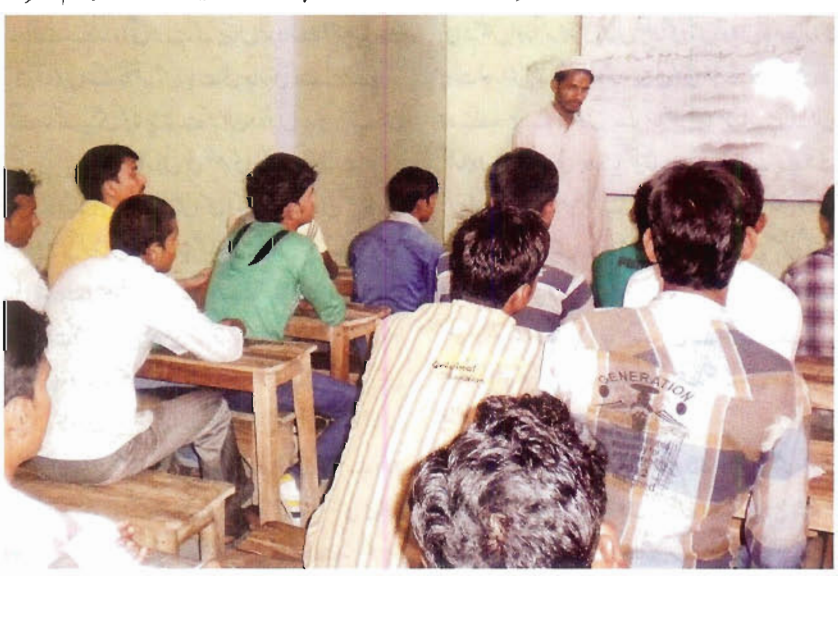

تحریک اور ترقی پسند تحریک کے بعد ادب میں جدیدیت، مابعد جدیدیت کے رجحانات اور نظریات، تجرید، جدید افسانہ، روایتی افسانہ اور موجودہ دور میں لکھے جانے والے افسانے کے معیار و مزاج کو سمجھنے کا کوئی حق نہیں؟ کیا شاعری کا معیار و مزاج اور قارئین کا شعری رجحان وہی ہے جو ساٹھ سال پہلے تھا؟ کیا ہماری آج کی غزل ماضی کی روایتی غزل کے مقابلے ہماری زندگی سے زیادہ قریب نہیں آ گئی ہے؟ کیا آج کی غزل نے وسیع کینوس کے ساتھ زندگی کے ہر رنگ سے اپنے دامن کو نہیں سجا لیا ہے؟ کیا ان ساٹھ برسوں میں کئی نئی شعری اصناف وجود میں نہیں آ گئی ہیں؟ ان سارے سوالات کا جواب یقیناً اثبات میں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ 1956 میں ترتیب دی گئی کتابوں کو آج 2012 میں 56 سال گزرنے کے باوجود Renew نہیں کیا گیا ہے ان کی جدید کاری نہیں کی گئی ہے؟ اتنے برسوں میں تو دو نسلیں جوان بھی ہوئیں اور پروان بھی چڑھیں لیکن ان 56 برسوں میں ہمارا نصاب وہیں کا وہیں ہے۔ جب کہ اس عرصے میں کتنے ہی اعلیٰ شعری اور نثری شاہکار وجود میں آ گئے، کتنے ہی اعلیٰ قلم کاروں نے اردو دنیا سے اپنی عظمت و شہرت کا لوہا منوایا لیکن نصابی کتابوں کے حوالے سے ہمارا طالب علم ان سارے ناموں سے ناواقف ہے۔ واضح رہے کہ یہاں سردست انٹرمیڈیٹ کی کتابوں کے تناظر میں بات کی جا رہی ہے۔ بڑے دکھ کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ ان دونوں درسی کتب میں تقریباً ایک سو قلم کاروں کی شعری و نثری تخلیقات موجود ہونے کے باوجود، ان میں کسی ایک بھی خاتون قلم کار کی کسی تخلیق کو شائع نہیں کیا گیا ہے۔ کہاں ہیں نسائی ادب کی حمایت و موافقت کرنے والے؟ کیا آج اس امر کی ضرورت نہیں کہ ہم پروین شاکر، زاہدہ حنا، صغریٰ مہدی، ادا جعفری، واجدہ تبسم، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، جیسی تخلیق کاروں اور شاعرات کو بھی ان طلبا سے روشناس کرائیں۔ جن بچوں کو شروع سے ادبی ذوق ہوتا ہے وہ تو اپنی پسند کے سبھی قلم کاروں کو پڑھتے ہی ہیں لیکن یہاں نصابی کتب کے حوالے سے نظریہ پیش کیا گیا ہے۔

اردو کی جو سرکاری نصابی کتابیں جونیئر کلاسیز کے لیے شائع کی گئی ہیں ان میں کمپوزنگ کی اغلاط کی تعداد سیکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے۔ ان کتابوں کو پروف ریڈنگ اور تصحیح جیسے عمل سے کوسوں دور رکھا گیا ہے۔ ان کتابوں کے صفحات کا پرنٹ ایریا بھی یکساں نہیں ہے۔ ایک ہی کتاب میں بے ضرورت کمپیوٹر کے کئی کئی فونٹ پوائنٹ استعمال کیے گئے ہیں۔ کہیں چودہ، کہیں سولہ اور کسی صفحے پر اٹھارہ۔ نثری اسباق میں سے پورے پورے پیراگراف یا تو سرے سے غائب ہی کر دیے گئے ہیں یا ایک مضمون کا پیراگراف کسی بالکل ہی الگ موضوع کے مضمون سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اغلاط کی ایسی کثیر تعداد، کمپوزنگ کے ایسے گھٹیا معیار اور کتاب کی ترتیب کے ایسے بے ڈھنگے پن کو دیکھ کر کئی بار یوں لگتا ہے کہ یہ سب

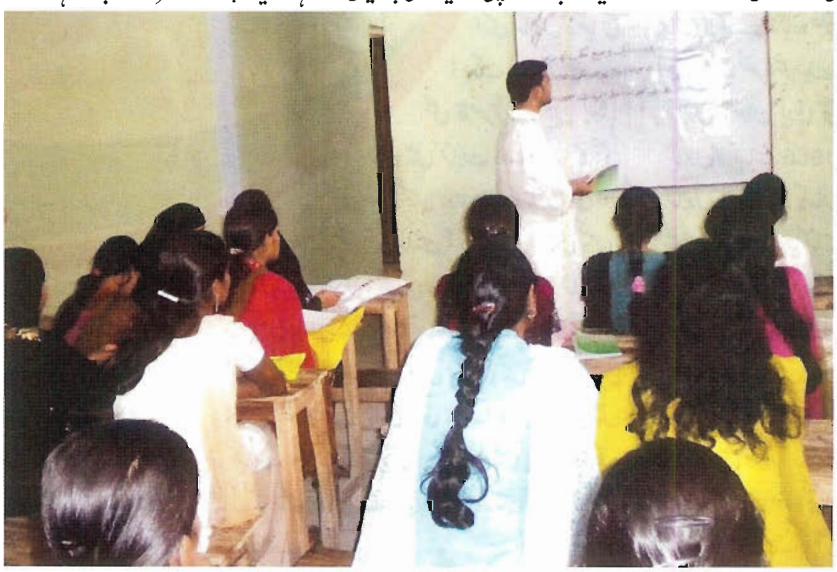

ایک پلاننگ کے تحت کیا جاتا ہے تاکہ بچے یا تو اردو سیکھ ہی نہ سکیں اور اگر بفرض محال سیکھ بھی لیں تو اس کا معیار اتنا پست اور اس قدر گھٹیا ہو کہ اس کی کوئی عزت وقعت ہی نہ ہو سکے۔ بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کتابوں کے نصابی بورڈ یا تخلیقات کے انتخاب کے تحت جن لوگوں کے نام کتاب کے ابتدائی صفحات میں درج ہوتے ہیں ان میں سے بیشتر کا اردو سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس رویہ کو 'اردو کے ساتھ مذاق' جیسے سرسری الفاظ لکھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے خلاف جب تک خود اردو عوام میں بیداری نہ ہوگی تب تک یہی سب کچھ چلتا رہے گا۔

راقم کو درس و تدریس کے 35 برسوں میں اردو ہندی اور انگریزی کی سیکڑوں کتابیں دیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملا ہے لیکن سرکاری اور غیر سرکاری سبھی کتابوں میں ایک عجیب مشترکہ بات دیکھنے میں آئی ہے اور اسے صرف سہل پسندی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایک کہانی جو درجہ 6 کی کتاب میں موجود ہے وہی کہانی ہندی میں ہائی اسکول کی کتاب میں بھی موجود ہے۔ پریم چند کی کہانی 'منتر' اگر ہائی اسکول کے نصاب میں موجود ہے تو وہی کہانی درجہ 7 کی کتاب میں بھی شامل ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نصابی کتابوں کی ترتیب میں بچوں کی ذہنی استعداد، ان کی عمر، صلاحیت اور ذوق و شوق کا کہیں خیال نہیں رکھا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ نئے اور پرانے قلم کاروں کا کوئی توازن موجود نہیں ہے۔ وقت اور حالت اور سائنس و ٹیکنالوجی کی ضرورت و اہمیت اور اس کی تشہیر کو بالائے طاق رکھ کر کتابیں شائع کر دی جاتی ہیں اور بس! اکثر دیکھا جاتا ہے کہ اردو کے قدیم ادیبوں اور شاعروں کو نصابی کتب میں جگہ دی گئی ہے یا پھر بعض قد آور ادبا اور شعرا اشاعتی اداروں سے کسی بھی طرح کے رابطے اور تعلق کے باعث ان کتابوں میں جگہ پا لیتے ہیں۔ اسی طرح ادب کے نئے چاند ستاروں کا استحصال تو ہوتا ہی ہے، ساتھ ہی طلبا ادب کے جدید رجحانات اور امکانات سے بھی نابلد اور ناواقف رہتے ہیں۔

چند اداروں کو چھوڑ کر اردو کی نصابی کتابوں کے مرتبین اور ناشرین کے پاس کتابوں کی ترتیب و تدوین کے لیے کوئی ایسا بورڈ یا پینل نہیں ہے جو بچوں کی عمر کو catagory میں بانٹ کر اور ان کے مزاج، رجحانات یا سماجی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک منظم طریقے سے کتابوں کی ترتیب کا کام انجام تک پہنچائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نصابی کتابوں کی پانچ چھ برسوں میں جدید کاری کی جائے۔ نئے موضوعات پر مضامین اور دلچسپ و بامقصد کہانیاں شامل کی جائیں۔ آج کے بچے کو جدید ٹیکنالوجی اور سائنس سے متعلق مواد چاہیے۔ دیکھا جاتا ہے کہ برسوں پہلے جن موضوعات پر مضامین شامل نصاب تھے وہ تین چار دہائی بعد بھی آج کی کتابوں میں بھی موجود ہیں بھلے ہی وہ اپنی افادیت و اہمیت کھو چکے ہوں اور آج ان کی قطعی ضرورت نہ ہو۔ اکثر مرتبین بیشتر کہانیوں اور نظموں کے تخلیق کار کے نام، ان کی تخلیقات

کے ساتھ لکھنے کے بجائے 'ماخوذ' لفظ لکھ کر اپنی خودساختہ ذمے داری سے دست بردار ہوجاتے ہیں۔ یہ بددیانتی سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ ہر تخلیق کے ساتھ اس کے فنکار کا نام درج کرنا مرتب کی ذمے داری اور اس کا فرض ہے۔ ہندی اور انگریزی کی نصابی کتابوں میں یہی طریقۂ کار اختیار کیا جاتا ہے۔ ہندی کی درسی کتابوں میں جونیئر کلاسیز سے ہی یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ ہر مضمون، کہانی، ڈرامہ یا نظم کے مصنف کا چار چھ سطروں میں مختصر لیکن جامع تعارف بھی پیش کیا جائے کیونکہ اس سے بچوں کی معلومات بڑھتی ہے اور ان کے اندر تحقیق کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔لیکن اردو کی جونیئر کلاسیز کی بیشتر نصابی کتابوں کے مرتب اس طریقۂ کار سے گویا بالکل نابلد اور ناواقف ہیں۔حسنِ اتفاق سے کسی کتاب میں مذکورہ طرز کا تعارف مل بھی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ مرتب نے اس کا معیار طلبا کے تعلیمی معیار کے بجائے اپنی ڈگریوں کے حساب سے رکھا ہے۔ اس لیے جیسا چاہیے طالبا اس سے مستفید نہیں ہو پاتے۔

آج ضرورت ہے کہ نصابی کتابوں میں اخلاقیات، صحت وتندرستی، کھیل کود، جدید سائنسی ترقی اور ایجادات، دنیا کے دیگر ترقی یافتہ ممالک کے سماجی اور جغرافیائی حالات، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی اہمیت و افادیت، جنرل نالج، جذبۂ خیرسگالی اور ہمدردی، آپسی میل جول، ملک کے تاریخی حالات و واقعات، تاریخی نوعیت کی عمارات اور ملک سے محبت و وفاداری ابھارنے والے مضامین شائع کرنے کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔ وہ تعلیمی ادارے جو بچوں کے لیے درسی کتابیں ترتیب دے کر شائع کرتے ہیں انھیں اپنے نصاب میں مذکورہ امور کا خیال رکھنا چاہیے۔

طلبا کے لیے ہندی اور انگریزی میں ہر طرح کی بہترین گائڈ بکس اور جنرل نالج کی کتابیں ملتی ہیں لیکن اردو میں اس طرف یا تو سرے سے توجہ ہی نہیں دی گئی ہے یا کچھ کتابیں بازاروں میں ملتی بھی ہیں تو وہ صرف کاروباری نقطۂ نظر سے، بازاروقسم کے ناقص مواد کے ساتھ انتہائی گھٹیا اور ردی کاغذ پر چھپی ہوتی ہیں جن کو پڑھ

> استاد کا کام قوم کی تعمیر حیات اور قوم کی زندگی کو بنانا اور سنوارنا ھے۔ بچوں کی شکل میں قوم کا بیش قیمت سرمایہ استاد کے سپرد کیا جاتا ھے اس لیے استاد کو بھی یہ سمجھنا چاھیے کہ وہ ضروری اور اہم ھی نہیں بلکہ ایک مقدس کام کو اپنے ھاتھ میں لے رھا ھے۔ اس کے پیشے کا مقصد صرف روپیہ کمانا نہیں ھونا چاھیے اور اسے ایک بڑے مقصد اور مشن کے تحت اپنی خدمات انجام دینی چاھئیں۔ دنیاوی دھن دولت اور عیش و آرام اس کے مقدس کام کا معاوضہ نہیں ھوسکتے۔ بھرحال استادوں، اردو اداروں، سماجی اور ادبی تنظیموں اور خود طالب علموں کی کوششوں سے اردو کی راہ میں حائل ساری دشواریوں کو رفع کیا جاسکتا ھے۔ شرط صرف یہ عزم کرنے کی ھے کہ ھمیں اردو خواندگی کا دائرہ وسیع کرنا ھے۔

کر بلکہ رٹ رٹا کر طلبا امتحان میں پاس تو ہوسکتے ہیں لیکن ان میں علمی صلاحیت ولیاقت اور تعلیم کا ذوق وشوق، جوش وجذبہ بھی پیدا ہو، یہ ضروری نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے پرائیویٹ ادارے عام معلومات یا جنرل نالج اور کوئز کے مقابلے کراتے ہیں جن میں ہر عمر کے طلبا بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں لیکن اسکولوں میں اردو کے تعلق سے اس طرح کے مقابلوں کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ برسوں پہلے، بیشتر اسکول کالجوں میں بیت بازی، تمثیلی مشاعروں اور ڈراموں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ان ذرائع سے بھی بچوں میں اردو کے تئیں دلچسپی بڑھتی تھی اور وہ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے بچوں کے رسالے بھی کھنگالتے تھے۔ چونکہ رسالوں میں بچوں کی دلچسپیوں کے سارے سامان موجود ہوتے ہیں اس لیے ماضی میں اردو رسالے بچوں اور خاص کر طلبا کے لیے لازم وملزوم بن گئے تھے۔ اس کے برعکس آج جو صورت حال ہے اس کو بغیر کسی تبصرے کے قارئین خود ہی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

اردو کی تدریس کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ والدین کی لاپروائی اور عدم دلچسپی کا بھی ہے جو اپنے بچوں کی انگریزی، حساب، سائنس یا دیگر مضامین کی ٹیوشن پر سیکڑوں یا ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں لیکن اردو کے معاملے میں ان کی یہ سوچ ہوتی ہے کہ صرف سو پچاس روپے دے کر اردو پڑھوالی جائے۔ اس طرح بہت سے بچے، فطری صلاحیت ہونے کے باوجود، اردو کی اچھی تعلیم حاصل نہیں کرپاتے۔

اردو کی تعلیم کے مسائل میں اساتذہ کا انتخاب ایک اہم مسئلہ ہے۔ ایسے ماحول میں جب کہ تعلیم کا مقصد صرف روپیہ کمانا ہو، یہ مسئلہ اور بھی زیادہ سنگین اور دشوار ہوجاتا ہے۔ اگرچہ دنیا کے مشکل، اہم اور قابلِ احترام پیشوں کا جائزہ لیا جائے تو اس میں سب سے اہم پیشہ استاد کا ہے لیکن موجودہ دور میں اس پیشے کی جو حالت ہوچکی ہے وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ استاد کا کام قوم کی تعمیر حیات اور قوم کی زندگی کو بنانا اور سنوارنا ہے۔ بچوں کی شکل میں قوم کا بیش قیمت سرمایہ استاد کے سپرد کیا جاتا ہے اس لیے استاد کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ضروری اور اہم ہی نہیں بلکہ ایک مقدس کام کو اپنے ہاتھ میں لے رہا ہے۔ اس کے پیشے کا مقصد صرف روپیہ کمانا نہیں ہونا چاہیے اور اسے ایک بڑے مقصد اور مشن کے تحت اپنی خدمات انجام دینی چاہئیں۔ دنیاوی دھن دولت اور عیش وآرام اس کے مقدس کام کا معاوضہ نہیں ہوسکتے۔ بہرحال استادوں، اردو اداروں، سماجی اور ادبی تنظیموں اور خود طالب علموں کی کوششوں سے اردو کی راہ میں حائل ساری دشواریوں کو رفع کیا جاسکتا ہے۔ شرط صرف یہ عزم کرنے کی ہے کہ ہمیں اردو خواندگی کا دائرہ وسیع کرنا ہے۔

◘

Dr. M. Athar Masood Khan, Ghaus Manzil, Talab Mulla Iram, Rampur - 244901 (U.P.)

محمد افروز عالم

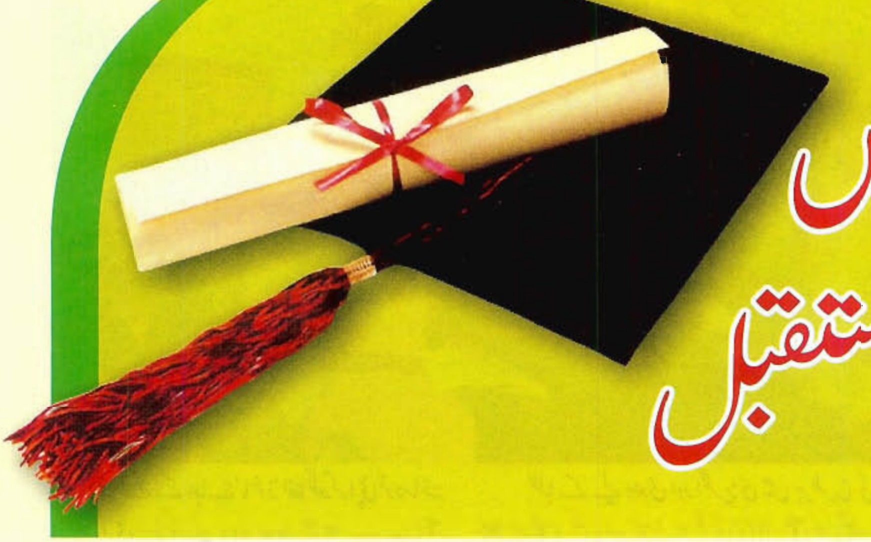

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا مستقبل

اعلیٰ تعلیم ہر ملک وقوم کی ترقی کا بہترین ذریعہ ہے۔ اعلیٰ تعلیم وہ پیمانہ ہے جس سے کسی ملک، قوم و معاشرے کی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ نہ صرف انسانی زندگی اور سماج کو شائستہ اور مہذب بناتی ہے بلکہ اسے قوت وتوانائی بھی عطا کرتی ہے۔ اس کے شعور اور اقدار کی سمتوں کا تعین کرتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کسی قوم کی شخصی، اقتصادی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی نشو ونما کی ضامن ہے۔ آج دنیا کے مختلف ممالک اور بہت سی قوتیں ترقی اور خوش حالی کی بلندی پر اسی وجہ سے ہیں کہ وہ تعلیمی میدان میں بہت آگے ہیں اور ان کی ترقی کا سفر مسلسل جاری ہے۔ اعلیٰ تعلیم ہی اعلیٰ معیار کے انسانی وسائل کو فروغ دیتی ہے۔ موجودہ عالمگیریت اور جدت پسندی کے دور میں اعلیٰ تعلیم کا مستقبل جہاں تابناک اور روشن نظر آتا ہے، وہیں یہ اکیسویں صدی کے مختلف مسائل اور چیلنجوں کا سامنا بھی کر رہی ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم میں جہاں بہتری آئی ہے وہیں مختلف تبدیلیاں بھی رونما ہوئی ہیں۔ آج تعلیم کی رسائی اعلیٰ طبقے سے لے کر ادنیٰ طبقے تک ممکن ہوگئی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی سطح کا اندازہ ملک میں اس کے نظام کی ادارہ جاتی گنجائش سے کیا جاتا ہے اور اس کے تعین کے لیے تین اہم پیمانوں کو دیکھا جاتا ہے۔ یہ تین پیمانے ہیں (1) تعلیمی ادارے، یونیورسٹیوں اور کالجوں کی تعداد (2) اساتذہ کی تعداد اور (3) طلبا کی تعداد۔ آزادی کے بعد سے ادارہ جاتی لحاظ سے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ 1950 میں جہاں یونیورسٹیوں کی تعداد صرف 20 تھی وہیں 2009 تک اس کی تعداد بڑھ کر 447 تک پہنچ گئی ہے۔ اسی طرح کالجوں کی تعداد 591 سے بڑھ کر 20677 ہوچکی ہے۔ اساتذہ کی تعداد 15000 سے بڑھ کر 5.05 لاکھ سے بھی زیادہ ہوچکی ہے۔ اسی طرح طلبا کا داخلہ بھی محض ایک لاکھ سے بڑھ کر اب 116.12 لاکھ سے تجاوز کر چکا ہے۔ موجودہ وقت میں 5.05 لاکھ اساتذہ اور 116.12 لاکھ سے بھی زیادہ طلبا کے ساتھ ہندوستان کا اعلیٰ تعلیم کا نظام دنیا کے دوسرے سب سے بڑے اعلیٰ تعلیم کے نظام کی شکل میں ابھرا ہے۔ تقریباً 88 فیصد طلبا گریجویٹ کورس (آرٹس، سائنس، سماجی علوم اور کامرس) میں زیر تعلیم ہیں۔ انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کے شعبے میں تقریباً 5 فیصد طلبا زیر تعلیم ہیں۔ وہیں تقریباً 3 فیصد طلبا طب کے شعبے میں زیر تعلیم ہیں۔ زراعت اور دوسرے متعلقہ شعبہ جات میں تقریباً 1.5 فیصد شرح داخلہ ہے۔ جملہ طلبا کی تعداد میں تقریباً 35 فیصد خواتین طالبات کی تعداد موجود ہے۔

یونیورسٹیوں، کالجوں اور اساتذہ کی تعداد میں اضافے کے ذریعے ادارہ جاتی گنجائش کی وسعت نے طلبا کو ثانوی اسکول سے آگے کی تعلیم کے لیے وسیع مواقع فراہم کیے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم تک رسائی کی پیائش مجموعی شرح داخلہ کے ذریعے کی جاتی ہے۔ مجموعی شرح داخلہ سے مراد 18 سے 23 سال کے عمر کی کل آبادی کے مقابلے میں اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلہ لینے والوں کی تعداد کا تناسب ہے۔ قومی نمونہ سروے کے اعداد وشمار کے مطابق مجموعی شرح داخلہ کی صورت میں اعلیٰ تعلیم تک رسائی 1950-51، 0.7 فیصد، 1960-61 میں 1.4 فیصد سے بڑھ کر 2006-07 میں تقریباً 11 فیصد ہوگئی ہے۔

اعلیٰ تعلیم لوگوں کو مواقع فراہم کرتی ہے جس سے ان کے تنقیدی، سماجی، معاشی، ثقافتی اور روحانی جذبہ کو فروغ ملتا ہے جو کہ موجودہ وقت میں انسانیت کے لیے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اس طرح واضح ہے کہ آزادی کے بعد اعلیٰ تعلیم میں بہتری آئی ہے اور مل کی ترقی میں اس کا اہم کردار رہا ہے۔ لیکن عام طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم میں برابری کا مسئلہ اور معیار میں کمی نظر آتی ہے۔ ملک کے سبھی اداروں میں یکسانیت اور معیار کے لیے اعلیٰ تعلیم کا معیاری ہونا نہایت ہی ضروری ہے۔ گرین (1944) نے اس تعلق سے معیار اور خوبی کی تعریف بیان کی ہے۔

- کیا یونیورسٹی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عملہ بین الاقوامی اور قومی طور پر قابل قبول معیار کے مطابق ہیں؟
- پروفیشن کے طور پر عملے کی پیشہ ورانہ اہلیت کیا ہے؟
- کیا طلبا ادارے، کالجوں اور جامعات میں بہتر کارکردگی انجام دے رہے ہیں؟
- کیا طلبا اور والدین اعلیٰ تعلیم صرف پیسے کی بنیاد پر حاصل کرتے ہیں یا حقیقی معنوں میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

اعلیٰ تعلیم کے معیار اور خوبی کی تشخیص وتعین کرنے کے لیے کورس کی منظوری، کورس کا جائزہ، اکریڈیشن، محاسبہ، معائنہ، علامت کارکردگی اور اعتدال پسند ہونا ضروری ہے۔

ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم کا نظام مختلف بین الاقوامی ایجنسیوں مثلاً یونیسکو، اکتساب برائے دولت مشترکہ،

جنوبی ایشیائی تنظیم برائے علاقائی اشتراک (SAARC) اور اقوام متحدہ کے اداروں سے منسلک پروگراموں سے رابطہ قائم کرچکی ہے اور اسے بین الاقوامی سطح پر قائم کرنے کی طرف گامزن ہے۔ لیکن بین الاقوامی سطح پر یہاں کا اعلیٰ تعلیم معیار کے معاملے میں تنقید کا نشانہ بن رہا ہے۔ معیاری تعلیم کے ذریعے معلومات کو ایک فرد کی سماجی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ معیاری تعلیم لازمی عنصر ہے جس کے ذریعے مہارت، اہلیت اور قابلیت پیدا ہوتی ہے جس کی موجودہ ترقی یافتہ عالمگیریت کی دنیا میں اشد ضرورت ہے۔

تعلیمی چیلنجز: پالیسی تناظرات 1985' کی رپورٹ میں بھی اعلیٰ تعلیم کو بہتر اور روزگار سے منسلک کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اس رپورٹ میں نئی صدی کے مختلف مسائل کو حل کرنے کے لیے نصاب، تدریس اور تحقیق کی خوبی اور معیار میں اضافے کی وکالت کی گئی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کو معیاری بنانے کے حوالے سے بین الاقوامی سطح پر کوشش کی گئی ہے۔ اس تناظر میں گاٹس معاہدہ General Agreement of Trade in Services (GATS) کے تحت اعلیٰ تعلیم کو ایک تجارتی شے کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ گاٹس ایک قانونی فریم ورک ہے جو بین الاقوامی تنظیم برائے تجارت (WTO) کی شکل اختیار کر چکا ہے اس تنظیم کے تحت ایک بین الاقوامی تجارتی فریم ورک تشکیل دیا گیا جس میں 16 خدمات بشمول اعلیٰ تعلیم کو شامل کیا گیا ہے۔ تجارتی خدمات کے ضمن میں تعلیم چار اہم شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دے رہی ہے:

(1) کثیر الملکی تعلیم: یعنی مختلف ممالک کی سرحدوں کو عبور کر کے فاصلاتی نظام تعلیم، ملٹی میڈیا اور تجرباتی خدمات کے ذریعے تعلیم فراہم کر رہا ہے۔ فاصلاتی تعلیم میں مختلف مضمون کی کتابیں اور تعلیمی سی ڈی وغیرہ فراہم کی جارہی ہے۔

(2) ہمارے ملک کے طلبا دوسرے ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور تحقیقی کام انجام دینے کے لیے جارہے ہیں اور دوسرے ملک سے بھی طلبا ہمارے ملک آرہے ہیں۔

(3) دوسرے ممالک کی یونیورسٹیاں ہندوستان میں اپنی شاخیں کھول رہی ہیں۔ جن کے ذریعے انھیں معاشی فائدے حاصل ہو رہے ہیں۔ ہمارے ملک کی دو فاصلاتی یونیورسٹیاں اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد نے غیر ممالک میں اپنے مراکز کھولے ہیں جہاں طلبا ان کے کورسیس سے مستفید ہو رہے ہیں۔

(4) ماہرین تعلیم، اساتذہ اور مشہور شخصیات ایک ملک سے دوسرے ملک میں جا کر خصوصی لکچر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ای ٹیوشن اور ای لکچر کا بھی رجحان بڑھتا جارہا ہے۔ گاٹ معاہدہ کے تحت ہندوستان میں مختلف غیر ملکی یونیورسٹیوں، اداروں کی شاخیں کھل چکی ہیں تو ہمارے ملک کی یونیورسٹیوں کی بھی کئی شاخیں غیر ممالک میں کھلی ہیں۔ جس سے تعلیم کے معیار میں بہتری کے امکانات ہیں۔ لیکن اس سے ہندوستانی اعلیٰ تعلیمی اداروں کو وسائل کی غیر دستیابی اور دشواریوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔

> آزادی کے بعد ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم میں جہاں بہتری آئی ہے وہیں مختلف تبدیلیاں بھی رونما ہوئی ہیں۔ آج تعلیم کی رسائی اعلیٰ طبقے سے لے کر ادنیٰ طبقے تک ممکن ہوگئی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی سطح کا اندازہ ملک میں اس کے نظام کی ادارہ جاتی گنجائش سے کیا جاتا ہے اور اس کے تعین کے لیے تین اہم پیمانوں کو دیکھا جاتا ہے۔ یہ تین پیمانے ہیں (1) تعلیمی ادارے، یونیورسٹیوں اور کالجوں کی تعداد (2) اساتذہ کی تعداد اور (3) طلبا کی تعداد۔

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم سے متعلق چند اہم معیارات:

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی شرح داخلہ میں خاصا اضافہ ہوا ہے لیکن اس کا مستقبل بہت حد تک اس کے معیار پر منحصر ہے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے تناظر میں چند اہم معیارات حسب ذیل ہیں:

(1) **نصاب سے متعلق:** تعلیم کا معیار ہمیشہ نصاب پر منحصر کرتا ہے لیکن ہندوستان میں عام طور پر مشاہدے میں آتا ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب روایتی ہیں۔ جس کا موجودہ عالمگیریت کے دور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا مختلف کورسیس زمانہ حال کے تناظرات میں ہونے چاہیے اور اس کا نصاب بھی منظم اور بامقصد ہونا چاہیے تاکہ ہمارے اداروں میں طلبا جدید اور بامقصد علوم حاصل کریں جس کا زندگی کے مختلف شعبہ جات میں استعمال کرسکیں۔

(2) **وسائل سے متعلق:** مغربی ممالک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے مقابل ہمارے یہاں کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں سہولتوں کی کمی ہے مثلاً بہترین لکچر ہال، بہترین ساز وسامان سے مزین تجربہ گاہ، بہترین وسائل سے بھرپور کتب خانے، کھیل کے سامان، تحقیقی ادارہ جاتی ماحول کی کمی وغیرہ۔ عدم معلومات اور مہارت کا فقدان کی وجہ اہم وسائل کی غیر فراہمی بھی ہے۔ خراب سائنسی تجربہ گاہ اور کم ذخیرۂ کتب والا کتب خانہ کس طرح ہماری یونیورسٹیوں میں طلبا کو معیاری تعلیم فراہم کرسکتا ہے۔ موجودہ اطلاعات ونشریات کے انقلابی دور میں کمپیوٹر سنٹروں اور انٹرنیٹ کی دستیابی اعلیٰ تعلیمی اداروں میں طلبا کے لیے اشد ضروری ہے۔

(3) **اساتذہ سے متعلق:** آج کے اساتذہ بھی اعلیٰ تعلیم کے گرتے معیار کے ذمے دار ہیں۔ ایک استاد ہی طلبا کی بہترین تربیت کرسکتا ہے اور اس میں تعلیمی و تحقیقی جستجو پیدا کرسکتا ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان میں اساتذہ کو سب سے کم ترقی والا وسائل تصور کیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اکثر افراد اس پروفیشن کی

طرف آنا نہیں چاہتے ہیں۔ لہٰذا متعدد اساتذہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایسے ہیں جو تحقیقی کام سے قاصر ہیں، انھیں صحیح طور پر معلوماتی اور ترسیلی ٹکنالوجی (ICT) کی معلومات بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی معلومات میں جدید ترین چیزوں کا اضافہ نہیں کرسکتے ہیں اور روایتی انداز کے طریقہ تدریس اپنا کر درس دیتے ہیں۔ اس لیے اساتذہ کے معیار، تعلیم و تربیت میں اضافہ اور اصلاح کی ضرورت ہے۔ اچھے تربیتی اداروں اور مہارت پر مبنی تربیت کی ضرورت ہے۔

دوسری طرف ہمارے ملک میں اساتذہ کی تقرری میں کمی بھی باعث تشویش ہے۔ گیارہویں پنج سالہ منصوبہ میں محسوس کیا گیا ہے کہ معیاری تعلیم کے لیے مناسب اور قابل اساتذہ کی دستیابی اولین شرط ہے۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ 1980 اور 1990 کی دہائیوں میں مختلف ریاستوں نے ریاستی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اساتذہ کے تقررات پر پابندی لگادی تھی جس کی وجہ سے ہمیں اساتذہ کی عدم دستیابی کا سنگین مسئلہ درپیش ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) کی جانب سے جمع کردہ اعداد و شمار کے مطابق تقریباً ایک تہائی یونیورسٹی اساتذہ عارضی معاہدے کی بنیاد پر کام کررہے ہیں۔ 19 صوبوں کے 140 کالجوں اور 47 جامعات سے جمع کیے گئے نمونوں کی بنیاد پر جے کے چڈھا، سدھانشو بھوشن اور مرلی دھر پر مشتمل جائزہ کمیٹی برائے مشاہدہ جات کے ذریعے کیا گیا مطالعہ تدریسی عملے سے متعلق صورتِ حال سامنے لاتا ہے۔ تمام اسامیوں کے تعلق سے صوبائی جامعات جو منظرنامہ پیش کرتی ہیں وہ انتہائی مایوس کن ہے۔ اساتذہ کے خالی عہدوں کا مجموعی فیصد 58 ہے اور لکچررس اور ریڈرس کی سطح پر یہ فیصد اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یونیورسٹیوں کے شعبہ جات میں موجود طلبا میں تقریباً 90 فیصد صوبائی جامعات میں مندرج ہیں۔ کمیٹی کا مشاہدہ ہے کہ خالی جائیدادوں کی بڑھتی ہوئی شرح تقریباً مرکزی جامعات میں بالعموم اور صوبائی جامعات میں بالخصوص درس و تحقیق کے لیے کیفیت اور کمیت دونوں کے نقطہ نظر سے نقصان دہ ہے۔

هندوستان ایک جمهوری ملک هے جس میں هر شهری کو ملک کی ترقی کے لیے کچھ نه کچھ کرنا چاهیے۔ تعلیم یافته لوگوں کی اس میں بڑی ذمے داری هوتی هے۔ هم ترقی یافته ملکو ںکی فهرست میں تب هی کھڑے هوسکتے هیں اور ان میں اپنا نام شمار کراسکتے هیں جب اعلیٰ تعلیم کی اهمیت سمجھیں اور اس کے بهترین وسائل کا انتظام کریں۔ آج اکیسویں صدی میں مادی ترقی میں هم بهت آگے بڑھ چکے هیں لیکن معیار تعلیم اتنی هی تیزی سے زوال پذیر هورها هے۔ هم جانتے هیں که جدید رویوں، اقدار اور نظریات کی توسیع میں تعلیم ایک موثر رول ادا کرتی هے۔ تعلیم کے ذریعے هی فرد باهر کی دنیا سے روشناس هوتا هے اور اپنی شخصیت میں نکھار پیدا کرتا هے۔

ڈیمڈ یونیورسٹیوں میں تقریباً ایک تہائی پوسٹ ابھی بھی خالی ہیں۔ کالجوں کی بھی صورتِ حال اسی طرح خراب ہے۔ کم از کم 41 فیصد لکچررس اور 18 فیصد ریڈرس کے عہدے منتظر تقررات ہیں۔ ان کالجوں کی صورتِ حال جو کہ سرکاری امداد سے محروم ہیں اور بھی بدحالی کا شکار ہے۔ ابتدائی درجے کے اساتذہ کی جائیدادیں 52 فیصد سے زیادہ اور ریڈرس کی جائیدادیں 42 فیصد تک خالی پڑی ہیں۔ سرکاری کالجوں میں ابتدائی درجے کے اساتذہ کے خالی عہدے 42 فیصد ہیں جب کہ سرکاری امداد حاصل کرنے والے کالجوں میں اس سطح کے اساتذہ کی خالی جائیدادوں کا فیصد 40 ہے۔ ان کالجوں میں ریڈر کی سطح پر موصولہ اعداد و شمار کے مطابق خالی جائیدادیں بالترتیب 19 فیصد اور 16 فیصد ہیں۔

اساتذہ کی کمی نے قلیل مدتی اور عارضی ملازمتوں کو بڑھاوا دیا ہے۔ جز وقتی لکچرر اور کل وقتی لکچررس کے درمیان کا تناسب سبھی قسم کی جامعات میں ملاکر 0.24 ہے جس میں 0.32 صوبائی جامعات کے لیے اور 0.20 ڈیمڈ جامعات کے لیے ہے صوبائی جامعات میں ہر تین لکچررس میں ایک جز وقتی یا عارضی لکچرر کی حیثیت سے کام کررہا ہے جب کہ ڈیمڈ جامعات میں ہر پانچ لکچررس میں ایک اسی زمرے میں آتا ہے۔ اسی طرح کالجوں میں سو لکچررس میں سے 38 جز وقتی لکچررس ہیں۔ سرکاری امداد حاصل کرنے والے کالجوں میں معاہداتی لکچررس کی شرح سب سے زیادہ ہے۔

لہٰذا اس اعداد و شمار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم میں اساتذہ کے تعلق سے مجموعی صورتِ حال خاصی تشویش ناک ہے۔ جامعات اور کالجوں میں اساتذہ کی تقرری کی اشد ضرورت ہے جس سے اعلیٰ تعلیم کا مقصد اور بہترین معیاری تعلیم فراہم کی جاسکے۔

(4) **تحقیق سے متعلق**: تقریباً سبھی ترقی یافتہ ممالک کی یونیورسٹیوں میں اور یونیورسٹی سطح کے اداروں میں علاحدہ، بہترین اور معیاری ریسرچ سنٹر موجود ہیں جن کے ذریعے سے تحقیقی کام کیا جاتا ہے جس سے وہاں جدید تحقیقی انکشافات نمایاں ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم کے معیار میں گراوٹ کی ایک وجہ تحقیقی کام کے لیے معقول انتظامات کا نہیں ہونا بھی ہے۔ ہمارے یہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں صرف پی ایچ ڈی اور دیگر ڈگریوں کے ایوارڈ کے لیے ریسرچ کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ہر سال تقریباً گیارہ ہزار پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض کی جاتی ہیں لیکن زیادہ تر تحقیقی عنوانات اور مقالات کا تعلق مختلف شعبہ جات، زندگی اور معاشرے سے نہیں ہوتا ہے اور اس کا کوئی نمایاں فائدہ بھی نظر نہیں آتا ہے لہٰذا یہ تحقیق صرف یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے اصول وضوابط کو پورا کرتے ہیں جب کہ تحقیق کا کام ہمیشہ ہماری سماجی، معاشی، تعلیمی، زراعتی اور صنعتی شعبوں سے منسلک ہونا چاہیے۔

(5) **طلبا سے متعلق**: اعلیٰ تعلیم کا معیار خراب

ہونے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ طلبا آج صرف امتحان میں پاس کرنے اور ڈگری حاصل کرنے کے مقصد سے علم حاصل کرتے ہیں۔ طلبا کا کلاس روم سے غائب رہنا اور قیمتی وقت کا ضائع کرنا بھی ایک اہم وجہ ہے۔ یونیورسٹی طلبا کو اپنی اہلیت اور معیاری ترقی کو فروغ دینے کے لیے اورینٹیشن پروگرام، ورک شاپ، سیمینار، کانفرنس وغیرہ میں شامل ہونا چاہیے۔ اس سے طلبا کی شخصیت اور ترسیلی مہارت میں اضافہ ہوگا اور ان میں پختگی آئے گی۔

(6) انتظامیہ سے متعلق: اعلیٰ تعلیم کے معیار اور مستقبل کا تعلق انتظامیہ سے بھی ہے۔ ایک اچھی انتظامیہ ہی اعلیٰ تعلیم کا بہتر اور معیاری انتظام و انصرام کرسکتی ہے۔ ہندوستان میں یونیورسٹی کا نظام بھی روایتی طریقے پر مبنی ہے۔ اس لیے اس کے اصول وضوابط میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ نوکرشاہی کنٹرول میں کمی کرنے کی ضرورت ہے۔ یونیورسٹی کو صرف امتحان منعقد کرنے کے لیے نہیں بلکہ معلومات میں اضافہ اور بہترین تعلیم وتربیت کے لیے ہونا چاہیے۔ یونیورسٹی کا نظام بھی موجودہ دور میں سیاسی مداخلت کی وجہ سے متاثر ہورہا ہے۔ آج یونیورسٹی میں وائس چانسلر کی تقرری کے لیے ایک معیار کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس عہدہ پر اس شخص کی تقرری ہونا چاہیے جو بہترین علمی صلاحیتوں کے ساتھ سارے معیارات پر کھرا اترتا ہو۔ اور ان میں بہترین انتظامی و تعلیمی صلاحیت ہو۔ سیاسی مداخلت کو ختم کرنا چاہیے۔ سبھی اداروں کو اپنے مستقبل کی ترقی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ساتھ ہی یونیورسٹی انتظامیہ میں شفافیت ہونا بھی لازمی امر ہے۔

لہٰذا اعلیٰ تعلیم کے معیار کو بڑھانے کے لیے جامعات اور کالجوں کے نظام تعلیم میں انتظامی اور تعلیمی اصلاحات کے سلسلے میں اقدامات کرنا ضروری ہے۔

گیارہویں منصوبے میں کالج اور یونیورسٹی کے نظام میں تعلیمی اصلاحات کی ضرورت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مختلف جامعات میں داخلے کے طریقوں میں تبدیلی بھی اس تعلیمی اصلاح کے عمل میں لازمی طور پر شامل ہے۔ اس کے علاوہ امتحان اور جانچ کے طریقوں میں ترمیم و اصلاح کرنا، سالانہ میقات کی جگہ ششماہی میقات کے نظام کو اپنانا، گریڈ اور کریڈٹ کے طریقے کو قبول کرنا شامل ہے۔ اساتذہ کا اندازۂ قدر اور دوسری متعلقہ اصلاحات بھی اس میں شامل ہیں جس کا جائزہ اور عمل آوری ضروری ہے۔

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے جس میں ہر شہری کو ملک کی ترقی کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی اس میں بڑی ذمے داری ہوتی ہے۔ ہم ترقی یافتہ ملکوں کی فہرست میں تب ہی کھڑے ہوسکتے ہیں اور ان میں اپنا نام شمار کراسکتے ہیں جب اعلیٰ تعلیم کی اہمیت سمجھیں اور اس کے بہترین وسائل کا انتظام کریں۔ آج اکیسویں صدی میں مادی ترقی میں ہم بہت آگے بڑھ چکے ہیں لیکن معیار تعلیم اتنی ہی تیزی سے زوال پذیر ہورہا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جدید رویوں، اقدار اور نظریات کی توسیع میں تعلیم ایک موثر رول ادا کرتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے ہی فرد باہر کی دنیا سے روشناس ہوتا ہے اور اپنی شخصیت میں نکھار پیدا کرتا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ نظام تعلیم جتنا اعلیٰ درجے کا ہوگا اتنا ہی اعلیٰ تعلیم کا مستقبل بھی روشن ہوگا اور اعلیٰ افکار کے افراد تیار ہوں گے مگر تعلیم کا معیار روز بروز گرتا جارہا ہے اس کی ذمے داری کسی فرد واحد پر نہیں ہے۔ اس کے لیے طلبا، اساتذہ، والدین، اور سیاست داں سبھی ذمے دار ہیں۔ گیارہویں منصوبہ کے مرکزی مقصد کا محور 'شمولیت، معیار اور تعلیمی مطابقت کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کے داخلوں میں توسیع مع جامعات اور کالجوں کے نظام یں ضروری تعلیمی اصلاحات' تھی جس کا جائزہ لینا چاہیے اور ساتھ ہی بارہویں منصوبہ کے موضوع 'تیز رفتار، پائیدار اور مزید شمولیت والی ترقی' پر خصوصی توجہ مرکوز کرنی چاہیے تا کہ 9 فیصد ترقی کا ہدف کی جانب گامزن ہوسکیں۔ بارہویں پنچ سالہ منصوبہ (2012-17) کے اپروچ پیپر کو منصوبہ بندی کمیشن اور قومی ترقیاتی کونسل نے منظوری دے دی ہے جس نے ایک ایسا طریقۂ کار اور لائحہ عمل وضع کیا ہے جو ہندوستان میں اعلیٰ تعلیمی نام کے مسائل پر خصوصی توجہ مرکوز کرنے والا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ریاستی حکومتیں بھی اس ضمن میں اپنی ریاستوں کے منصوبوں میں اعلیٰ تعلیم کی یکساں رسائی، معیاری تعلیم، تعلیمی اصلاحات وغیرہ پر توجہ دیں تا کہ اعلیٰ تعلیم کا مستقبل تابناک اور روشن ہوسکے تبھی ہمارا ملک اکیسویں صدی کے چیلنجوں کا بحسن خوبی مقابلہ کرنے کے قابل ہوسکے گا۔

■

Md., Afroz Alam, Old Boys Hostel, Room No:11, Maulana Azad National Urdu University, Gachibowli, Hyderabad - 500032 (AP)

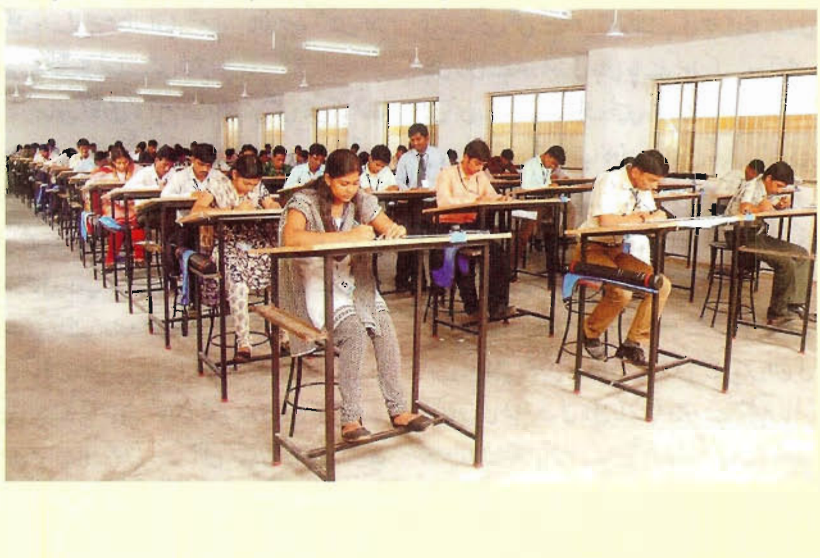

مشتاق صدف

اردو نصاب تعلیم اور چند اہم ادارے

(ساہتیہ اکادمی، قومی اردو کونسل اور نیشنل بک ٹرسٹ کے حوالے سے)

اسکولی سطح پر اردو تدریس کی بہتری اور مواد کی فراہمی کے لیے مختلف سرکاری نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں کی گراں قدر خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ ہندوستان میں ایسے متعدد ادارے ہیں جو اردو تدریس کے لیے مواد کی فراہمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں نیز اردو تعلیم و تدریس کی بہتری کے لیے بھی اہم متون کی فراہمی کا فریضہ انجام دینے میں ان اداروں کی خدمات مسلم ہیں۔ عصری منظر نامے میں مستند و معتبر مواد اور متون کی فراہمی کا کام انتہائی مشکل ہے لیکن ہمارے کئی ایسے ادارے ہیں جو اس کام کو بڑی ذمے داری سے انجام دے رہے ہیں۔ ان اداروں میں ساہتیہ اکادمی، نیشنل بک ٹرسٹ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نیشنل اوپن اسکول، اردو اکادمی دہلی، جامعہ مکتبہ لمیٹڈ، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ''ہندوستان کے مقدر کی تشکیل اس کے کلاس رومز میں ہو رہی ہے۔'' یہ جملہ معنوی اعتبار سے کافی اہم ہے۔ دراصل یہ کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ (66-1964) کا پہلا جملہ ہے جو اساتذہ کی تدریسی ذمے داریوں کا احاطہ بھی کرتا ہے اور اسکولی بچوں کے لیے فراہم کیے جارہے مواد و متون کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ بچوں کی ذہن سازی کا کام اسکول سے ہی شروع ہوتا ہے جب ان کے لیے مستند مواد کی فراہمی عمل میں آئے گی اور ان کی دلچسپی کے پیش نظر نصاب تیار کیا جائے گا اور اس نصاب کی تیاری کے لیے بہتر مواد یا مستند کتابوں سے جب استفادہ کیا جائے گا تبھی ایک ماڈل نصاب روبرو عمل آئے گا اور ہماری کامیابی اسی وقت ممکن ہو سکے گی جب ہم ہر عمر کے بچوں کے لیے اچھے مواد فراہم کرا سکیں۔ اطمینان بخش بات یہ ہے کہ ساہتیہ اکادمی، نیشنل بک ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے اردو زبان کا اس سمت میں کلیدی رول رہا ہے۔ یہ تینوں ہی سرکار کے خود مختار ادارے ہیں۔ ان اداروں میں مختلف اسکیموں اور پروگراموں کے ساتھ اشاعتی پروگرام بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے اشاعتی پروگرام کے تحت ان اداروں میں ایک طرف جہاں ادب، سماج اور کلچر پر بہت سی کتابیں دستیاب ہیں وہیں دوسری طرف چائلڈ لٹریچر سے وابستہ کتابیں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان اداروں میں اسکول کی سطح پر ادبی و علمی اور تعلیمی شعبے سے تعلق رکھنے والے جو ممتاز ادبا، شعرا، ناقدین، محققین اور دوسرے تخلیق کار نصاب میں شامل ہیں۔

ساہتیہ اکادمی کا قیام 1954 میں عمل میں آیا تھا۔ یہ ہندوستان کا ایک عظیم ادارہ ہے۔ اس ادارے کے تحت ہندوستان کی 24 زبانوں میں کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ جن میں ناول، کہانیاں، شاعری، ڈرامے، تاریخی ادب، ہندوستانی ادب کے معمار اور بچوں کا ادب سے متعلق بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ کچھ اہم تعلیمی و علمی شخصیات پر بھی کتابیں دستیاب ہیں۔ اردو تدریس کے حوالے سے دیکھا جائے تو ساہتیہ اکادمی میں ہندوستانی ادب کے معمار سیریز اور بچوں سے متعلق کتابوں کی کافی اہمیت ہے۔ ان میں اوریجنل ورک کے ساتھ ساتھ ترجمہ شدہ کتابیں شامل ہیں۔ ہندوستانی ادب کے معمار کی سیریز ساہتیہ اکادمی نے اردو کی جو کتابیں شائع کی ہیں یوں تو اس کا خاص مقصد ہندوستانی ادب کے ارتقا اور ان کے مختلف رجحانات سے عام قارئین کو متعارف کرانا ہوتا ہے۔ لیکن اس سیریز کے تحت ہندوستانی ادب کے معروف ادیبوں اور شاعروں کی جو سوانح اور ان کی ادبی خدمات پیش کی جاتی ہیں وہ ایک طالب علم کے لیے بھر پور معلومات ہوتی ہیں۔ ان میں ہر طرح کے تخلیق کار اور فنکار، قدیم و جدید شامل ہوتے ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ ہر کتاب معلوماتی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اردو میں اس سیریز کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد ہے۔ ساہتیہ اکادمی نے دوسری زبانوں سے تعلق رکھنے والے نامور ادیبوں پر بھی کتابیں شائع کی ہیں۔ آل احمد سرور، علی سردار جعفری، عبدالحلیم شرر، مجاز، داغ، حسرت موہانی، میر درد، مولانا محمد علی جوہر، میراجی، مومن، ملا وجہی، قلی قطب شاہ، نذیر اکبرآبادی جیسے اہم شعرا و ادبا کی شخصیت اور خدمات پر مونوگراف شائع ہو چکے ہیں۔ اسکولی سطح پر دوسری زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں سے استفادے کے لیے نصاب کی سطح پر ان کتابوں سے مدد لی جا سکتی ہے۔ ساہتیہ اکادمی میں 'بچوں کا ادب' کا ایک نایاب ذخیرہ بھی ہے جس سے نصاب کی تیاری میں مدد لی جاتی رہی ہے اور ہنوز لی جانی چاہیے کیوں کہ یہ وہ کتابیں ہیں جن سے بچوں کی ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔

یہی نہیں بلکہ ساہتیہ اکادمی نے ناول، کہانی، شاعری، ڈرامے وغیرہ کے حوالے سے بھی کئی اہم انتھولوجی اور انتخاب شائع کیا ہے۔ جن سے نصاب کے لیے مواد کی فراہمی میں بہت آسانی ہو سکتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ساہتیہ اکادمی وہ ادارہ ہے جس کے پاس ان کی کتابوں کی طباعت کی کاپی رائٹ موجود ہے۔ 'غبار خاطر' جو مولانا ابوالکلام آزاد کے ان خطوط اور تحریروں کا مجموعہ

ہے جو انھوں نے قلعہ احمد نگر میں قید کے زمانہ میں قلم بند کیے تھے۔ اس کے اہم حصے اسکولی سطح پر بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ اسی طرح 'خطبات آزاد' جس میں آزاد کی بعض مشہور اور نمائندہ تقریریں موجود ہیں اور جن کے مطالعے سے ان کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کے کچھ حصے بھی نصاب میں شامل ہیں۔ اسی طرح 'خطوط ابوالکلام آزاد' جو آزاد کے خطوط کے بیش بہا ذخیرہ ہیں ان خطوط کے مطالعے سے بھی ان کی آزادانہ رائے کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے کچھ حصے بھی ہمارے نصابوں میں شامل ہیں۔ 'تذکرہ از مولانا ابوالکلام آزاد' جو ان کی خود نوشت سوانح عمری کا پہلا حصہ ہے، ساہتیہ اکادمی نے بیادگار مولانا آزاد شائع کیا ہے۔ دراصل مولانا آزاد پر یہ وہ کتابیں ہیں جن سے ہمیشہ استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ایک قومی ادارہ ہے جس کا اولین مقصد اردو کتابوں کی نشر و اشاعت اور مالی امداد بہم پہنچانا ہے۔ قومی اردو کونسل نے دہلی میں 1 اپریل 1996 سے فروغ اردو کے کام کاج کا آغاز کیا تھا۔ یہ ادارہ حکومت ہند کی نوڈل ایجنسی کے طور پر کام کرتا ہے۔ حالیہ برسوں میں اس ادارے کی سرگرمیوں کا دائرہ کافی وسیع ہوا ہے اور اردو زبان کے ہمہ جہتی فروغ کے ضمن میں یہ ملک کے سب سے بڑے سرکاری ادارے کے طور پر ابھرا ہے۔ کمپیوٹر ایجوکیشن کو اردو سے جوڑنا، اردو کتابوں کو انٹرنیٹ پر مہیا کرانا اور اردو کی تعلیم کو آن لائن کرنا، اس کی حالیہ اہم سرگرمیوں میں شامل ہے۔ اس ادارے نے ایک طرف جہاں بہت سے قلم کاروں کی کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی امداد فراہم کی ہے وہیں دوسری طرف بے شمار کتابیں بھی شائع کی ہیں، اس نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا و لغات، تاریخ، مختلف ادیبوں کی حیات و خدمات، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک و جغرافیہ، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری و کتابیات، معاشیات و تجارت اور نفسیات کے ساتھ ساتھ بچوں کا ادب اور تعلیم و تدریس پر متعدد کتابیں چھاپی ہیں۔ قومی کونسل کی ایک الگ پہچان اس اعتبار سے ہے کہ اس نے بہت سی ایسوسی ایٹیڈ ٹکسٹ بک کی اشاعت بھی کی ہے۔ نیز ادارہ خصوصاً این سی ای آر ٹی و مکتبہ جامعہ کی بھی کئی کتابیں چھاپ چکا ہے، جن میں ذرائع نقل و حمل کی ابتدا، جنگلات کی کاشت، بہادری کے کارنامے، تیز تر اور دور تر (نقل و حمل کی کہانی)، چٹانیں بولتی ہیں، جراثیم، رام پرساد بسمل کی آپ بیتی قابل ذکر ہیں۔ ایسوسی ایٹیڈ ٹکسٹ بک کے طور پر اس نے 30 سے زائد کتابیں شائع کی ہیں۔ جن میں آٹھویں، نویں، دسویں جماعت کے لیے جدید ریاضی، جدید تاریخ، حیوانیات، کیمیا، کامرس، طبعیات، طبعی جغرافیہ، علم شہریت، نباتیات، معاشیات، تاریخ، جغرافیہ کی کتابیں وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں قومی اردو کونسل کے پاس 'بچوں کا ادب' کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ بھی موجود ہے۔ یہ ادارہ بچوں کے لیے 300 سے زائد کتابیں شائع کرنے کا فریضہ انجام دے چکا ہے۔ ان میں اکثر و بیشتر کتابیں بے حد مقبول ہیں۔ 'اخبار کی کہانی'، 'اقبال کی کہانی'، 'اکبر الہ آبادی'، 'اقبال اور بچوں کا ادب'، 'انوار سہیلی کی کہانیاں'، 'انوکھی پہیلی'، 'انوہا اور کالا کنواں'، 'اولمپک گیمس'، 'اونٹ راجا'، 'اینڈرسن کی کہانیاں'، 'باپو اور بچے'، 'بچوں کی مسکان'، 'بچوں کی نظمیں'، 'بچوں کے حالی'، 'بچوں کے ڈرامے' وغیرہ ایسی ہی مقبول کتابیں ہیں۔

قومی اردو کونسل تعلیم و تدریس کے حوالے سے بھی اب تک تقریباً تیس کتابیں شائع کر چکی ہے۔ تعلیم و تدریس سے متعلق ان میں کئی کتابیں ایسی ہیں جو کسی نہ کسی سطح پر تعلیم و تدریس کے مسائل بھی حل کرتی ہیں اور نصابی سطح پر معاون بھی ثابت ہوتی ہیں۔

قومی کونسل نے حیات و خدمات اور زبان و لسانیات کے حوالے سے بہت اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں 'اردو صرف و نحو'، 'ابتدائی اردو'، 'اردو افعال'، 'املا نامہ'، 'انتخاب نثر اردو'، 'آہنگ اور عروض'، 'درس بلاغت'، 'صحت الفاظ'، 'صوتیات و فونیمیات'، 'نئی اردو قواعد'، 'وضع اصطلاحات' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کونسل نے نیشنل بک ٹرسٹ کی بہت سی اہم کتابوں کا اردو ترجمہ رنگین تصاویر کے ساتھ شائع کیا ہے تقریباً 470 کتابوں میں سے ایک سو پچیس کتابوں کا اردو ترجمہ کونسل نے چھاپا ہے کونسل کا یہ ایک اہم کارنامہ ہے۔ کونسل ادب اطفال پر ہر سال لاکھوں روپے خرچ کرتی ہے اور معیاری اور سستی کتابیں چھاپ کر بچوں کے لیے کتابیں مہیا کراتی ہے۔ نیز کونسل نے مختلف موضوعات پر بھی جن فن پاروں کو شائع کیا ہے ان کو بھی پیش نظر رکھا جانا چاہیے۔

نیشنل بُک ٹرسٹ (این بی ٹی) بھی ایک قومی ادارہ ہے جس کے اغراض و مقاصد میں کتابوں کی اشاعت کو کافی اہمیت دی گئی ہے۔ اس نے بچوں کے لیے کئی زبانوں میں بے شمار کتابیں شائع کی ہیں۔ ملک گیر سطح پر ان کتابوں کی پزیرائی بھی ہوتی رہی ہے۔ ان کی کئی کتابیں ایسی ہیں جو نصاب میں شامل ہیں اور کئی ایسی بھی ہیں جن میں شامل متون کو اردو کی نصابی کتابوں میں شامل کیا گیا ہے۔ این بی ٹی کی بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو نصاب کی تیاری اور بہتری کے لیے معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ ماہرین تعلیم کو چاہیے کہ وہ این بی ٹی کی کتابوں کی طرف بھی توجہ دیں۔ ان کتابوں کی مدد سے ہم بہتر سے بہتر نصاب تیار کر سکتے ہیں۔ این بی ٹی نے سب سے زیادہ بچوں کی کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کا الگ سے 'بچوں کا ادب' پر ایک کیٹلاگ شائع ہو چکا ہے۔ جہاں تک اردو کی بات ہے تو اس کے لیے بھی این بی ٹی نے اپنے اشاعتی پروگرام کے تحت کئی اہم اور کارآمد کتب شائع کی ہیں۔ این بی ٹی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ہر عمر کے بچوں کے لیے کتابیں تیار کی ہیں۔ چھ تا آٹھ، آٹھ تا دس، دس تا بارہ، دس تا چودہ، بارہ تا چودہ یہاں تک کہ Pre-school کی سطح تک کی کتابیں شائع کر چکی ہے۔ جس میں چند کتابیں ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔ ان کتابوں کے اردو تراجم منظر عام پر آ چکے ہیں۔

SOME INDIAN SAINT S,SOME STREET GAMES OF INDIA, SON'S ADAVANTURE, STORIES FROM BAPU'S LIFE,I AM BETTER THAN YOU, I LIKE THE WORD, INDIA'S YOUNG HEROES, INVENTIONS THAT CHANGED THE WORD, JAWAHAR LAL NEHRU, LET'S DO APLAY, MAD MANGO.

مذکورہ کتابوں کے علاوہ بھی بے شمار ایسی کتابیں ہیں جو بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہیں۔

مختصر یہ کہ بڑوں کے ساتھ ساتھ اب بچوں کے ادب پر بھی خاصی توجہ دی جا رہی ہے۔ اردو میں کئی رسائل ایسے بھی ہیں جو خالص بچوں سے متعلق لٹریچر شائع کرتے رہے ہیں۔ ان میں ماہنامہ 'پیام تعلیم (دہلی)'، 'ماہنامہ نور (رام پور)'، 'ماہنامہ امنگ (دہلی)'، 'ماہنامہ ثانی (لکھنؤ)'، 'ماہنامہ چندہ نگری مراد آباد' اور ماہنامہ 'گل بوٹے' (ممبئی) کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح کچھ اور سرکاری اور پرائیویٹ ادارے بھی ہیں جنھوں نے بچوں کے ادب کے لیے کام کیے ہیں۔ ان میں 'کھلونا بک ڈپو'، 'چلڈرنس بک ٹرسٹ'، 'نیشنل بک ٹرسٹ'، 'پبلی کیشن ڈویشن'، 'ملک بک ڈپو' کے نام کافی اہم ہیں۔ ساہتیہ اکادمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور نیشنل بک ٹرسٹ اس اعتبار سے اہم ہیں کہ ان اداروں کی خدمات اور کتابوں کے ذخیرے سے اسکولی سطح کے نصاب کی تیاری اور بہتری کے لیے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

Mushtaque Sadaf,Programme Officer, Sahitya Akademi, New Delhi

شاکر علی صدیقی

مومن خاں مومن

ایک غزل کا تجزیاتی عمل

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہوگئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منھ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے
شاید شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

صاحب نے اس غلام کو آزاد کردیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا؟
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

ان ناتوانیوں پہ بھی خار راہ غیر
کیوں کر نکالے جاتے نہ اس کی گلی سے ہم

لے نام آرزو کا، تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

حکیم مومن خاں مومن (1800 تا 1852) غالب کے معاصرین میں سے ایک نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کے کلام کا طرۂ امتیاز حسن وعشق ہے۔ ان کی شاعری طرز اظہار کی بنا پر انفرادیت کی مظہر ہے۔ ان کی شاعری کا اصل پہلو عشق مجازی ہے۔ وہ عاشقانہ مضامین کے شیدائی تھے۔ ان کے یہاں تین کردار اہم ہوتے ہیں، اول عاشق دوم معشوق اور سوم عاشق ومعشوق کے مابین رقیب۔ مومن واردات و کیفیات کے بجائے معاملہ بندی، معنی آفرینی اور نازک خیالی کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں صنعت مکر شاعرانہ کا استعمال کثرت سے ہے۔ زبان و بیان سے بدرجہ اتم واقفیت اور آگہی کے باعث ان کی شاعری میں رعایت لفظی کا اظہار بھی برمحل ہوا ہے۔ ان کے بعض اشعار بظاہر آسان معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کی تفہیم مشکل طلب ہوتی ہے۔ مثلاً:

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

سر شک اعتراف عجز نے الماس ریزی کی
جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوگشتہ طاقت کا

مومن خاں مومن کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے تخلص 'مومن' سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسے متعدد الفاظ کا بہ خوبی استعمال کیا ہے جو مذہبی تلازمات و انسلاکات کے حامل ہوتے ہیں۔ مثلاً بت، بت خانہ، بت ترسا، بت پرستی، بت شکنی، بت پردہ نشیں، بت خانہ چیں، کفر، کافر، رام، گناہ، صنم، ابروئے صنم، صنم سنگ دل، رشتۂ زنار، ایمان، آفت ایمان، مومن، حرم، سجدہ، ظلمت کدہ، بدعتی اور کلیسا وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کو مومن نے بہ کثرت

اور یہ خوبی مقطع میں شامل کیا ہے، جن کی چند مثالیں زیرِ نظر ہیں:

ہرگز نہ رام وہ صنم سنگ دل
مومن ہزار حیف کہ ایماں گیا عبث

بت خانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے
مومن! بس اب معاف! کہ یاں جی بہہ گیا

حوران بہشتی کو بتوں کا سا نہ پایا
مومن مجھے کیوں کر نہ ہو ایمان کی شکایت

مومن کی غزل گوئی کا امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری میں روانی اور شعری آہنگ کا خاص اہتمام ملتا ہے۔ یہ روانی ان کے ارتباط الفاظ و معنی کی تشکیل سے مختص ہے۔ شعری آہنگ کا تعلق ان کی موزونیت طبع اور قوت اختراع سے عبارت ہے۔ انھوں نے کلام میں بیشتر مترنم بحور کا استعمال کیا ہے۔ مومن کی زیرِ تجزیہ غزل سات اشعار پر مشتمل ہے، جس میں مطلع، حسن مطلع اور مقطع بھی شامل ہے۔ اس غزل کا قافیہ 'ی' اور ردیف 'سے ہم' ہے۔ یہ پوری غزل ایک مخصوص طرزِ اظہار پر مبنی ہے۔ ماقبل مقطع شعر میں لفظ 'غیر' مومن کا خاص لفظ ہے، کیونکہ ان کے یہاں رقیب کبھی 'غیر' کبھی 'عدو' اور کبھی 'مدعی' کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جیسا کہ مذکورہ غزل میں غیر اور مدعی دونوں موجود ہیں۔

مطلع کا مصرعہ اولی لفظ 'ٹھان' محبوب سے بیزاریِ عشق کا اعلان کرتا ہے یعنی ستم گر معشوق کے ظلم سے عاشق نے اپنے دل میں مصمم عزم کیا کہ اب ہم اس ظلم شعار محبوب سے کبھی بھی نہیں ملیں گے۔ لیکن ہوا اس کے برعکس، کیوں کہ دل خواہشات کا منبع ہوتا ہے، وصل کی خواہش عاشق پر غالب آگئی، اس لیے عاشق کا ناچار (کمزور) دل متحمل نہ ہوسکا کہ وہ اپنے عزم پر قائم رہتا۔ لہٰذا عاشق کا جذبہ عشق جفا پیشہ محبوب کے اعمال کا متحمل ہوگیا۔ مومن نے لفظ 'ٹھان' کا استعمال ایک طرف شدت عشق اور دوسری طرف شدت بیزاری کے باعث کیا ہے۔ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ مثلاً عہد، ارادہ یا سوچا وغیرہ استعمال کرتے تو محبوب کی سختی اور اپنی بے چارگی کا اظہار اتنے خوبصورت انداز میں نہیں ہو پاتا۔ اس شعر میں ایک خوبی یہ بھی پنہاں ہے کہ عاشق اپنی مجبوری کا مدار دل پر ڈال کر اپنے جذبہ بے اختیار شوق کو دکھلانا چاہتا ہے۔

مومن نے حسن مطلع کے مصرعہ اولی میں لفظ 'کسی کو' اور 'کسی سے' کا استعمال بہ خوبی کیا ہے۔ 'کسی کو' کے معنی محبوب کے ہیں اور 'کسی سے' کے معنی رقیب کے ہیں۔ کلاسیکی شاعری کا یہ وصف ہے کہ محبوب اپنے عاشق کو تکلیف دیتا اور پریشان کرتا ہے۔ معشوق اپنے عاشق کو خاطر میں نہ لاکر بلکہ عاشق کے رقیب پر مہربان ہوتا ہے۔ من وعن صورت حال یہاں بھی ہے، اسی

مومن کی غزل گوئی کا امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری میں روانی اور شعری آہنگ کا خاص اہتمام ملتا ہے۔ یہ روانی ان کے ارتباط الفاظ و معنی کی تشکیل سے مختص ہے۔ شعری آہنگ کا تعلق ان کی موزونیت طبع اور قوت اختراع سے عبارت ہے۔ انھوں نے کلام میں بیشتر مترنم بحور کا استعمال کیا ہے۔ مومن کی زیرتجزیہ غزل سات اشعار پر مشتمل ہے، جس میں مطلع، حسن مطلع اور مقطع بھی شامل ہے۔ اس غزل کا قافیہ 'ی' اور ردیف 'سے ہم' ہے۔ یہ پوری غزل ایک مخصوص طرز اظہار پر مبنی ہے۔ ماقبل مقطع شعر میں لفظ 'غیر' مومن کا خاص لفظ ہے، کیونکہ ان کے یہاں رقیب کبھی 'غیر' کبھی 'عدو' اور کبھی 'مدعی' کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جیسا کہ مذکورہ غزل میں غیر اور مدعی دونوں موجود ہیں۔

روایتی محبوب کا رونا شاعر نے بھی اس شعر میں رویا ہے۔ عاشق اپنے معشوق کو جب رقیب کے ساتھ ہنستے دیکھتا ہے تو اسے دلی تکلیف ہوتی ہے جس کے باعث وہ دیدۂ حیرانی سے کبھی معشوق کا چہرہ دیکھتا ہے اور کبھی رقیب کا۔ معشوق کے اس عمل کو دیکھ کر عاشق اپنی بے کسی اور لاچاری پر روتا ہے۔ کیونکہ عاشق ایک طرف محبوب کو اس عمل سے باز نہیں رکھ سکتا ہے تو دوسری طرف اس کا دل بھی جذبہ عشق کی وجہ سے قابو میں نہیں ہے۔ ہنستے اور روتے میں صنعت تضاد ہے۔

اس شعر میں رعایت لفظی اور پیکر تراشی کو بھی شاعر نے ملحوظ رکھا ہے۔

تیسرے شعر میں عاشق معشوق سے ہم کلام ہے۔ مدعی کی شکایت عاشق کے مذاق عشق سے مطابقت رکھتی ہے، کیونکہ عاشق کے حق میں رقیب نے وہ عمل انجام دیا جس کا عاشق متلاشی تھا۔ رقیب نے عاشق سے بدگمانی کی کہ عاشق تمھارے اعمال وافعال کی شکایت لوگوں سے کرتا رہتا ہے۔ رقیب کی اس چغل خوری سے معشوق ناراض ہوکر رسوائیِ زمانہ سے بچنے کے لیے عاشق کو قتل کرنے کا تہیہ کرلیتا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ اگر حقیقتاً میں اپنی جان سے بیزار نہ ہوتا تو رقیب کے جھوٹے الزام سے بچنے کے لیے ضرور گواہی طلب کرتا۔ عاشق خود بیزاری جان کے باعث محبوب کے ہاتھوں قتل ہونا چاہتا ہے۔

اس شعر کا بنیادی تصور ہے کہ عاشق معشوق کی ظلم شعاری سے تنگ آکر قتل کا متمنی ہے۔ کلاسیکی عاشق اپنے معشوق کے ہاتھوں قتل ہونا باعث افتخار سمجھتا ہے۔ جیسا کہ غالب نے کہا:

مرنے کی اے دل، اور ہی تدبیر کر، کہ میں
شایان دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

مومن نے اپنی مثنوی 'قول غمیں' میں امۃ الفاطمہ صاحب جی سے اپنے عشقیہ معاملات کا ذکر کیا ہے۔ اس لیے لفظ 'صاحب' مومن کے محبوب کا تخلص ہے۔ صاحب بہ معنی 'آقا' یعنی معشوق اور غلام بہ معنی عاشق۔ کلاسیکی غزل کی یہ روایت ہے کہ محبوب حاکم اور عاشق حکم الیہ ہوتا ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے اپنے عاشق کو رکھتا ہے۔ شاعر نے اسی بات کو نظم کیا ہے۔ کہ معشوق نے اپنے عاشق کو آزاد کردیا ہے یعنی نازمند معشوق کی ہمیشہ عاشق نیازمندی کرتا رہا، لیکن پھر بھی یہ کیسی بندگی تھی کہ محبوب نے بندگی سے ہی آزاد کردیا۔ مومن نے مصرعہ ثانی میں 'لو بندگی' سے معشوق پر طنز بھی کیا ہے۔ عاشق تو ہر طرح سے معشوق کی نازبرداری کرتا رہا پھر بھی اسے جو صلہ دیا گیا وہ اس (عاشق) کے بادل ناخواستہ تھا، کیوں کہ معشوق نے بندگی سے عاشق کو یکسر برطرف کردیا۔ غالب نے بھی ایک غزل کے مقطع میں روایتی محبوب کے اسی طرزِ عمل کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے:

کہوں کیا خوبی اوضاع ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

غالب اور مومن دونوں نے ایک ہی مضمون کو نظم کیا ہے، لیکن دونوں کے طرزِ اظہار میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ مومن نے خواہش مذاق کا اطلاق معشوق کے منفی رویے پر کیا ہے، جب کہ غالب نے زمان کو قصور وار ٹھہرا کر محبوب کو بری الذمہ کر دیا ہے۔ غالب نے کلاسیکی روایت کا خیال ملحوظ رکھا، جب کہ مومن سے کلاسیکی روایت ترک ہوگئی ہے۔ کلاسیکی شاعری کا یہ امتیاز رہا ہے کہ عاشق معشوق کے تمام منفی اور مثبت اعمال کا انطباق 'کوتاہی عمل' کو اساس بنا کر 'زمانے' یا 'اپنے سر' کرلیتا ہے۔ مثلاً:

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

فطری طور پر مومن کی شاعری تصورِ حسن وعشق کے اردگرد رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں شاعری کی اساس معاملہ بندی اور پیکر تراشی پر منضبط ہے۔ اس لیے مومن نے مخصوص طرز اظہار کو بروئے کار لاکر اپنے شعر کے معنوی تنوع کو محدود کر دیا۔ اس کے برعکس غالب تعقل وتفکر کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے شعر کو شعبہ ہائے عشق کے مخصوص عمل سے نہ جوڑ کر شعبہ ہائے زندگی کے تجربات میں شامل کر دیا، جس کے باعث ان کے شعر میں آفاقیت اور تہہ داری پیدا ہوگئی۔ بہرحال شعر کا بنیادی تصور یہ ہے کہ عاشق کو نیکی کے عوض بدی ملتی ہے۔ صاحب اور غلام، غلام اور آزاد میں صنعت تضاد ہے۔ صاحب اور آزاد، بندگی اور غلام میں صنعت تناسب ملحوظ ہے۔

مومن نے پانچویں شعر کے مصرعہ اولی میں دو متضاد الفاظ 'بیگانہ' اور 'آشنا' کو ایک ساتھ استعمال کرکے ایک نئے پہلو کو پیش کیا ہے۔ بیگانہ کا اطلاق محبوب پر ہے اور آشنا کا دل پر۔ یعنی عاشق کے نزدیک محبوب 'بیگانہ' تھا، لیکن عاشق کا دل اس محبوب سے 'آشنا' تھا۔ اس لیے عاشق اپنے ضمیر سے تذبذب کی حالت میں ہم کلام ہوکر سوال کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے دل کو کوئی اجنبی آشنا لے گیا۔ یعنی عاشق کو علم ہے کہ ہمارا دل اجنبی محبوب پر فریفتہ ہوگیا ہے۔ لیکن پھر بھی اپنے کو احساس دلانے کے لیے عاشق خود کلام ہے کہ ہم کیوں اپنے کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں؟ اس کا جواب سوال ہی میں مخفی ہے۔ دل کو بیگانہ محبوب لے گیا جس سے ہم اپنے کو اجنبی لگنے لگے ہیں۔ یہ شعر تجاہل عارفانہ کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں لف ونشر مرتب بھی ملحوظ ہے۔

آخری شعر میں عاشق نے اپنے مراحل عشق کی ناتوانی کا ذکر بہت ہی اچھے انداز میں کیا ہے۔ عاشق مرض عشق کی صعوبتیں جھیلتے جھیلتے کمزوری کے انتہائی درجہ تک جا پہنچتا ہے، جس کی وجہ سے وہ سوکھ کر مثل کانٹے کے ہوگیا۔ پھر بھی ناتواں عاشق 'غیر' یعنی رقیب کے لیے کوچہ یار کا کانٹا بنا ہوا تھا۔ اس لیے محبوب نے جب دیکھا کہ عاشق رقیب کی آمد ورفت میں مثل خار راہ ہے، تو معشوق نے عاشق کو اپنی گلی سے نکال دیا ہے اور

مجموعی طور پر پوری غزل کا تجزیاتی عمل اس بات کا ضامن ہے کہ مومن کی یہ غزل 'عشق' کو بنیادی فریضہ تسلیم کرتی ہے۔ یہ فریضہ ان کے مخصوص اعمال و افعال سے عبارت ہے۔ مومن نے موضوعاتی دائرے کو محدود رکھتے ہوئے اس غزل کو بھی لفظیاتی تنوع سے مزین کیا ہے۔ مومن کی پوری شاعری اسی بنیادی صفت کی متصف ہے جس کی وجہ سے ان کا کلام معاصرین شعرا کے کلام سے انفرادیت اور امتیازیت کا درجہ رکھتا ہے۔

یہ دنیاوی قاعدہ بھی ہے کہ راستے سے خار کو ہٹا دیا جاتا ہے۔ شاعر نے ناتواں عاشق کو کانٹے سے تشبیہ دی ہے یعنی عاشق غم عشق کا تحمل نہ کرسکا جس کے باعث سوکھ کر کانٹا ہوگیا ہے۔ ایک طرف مومن نے عاشق کی وفا شعاری تو دوسری طرف معشوق کی جفاشعاری کو اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے جو مومن کے مخصوص انداز بیان سے عبارت ہے:

لے نام آرزو کا، تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

ڈاکٹر خلیق انجم اپنے مضمون 'مومن کا سوانحی خاکہ' میں پروفیسر ضیا احمد بدایونی کے حوالے سے مومن کے مذہبی عقائد کے ذیل میں مذکورہ شعر کی وجہ تخلیق یہ لکھتے ہیں کہ:

''مومن کے مولانا فضل حق خیرآبادی سے مراسم تھے۔ چوں کہ دونوں کے عقائد میں اختلاف تھا اس لیے کبھی کبھی بحث ہوجاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ دونوں میں ایک بار مناظرہ ہوگیا تھا۔ مومن غالب رہے، لیکن اس بحث سے طبیعت مکدر ہوگئی اور مذکورہ شعر کہا۔

اس شعر میں لطف یہ ہے کہ مولانا فضل حق خیرآبادی 'فرقتی' اور 'آرزو' تخلص کرتے تھے۔'' (مومن خاں مومن: حیات وشاعری، ص19-18، مرتبہ: پروفیسر نذیر احمد، سن اشاعت: 1999، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی)

بہرحال مقطع میں عاشق 'آرزو' کا منکر ہے۔ عاشق کی روایت میں لفظ 'آرزو' کو کسی بدعت سے کم نہیں سمجھتا ہے۔ بدعت کے لغوی معنی مذہب میں کوئی نئی بات یا رسم پیدا کرنا ہے۔ بدعتی یعنی بدعت کرنے والا۔ عاشق کے نزدیک عشق بھی ایک مذہب ہے، جیسا کہ میر تقی میر نے کہا:

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

کلاسیکی عاشق غزل کے روایتی دائرۂ کار میں رہ کر ہی عشق کرتا ہے۔ کلاسیکی عاشق کے نزدیک آرزو کا ہونا معیوب ہے۔ مومن نے اپنے تخلص سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بدعتی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ دل اور آرزو کا ارتباط عاشق کے نزدیک اسی طرح ہے جس طرح مومن اور بدعتی میں ہے یعنی سچا عاشق اس وقت تک نہیں ہوسکتا ہے جب تک دل سے آرزو کو نہ نکال دے۔ اسی طرح اس وقت تک سچا مومن بھی نہیں ہوسکتا ہے جب تک اس کا تعلق بدعتی سے رہے۔ یہ شعر تمثیل پر مبنی ہے۔ آرزو اور دل میں مناسبت ہے۔

مجموعی طور پر پوری غزل کا تجزیاتی عمل اس بات کا ضامن ہے کہ مومن کی یہ غزل 'عشق' کو بنیادی فریضہ تسلیم کرتی ہے۔ یہ فریضہ ان کے مخصوص اعمال و افعال سے عبارت ہے۔ مومن نے موضوعاتی دائرے کو محدود رکھتے ہوئے اس غزل کو بھی لفظیاتی تنوع سے مزین کیا ہے۔ مومن کی پوری شاعری اسی بنیادی صفت کی متصف ہے جس کی وجہ سے ان کا کلام معاصرین شعرا کے کلام سے انفرادیت اور امتیازیت کا درجہ رکھتا ہے۔

■

Shakir Ali Siddiqui, Room No 111, Allama Iqbal Hostel, JMI, New Delhi - 110025

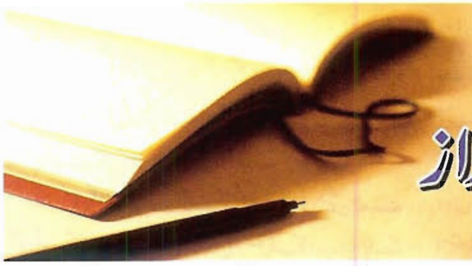

مجید بیدار

فن پارے کی ترجمانی کے مختلف انداز

ادب کی نمائندگی کرنے والے مختلف شہ پاروں اور ان میں شامل مواد کی بنیاد پر یہ فیصلہ کرنا لازمی ہوجاتا ہے کہ فن پارے کو اس کی جہت کے اعتبار سے کس مقام و مرتبے کا حامل قرار دیا جائے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے محققین اور ناقدین نے بھی ابھی تک حل نہیں کیا اور واضح اشارے بھی نہیں دیے کہ کسی فن پارے کا درجہ متعین کرنے کے لیے ان کی شمولیت کس صیغے میں کی جانی چاہیے۔ اس سلسلے میں غور و فکر کی شدید ضرورت ہے اور اس کے علاوہ ناقدین اور محققین کو نہ صرف دلائل کے ساتھ فن پارے کی جہت کا تعین کرنا چاہیے بلکہ اس کے ساتھ ہی بدلتے ہوئے انداز کی نشاندہی بھی کی جانی چاہیے۔ جب کوئی بھی کتاب منظر عام پر آتی ہے تو اس کے قاری کے ذہن میں مختلف سوالات ابھرتے ہیں کہ شائع شدہ کتاب کا شمار ادب پارے کی کس جہت میں کیا جانا چاہیے۔ کسی کتاب کا درجہ متعین کرنے کے لیے مختلف انداز موجود ہیں اور انھیں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کوئی بھی شائع ہونے والی کتاب کو اس کے مواد کے اعتبار سے حسب ذیل جہتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(1) تخلیق، (2) تصنیف (3) تالیف، (4) ترتیب (5) تدوین (6) ترجمہ (7) تلخیص

ادبی اعتبار سے مرتب ہونے والی کسی بھی کتاب کی حسب ذکر سات مختلف انداز کی نشاندہی کی بنیاد پر شناخت کی ہے لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ شناخت کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں اور کن اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے۔ اس مسئلے کو اردو کے ادبی مورخوں نے بھی حل نہیں کیا اور اس کے لیے واضح نقوش بھی متعین نہیں کیے۔ تا کہ کوئی بھی لکھی جانے والی کتاب کو حتمی طور پر کسی ایک صیغے میں شمار کر کے اس کا درجہ متعین کیا جاسکے۔ ایسی تمام کتابیں جو مختلف انداز سے منظر عام پر آتی رہتی ہیں، ان کی درجہ بندی ایک عام انسان کے لیے دشوار گزار مرحلہ ہے لیکن اس مسئلے کے حل کی طرف بھی توجہ دینا ضروری ہے، ورنہ مستقبل کے مورخ و نقاد کو مختلف دشواریوں کے ذریعے مسائل سے دو چار ہونا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ فن پارے اور اس میں شامل مواد کی اساس پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اسے درج شدہ سات مختلف ناموں میں کس نام سے منسوب کیا جائے۔

داستاں نویس ، افسانہ نگار، ناول نویس ، ڈادب پارے کی مختلف جہتوں میں سب سے اہم اور بلند مقام تخلیق کا ہے۔ درحقیقت کسی نئی فکر اور نئے انداز کے علاوہ تخیل کی بلند پروازی کو کام میں لاتے ہوئے جدت اور انفرادیت کو بنیاد بنا کر جو کتاب لکھی جائے گی اسے تخلیق کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے۔ عام طور پر قصہ، کہانی اور کرداروں کے عمل اور ان کے رویوں کو جن تحریروں میں یکجا

> فن پارے کی ایک اہم جہت کی حیثیت سے ترتیب کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ انگریزی زبان میں ترتیب کے لیے Compilation کا لفظ مروج ہے۔ بنیادی طور پر ایسی تمام تحریریں جو کسی اور مصنف سے متعلق ہوں لیکن ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ترتیب کے درجے سے گزاری جائیں تو ایسی تحریریں نہ تو تخلیق و تصنیف میں شمار کی جائیں گی اور نہ ہی انھیں تالیف کا درجہ حاصل ہوگا بلکہ وہ ترتیب کے درجے میں شمار کی جائیں گی۔ اطہر پرویز کی کتاب 'اردو کے تیرہ افسانے' اس اعتبار سے تالیف نہیں ہوسکتی کہ اس کتاب کی پیشکش میں اطہر پرویز کی ذاتی صلاحیتوں کو کم دخل ہے جب کہ اس ترتیب کے ذریعے عام طبقے کو اردو کے مشہور تیرہ افسانوں سے واقفیت دلانا ہے۔

کیا جاتا ہے ایسی تمام تحریریں 'تخلیق' کے درجہ میں شمار کی جائیں گی۔ رامہ نگار اور ان کے علاوہ ناولٹ نگار جب اپنی فکر کی جہتوں کو کام میں لاتے ہوئے نئے قصے بنتے ہیں اور انھیں زباں و بیان کی چاشنی کے ساتھ منظر عام پر لاتے ہیں چنانچہ ایسی کتابیں تخلیق کے درجہ میں شامل کی جائیں گی۔ تمام افسانوی نثر لکھنے والے قلم کاروں کی تحریروں کو بلاشبہ تخلیق کا درجہ حاصل ہوگا۔ بشرطیکہ لکھنے والے نے کسی دوسرے فن پارے سے استفادے کے بجائے اپنی ذہنی صلاحیت کا استعمال کیا ہو۔ بعض اوقات استفادے میں بھی تخلیق کا عمل کارفرما ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی اولین اور سب سے مشہور داستاں 'سب رس' گو کہ فارسی کے یحییٰ ابن سیبک فتاحی کی کتاب کا آزاد ترجمہ ہے۔ جسے ملا وجہی نے دکنی میں پیش کیا لیکن اس آزاد ترجمہ میں ملا وجہی نے اپنی تخلیقی سطح کو اس قدر بلند رکھا کہ جس کی مٹھاس سے ترجمہ شدہ متن بذات خود ایک نئی تخلیق کا وسیلہ بن گیا۔ چنانچہ ایسی تخلیقی فن کاری کی نمائندگی کرنے والے ادب پارے کو بھی تخلیق کا درجہ دیا جائے گا۔ اردو زبان و ادب میں دوسری زبانوں سے استفادے اور ترجمے سے بالکل مختلف مواد پیش کرنے والی داستانیں' ناولوں' افسانوی مجموعوں' ڈراموں اور

ناولٹ میں چونکہ تخلیق اور اس کی روش کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اس لیے ایسی تمام تحریروں کو 'تخلیق' کی ایک اہم نمائندہ تحریر کا درجہ حاصل ہوجائے گا۔ عام طور پر وہی کتابیں تخلیق کی فہرست میں شامل ہوں گی۔ جن کے توسط سے لکھنے والا اپنی فکر اور تخیل کی دنیا کو آباد کرتا اور اس سے لوگوں کے ذہنوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ چونکہ تمام تر افسانوی ادب Fiction ان خصوصیات سے مالا مال ہوتے ہیں۔ اس لیے افسانوی ادب سے وابستہ جو بھی تحریریں ہوں گی، انھیں تخلیق کی حیثیت سے قبول کیا جائے گا۔ پریم چند کے افسانے ہوں یا کرشن چندر کے ناول، امتیاز علی تاج کے ڈرامے ہوں یا قرۃ العین حیدر کے ناولٹ یا پھر کسی بھی زمانے کے اردو کے لکھے ہوئے ایسے داستانوی ادب جس سے تخلیقیت آشکار ہو، ان تمام کو تخلیق کی حیثیت سے قبول کیا جائے گا۔ سید انشاء اللہ خاں انشاء نے 'رانی کیتکی کی کہانی' تحریر کی۔ جس میں تخلیق کی خوبو

رچی بسی ہے۔ اس طرح یہ فیصلہ کرلیا جائے کہ افسانوی ادب کی نمائندگی کرنے والا تمام تحریری مواد تخلیق کا درجہ رکھتا ہے۔ تو ادبی فن پارے کی شناخت اور اس کے اصول مدون کرنے میں سہولت حاصل ہوجائے گی۔

کسی بھی تحریر کردہ کتاب کو 'تصنیف' کی حیثیت سے بھی قبول کیا جاتا ہے۔ کن کتابوں کو تصنیف کا درجہ دیا جائے اور ان میں کون کون سے متون شامل ہوسکتے ہیں اس کا فیصلہ کرنا بھی اس لیے ضروری ہے کہ قاری کو متن کی فراہمی کے ساتھ ہی نتیجہ اخذ کرنے میں سہولت ہوجائے تاکہ وہ جس کتاب کا مطالعہ کررہا ہے۔ اس کی جہت کی نمائندگی میں آسانی ہو۔ بنیادی طور پر کسی صنف کی نمائندگی کرنے والی کتاب کو تصنیف کا موقف حاصل ہوجاتا ہے۔ افسانوی نثر کے تمام انداز کے علاوہ غیر افسانوی نثر کے مختلف انداز کی نمائندگی کرنے والی کتابوں کو تصنیف کا درجہ دیا جائے گا۔ غیر افسانوی اصناف میں سفرنامہ نگاری، سوانح نگاری، خاکہ نگاری، تبصرہ نگاری، رپورتاژ نگاری، تحقیق وتنقید، خود نوشت سوانح، آپ بیتی وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ ان اصناف کی نمائندگی کرنے والی تمام کتابوں کو تصنیف کا درجہ حاصل ہوگا۔ اردو کی تمام لغات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ لغت کے مولفین نے تصنیف وتالیف کے معنی ایک جیسے بیان کیے ہیں چنانچہ فیروز اللغات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مولف نے تصنیف کو عربی مونث اسم بتاتے ہوئے اس کے معنی یہی بتائے ہیں کہ کتاب لکھنا، مضمون بنانا، طبیعت سے کوئی بات نکالنا۔ ان معنی سے نہ تو قاری کو تشفی حاصل ہوتی ہے اور نہ اطمینان نصیب ہوتا ہے اور اس کی درجہ بندی بھی سخت دشوار ہوجاتی ہے۔ اسی لیے یہ نتیجہ اخذ کرلیا جائے کہ کسی بھی صنف کی نمائندگی کرنے والی کتاب کو ادبی اعتبار سے تصنیف کا موقف حاصل ہوجائے گا۔ تنقیدی جائزے، تحقیقی مواد، خاکوں کے مجموعے، سفرنامے، سوانح عمری اور دیگر تمام غیر افسانوی اصناف کی نمائندگی کرنے والی تحریریں اور ان کی جہتوں کی شناخت کے لیے تصنیف کے لفظ کا رواج دینا حد درجہ ضروری ہے۔

ادب پارے کی مختلف جہتوں میں تصنیف کے بعد جس لفظ کو امتیاز کا درجہ حاصل ہے۔ وہ درحقیقت تالیف کا لفظ ہے۔ لغت کی چھان بین سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ بھی عربی اسم کا درجہ رکھتا ہے جو مونث کی حیثیت سے مروج ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے فیروز اللغات کے مولف نے لکھا ہے کہ تالیف درحقیقت دو چیزوں کو باہم ملانے یا جمع کرنے کا عمل ہے۔ اسی کے ساتھ یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ مختلف کتابوں کے مضامین چن کر نئے پیرائے میں ترتیب دینا تالیف کا درجہ رکھتا ہے۔ تالیف کے ایک معنی دوستی پیدا کرنے کے بھی درج کیے گئے ہیں۔ درحقیقت کسی ایک فرد کے ایسے مضامین یا ایسے موضوعاتی افکار جو مختلف انداز اور نہج کی نشاندہی کرتے ہوں اور جن میں لکھنے والے کی اپنی ذاتی صلاحیتوں کا استعمال ہو، ایسی لکھی جانے والی کتابوں کو تالیف کا درجہ دیا جاتا ہے۔ فیروز اللغات کے مولف نے تالیف کو درحقیقت ترتیب کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ جب کہ تالیف اور ترتیب میں بہت بڑا فرق ہے۔ کسی انسان کے ذاتی خیالات جو مختلف عنوانات سے یکجا کیے گئے ہوں چونکہ ان خیالات میں وابستگی اور ہم آہنگی کا معاملہ نہیں ہوتا اور ایک موضوع بنیادی طور پر دوسرے موضوع سے مختلف ہوسکتا ہے لیکن لکھنے والے کی ذہنی اپج بلا شبہ اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اس لیے تو ایسی تحریریں تالیف کے درجے میں شامل کی جائیں گی اور ایسی تالیفی خدمات انجام دینے والے فرد کو مولف کا موقف حاصل ہوگا۔ تالیف کے دوران کسی دوسری شخصیت کے موضوعات اور ان کی ترتیب کو دخل نہیں ہوتا۔ اسی لیے تصنیف کے بعد تالیف کو ایک اہم درجہ حاصل ہے۔ تصنیف اور تالیف میں بنیادی فرق یہی ہے کہ تصنیف کا کام کسی ایک صنف کو اجاگر کرکے نمایاں خصوصیات کی نشاندہی کرنے کی دلیل بن جاتا ہے جب کہ تالیف میں صنف کی پابندی نہیں ہوتی بلکہ آزاد فکری کے ساتھ کوئی انسان اپنے خیالات کی پیشکشی کی طرف توجہ دیتا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے مثالیں بھی ضروری ہیں چنانچہ مولوی عبدالحق کی لکھی ہوئی کتاب 'چند ہم عصر' کو تصنیف کا درجہ حاصل ہوگا۔ اسی طرح رشید احمد

صدیقی کی کتاب 'آشفتہ بیانی میری' بھی تصنیف کے درجے میں شمار کی جائے گی۔ اس کے بجائے مولانا حالی نے اپنی کتاب 'مجالس النساء' تحریر کی۔ اس کتاب میں حالی کے خیالات ہی قلمبند ہیں لیکن یہ کتاب چونکہ کسی صنف کی نمائندگی نہیں کرتی۔ اس لیے اسے تالیف کا درجہ حاصل ہوجائے گا۔ اردو کی بیشتر کتابیں ایک ہی ادیب اور فنکار کے خیالات سے وابستہ ہوں لیکن وہ مختلف الخیال موضوعات کی نشاندہی کرتی ہوں تو انھیں تالیف کا موقف حاصل ہوجائے گا۔ مولانا آزاد نے جب الہلال اور البلاغ رسالے نکالے اور ان میں مختلف مضامین لکھے اور ان مضامین کا تعلق مختلف موضوعات سے تھا۔ جنھیں بعد میں مرتب کرکے 'مضامین البلاغ' اور 'مضامین الہلال' کے نام سے شائع کیا گیا۔ ان مضامین کی نوعیت مختلف ہے لیکن سارے مضامین ابوالکلام آزاد کے لکھے ہوئے ہیں اس لیے ایسے مضامین کے مجموعوں کو بھی تالیف کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین اور چیدہ چیدہ لکھی جانے والی تحریروں کو جو کسی ایک ہی مصنف کے افکار کا نتیجہ ہوں اور انھیں یکجا کردیا جائے تو اس قسم کی تحریروں کو تالیف کا درجہ حاصل ہوگا۔

فن پارے کی ایک اہم جہت کی حیثیت سے ترتیب کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ انگریزی زبان میں ترتیب کے لیے Compilation کا لفظ مروج ہے۔ بنیادی طور پر ایسی تمام تحریریں جو کسی اور مصنف سے متعلق ہوں لیکن ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ترتیب کے درجے سے گزاری جائیں تو ایسی تحریریں نہ تو تخلیق وتصنیف میں شمار کی جائیں گی اور نہ ہی انھیں تالیف کا درجہ حاصل ہوگا بلکہ وہ ترتیب کے درجے میں شمار کی جائیں گی۔ اطہر پرویز کی کتاب 'اردو کے تیرہ افسانے' اس اعتبار سے تالیف نہیں ہوسکتی کہ اس کتاب کی پیشکش میں اطہر پرویز کی ذاتی صلاحیتوں کو کم دخل ہے جب کہ اس ترتیب کے ذریعے عام طبقے کو اردو کے مشہور تیرہ افسانوں سے واقفیت دلانا ہے۔ اسی لیے اس کتاب کا شمار ترتیب میں کیا جائے گا۔ کوئی ادارتی بورڈ یا انفرادی شخص نصابی کتابوں کی ترتیب کا کام انجام دے تو وہ مختلف اصناف اور موضوعات کی نمائندگی کرنے والے ادیبوں کے منتخبہ مواد کو یکجا کردیتا ہے۔ ایسا عمل بھی ترتیب میں شامل ہے۔ عابد حسین جیسے اہم ادیب نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے اردو کی جن اہم شخصیتوں پر مضامین نشر ہوئے تھے انھیں یکجا کرکے 'کیا خوب آدمی تھا' کے زیر عنوان کتاب تیار کردی۔ اس کتاب میں عابد حسین کے مضامین اور ان کی کوئی صلاحیت کا استعمال نہیں بلکہ مختلف الخیال مصنفین کے افکار کو یکجا کردیا ہے۔ اسی لیے 'کیا خوب آدمی تھا' کتاب کو ترتیب کے ضمن میں شمار کیا جائے گا۔ لغت کی اوراق گردانی سے یہ ثبوت کہیں بھی نہیں ملتا کہ اس انداز کو بھی ایک جہت کی حیثیت سے قبول کیا جائے۔ فیروز اللغات کے مولف نے ترتیب کو عربی مونث اسم قرار دیتے ہوئے اس کے چھ مختلف معنی درج کیے ہیں۔ ان کے نزدیک

ترتیب کے معنی درجہ بدرجہ رکھنا، سجاوٹ، انتظام یا صف بندی، طریقہ یا ڈھنگ، جنس واری سلسلہ بندی یا پھر جبر ومقابلے میں ہر قاعدے کا نام درج کیا گیا ہے۔ لغت کے اشارے ترتیب کی معنویت کو نمایاں کرنے میں مددگار نہیں ہوتے اور جس انداز سے ترتیب کی تشریح کی گئی ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ فن پارے کی ایک اہم جہت کی حیثیت سے لغت نویسوں نے ترتیب کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ جب کہ مختلف درجات کی کتابیں لکھنے اور ان کی اشاعت کا تمام تر کام ترتیب سے متعلق ہے۔ دورِ حاضر میں اس قسم کی کتابیں تیزی کے ساتھ منظر عام پر آرہی ہیں۔ کیونکہ علوم وفنون کی بڑھتی ہوئی طلب کے نتیجے میں انسان کو بیک وقت تمام کتابوں کے مطالعے سے سیری حاصل نہیں ہوسکتی چنانچہ ایسے وقت میں ترتیب اور انتخاب کا کام ایسا ہوتا ہے کہ جس کا مطالعہ کرکے قاری بیک نظر کسی فکر اور وسعت کو پہچان سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر میں ترتیب کے فن کو ترقی حاصل ہو رہی ہے اور بے شمار کتابیں ترتیب کی جہت کی نمائندگی کرتے ہوئے فن پارے کی حقیقت کی طرف نشاندہی کررہی ہیں۔

ترتیب کا کام کوئی بھی عام انسان انجام دے سکتا ہے اور ترتیب کے دوران قوت فیصلہ اور انتخاب کی روش کو کام میں لایا جاتا ہے لیکن ترتیب سے ہٹ کر ایک اور لفظ کا استعمال دورِ حاضر میں رواج پاچکا ہے۔ جسے تدوین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ فیروز اللغات کے مولف نے تدوین کے معنی 'تالیف کرنا' جمع کرنا یا مرتب کرنا کے درج کیے ہیں۔ حالانکہ جو معنی تالیف اور ترتیب کے تدوین کے توسط سے پیش کیے گئے ہیں۔ ان سے لفظ تدوین کی اہمیت واضح نہیں ہوتی۔ تدوین کا تعلق بلاشبہ تالیف وترتیب سے ضرور ہے لیکن اس عمل میں تالیف اور ترتیب سے زیادہ محنت و مشقت کو کام میں لایا جاتا ہے اور یہ کام درحقیقت تحقیق کا ایک جز ہے۔ بنیادی طور پر ایسی کتابیں جن کی ترتیب کے دوران یا پھر تالیف کے موقع پر حوالہ جات سے مدد لی جائے اور حواشی کو کام میں لایا جائے، ایسی ترتیب دی جانے والی تحریریں 'تدوین' کہلاتی ہیں۔ کوئی بھی متن جو کسی زمانے میں لکھا جائے اور اس کی لفظیات عصرِ حاضر میں پیچیدہ ہوجائیں تو ان لفظیات کی صراحت بھی حاشیے میں پیش کردی جاتی ہے۔ ایسا عمل نہ تو تالیف کے دوران اختیار کیا جاتا ہے اور نہ ہی ترتیب کے دوران روبہ عمل لایا جاتا ہے۔ غرض تدوین کا کام وہی افراد انجام دے سکتے ہیں جنھوں نے تحقیق سے اپنی دلچسپی کو برقرار رکھا ہو۔ اس طرح فن پارے کی ایک اہم قسم تدوین بھی قرار پاتی ہے اور ایسی تحریریں جو قدیم دور سے متعلق ہوں اور ان کی ترتیب کے دوران مولف وضاحتوں اور اشاروں سے کام لے اور مختلف حواشی لکھ کر مفہوم کو آسان بنانے کی کوشش کرتا رہے۔ تو اس قسم کے عمل کو بلاشبہ 'تدوین' کا درجہ حاصل ہوگا۔ دورِ حاضر میں پرانی قلمی کتابوں کی تدوین کا کام انجام دیا جارہا ہے۔ مولوی عبدالحق نے 'سب رس' مرتب کی تو اس کے دوران اشاریے اور حوالے ہی نہیں بلکہ فرہنگ کے استعمال پر بھی توجہ دی چنانچہ سب رس کی ترتیب کو فنی اعتبار سے تدوین کے زمرے میں شمار کیا جائے گا۔

کسی زبان کے متن کو اس کی معنویت برقرار رکھتے ہوئے دوسری زبان میں منتقل کرنا ترجمہ کہلاتا ہے۔ فن پارے کی مختلف جہتوں میں ترجمہ کو بھی ایک اہم جہت کا درجہ حاصل ہے۔ ترجمے کا کام انجام دینے کے لیے دونوں زبانوں پر یکساں عبور اور دونوں زبانوں کی قواعد اور علمی اصطلاحات سے واقفیت ضروری ہے ورنہ ترجمے کا کام اپنی سچائی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ لغت نویسوں نے اس حقیقت کی بھی نشاندہی کی ہے کہ ترجمہ درحقیقت عربی اسم مذکر ہے جس کے معنی ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کرنے کے ہوتے ہیں۔ لغت کے اعتبار سے ترجمہ کی صحیح تشریح کی گئی ہے لیکن اس کی وضاحت نمایاں نہیں ہوتی کہ ترجمہ کسے کہا جائے گا۔ بلاشبہ آج عالمی سطح پر علوم وفنون کے علاوہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے نتیجے میں ایک جانب ترجمے کی اہمیت میں اضافہ ہوگیا ہے تو دوسری جانب اخبارات اور علاقائی زبانوں کو سیراب کرنے کے لیے ترجمہ ایک وسیلے کا درجہ حاصل کرچکا ہے۔ آج کل مشینی ترجمے کا رواج بھی عام ہو رہا ہے لیکن لفظ کی گہرائی اور گیرائی اور محاورے کی صحیح ترجمانی مشین میں نہ ہونے کی وجہ سے مشینی ترجمہ اپنے بنیادی اصول سے بے نیاز ہوتا جارہا ہے۔ غرض جدید علوم پر لکھی جانے والی بیشتر کتابیں ترجمہ جیسی جہت سے وابستہ ہوتی ہیں۔ طبیعات، کیمیا، سائنس وٹکنالوجی، کمپیوٹرس اور علم طب اور علم ہندسہ کے علاوہ انجینئرنگ پر پیش ہونے والی بیشتر اردو کتابیں انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ جیسے مضامین کی کتابیں لکھنے کے لیے بھی آج کل ترجمے کا سہارا لیا جارہا ہے۔ بنیادی طور پر علوم وفنون کی نصابی کتابوں کی ترتیب کا معاملہ پہلے انگریزی میں ہوتا ہے پھر وہ کتابیں ملک کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کرکے نصاب میں شامل کی جاتی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمے کے فن کو بھی آج فروغ حاصل ہونے لگا ہے اور فن پارے کی ایک جہت کی حیثیت سے ترجمہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔

فن پارے کی ایک جدید جہت کی حیثیت سے 'تلخیص' کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ لفظ درحقیقت خلاصہ سے وجود میں آیا ہے۔ کسی بھاری بھرکم اور ہزاروں صفحات پر مشتمل یا کئی جلدوں کی کتاب کو اختصار کے ساتھ ایک چھوٹی کتاب یا چند چھوٹی چھوٹی کتابوں کی صورت میں پیش کردیا جائے تو ایسی تحریر کو تلخیص کا درجہ حاصل ہے۔ لغت نویسوں نے تلخیص کے معنی خلاصہ کرنا یا خلاصہ لکھا ہے۔ فنی اعتبار سے دورِ حاضر میں انسان کی زندگی حد درجہ مصروف ہوچکی ہے اور وہ کسی اعتبار سے ضخیم کتابوں کے مطالعے کا وقت نہیں رکھتا۔ چنانچہ وہ چاہتا ہے کہ بھاری بھرکم کتابوں کو مختصر انداز میں پیش کردیا جائے۔ چنانچہ کئی ادیبوں کی بڑی بڑی کتابوں کو اختصار کے ساتھ شائع کیا جانے لگا اور ہزار ہا صفحات پر مشتمل کتاب کا خلاصہ سو، ڈیڑھ سو صفحات میں پرپیش کیا جانے لگا۔ غرض اس انداز کو تلخیص کی حیثیت دی گئی۔ تلخیص سے مطالعہ کی وجہ سے ایک جانب تو پڑھنے والے کو سہولت حاصل ہوجاتی ہے تو دوسری جانب اختصار کی وجہ سے تفہیم کی ادائیگی بھی مکمل ہوتی ہے۔ اردو کے مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک طویل 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' ناول تحریر کیا تو حیدرآباد کے ایک فکشن رائٹر نے اس کی تلخیص 'وزیر خانم' کے نام سے پیش کردی۔ اسی طرح مختلف داستانوں اور طویل ناولوں کو عصرِ حاضر میں تلخیص کے ذریعہ نمایاں کیا جارہا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ فن پارے کی ایک ایسی جہت بھی اردو میں کارفرما ہے جسے تلخیص کا موقف حاصل ہے۔ غرض فن پارے کی مختلف جہتوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی کتاب منظر عام پر آئے تو بلاشبہ اس کا مطالعہ کرنے کے دوران قاری کو متن اور اس کے اظہار کے توسط سے یہ فیصلہ کرنے میں سہولت ہوجاتی ہے کہ جو کتاب زیر مطالعہ ہے اس کا شمار فن پارے کی کس جہت میں کیا جائے گا۔ فن پارے کی سات جہتوں کا ذکر کرکے یہاں ان کی تشریحات کے ذریعے تشنگی کو مٹانے کی کوشش کی گئی ہے اور توقع ہے کہ اس اظہار کے ذریعے قاری کو تخلیق وتصنیف ہی نہیں بلکہ تالیف وترتیب کے علاوہ تدوین وترجمہ اور تلخیص کے درمیان موجود فرق کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور وہ اپنی ذہنی سطح کو کام میں لاتے ہوئے فن پارے کا درجہ متعین کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

□

Prof. Majeed Bedar, Head, Dept of Urdu, Jamia Usmania Hyderabad (A.P.)

عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری

محمد کلیم محی الدین

عصمت چغتائی ہندوستان کی ایک مشہور فکشن نگار ہیں جنھوں نے خاکہ نگاری، ناول نگاری، افسانہ نگاری میں نام پیدا کیا۔ اترپردیش میں پیدا ہوئیں۔ جبکہ جودھ پور میں پلی بڑھیں جہاں ان کے والد ایک سیول ملازم تھے۔ 1934 میں انھوں نے، لحاف، کے نام سے کہانی لکھی۔ عصمت چغتائی لکھنو میں پروگریسو رائٹرز موومنٹ سے بھی منسلک رہیں۔ عصمت چغتائی 1991 میں انتقال کر گئیں ان کے مشہورِ زمانہ ناولوں میں ضدی، معصومہ، ٹیڑھی لکیر وغیرہ شامل ہیں۔ ٹیڑھی لکیر کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا گیا۔

افسانہ اردو ادب کی سب سے زیادہ مشہور نثری صنف ہے۔ داستانوں کے لیے وقت درکار ہوتا ہے اور بیسویں صدی میں فرصت کے لمحات کم ہی میسر آرہے تھے۔ فطری طور پر ان لمحات سے محظوظ ہونے کے لیے داستانوں نے افسانہ کی شکل لے لی۔ افسانے انگریزی ادب سے اردو میں داخل ہوا ہے۔ افسانے میں مختلف موضوعات شامل کیے گئے۔ منشی پریم چند نے افسانوں میں آزادی کی تحریک کے علاوہ سماجی مسائل کو بھی اجاگر کیا۔ واجدہ تبسم اور قرۃ العین حیدر نے انقلابی افسانے لکھے۔ افسانے میں سماجی مسائل کے علاوہ بہت سے موضوعات شامل کیے گئے۔ عصمت چغتائی نے خواتین اور ان سے جڑے مسائل پر لکھا ہے۔ ان کے افسانے اور ناول متوسط طبقے کی خواتین کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کا افسانے پہلا افسانہ 'گیندا' ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے کئی اہم موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار گیندا ہے۔ یہ ایک نہایت غریب لڑکی ہے۔ اس کی سہیلی ایک اوسط درجے کے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ کہانی اسی لڑکی کی زبانی سنائی جارہی ہے۔ دونوں بچپن سے ساتھ کھیلتے ہیں۔ گیندا کی بچپن میں ہی شادی ہوچکی ہے اور وہ بیوہ ہے۔ کھیل کے دوران جب گیندا کو سیندور دیا جاتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ ''بدھوا کا ہے کو سنگھار کرے''۔ گیندا کی سہیلی کا بھائی گیندا کو ماں بنادیتا ہے۔ کسی طرح لڑکے کو دہلی بھیج دیا جاتا ہے۔ سال دیڑھ سال بعد گیندا کی سہیلی واپس آتی ہے تو گیندا کی گود میں بچہ ہوتا ہے۔

عصمت چغتائی ترقی پسند ادب سے وابستہ تھیں۔ ترقی پسند ادب کے بارے میں ان انھوں نے کہا:

''ایسا ادب جو انسان کی ترقی چاہے۔ انسان کی بھلائی چاہے۔ وہ ادب وہ آرٹ جو انسان کو پیچھے نہ دھکیلے۔ انسان کو دنیا کی اچھی سمت پر چلائے۔ وہ ادب جو انسان کو صحت، علم اور کلچر حاصل کرنے میں مدد دے اور جو ہر انسان کو برابر کا حق دینے پر یقین رکھتا ہو۔ انسان کی زندگی کے عروج کا قائل ہو۔ انسان کو گندگی سے نکال کر صاف وشفاف علم کی طرف پہنچادے۔ مکمل طور پر انسان کی بھلائی چاہے۔ اس کے سوچنے کے انداز پر ایسا اثر ڈالے کہ بجائے پیچھے ہٹنے کے آگے بڑھے۔ اندھیرے میں جانے کی بجائے اجالے کی طرف آئے۔ وہ ادب ترقی پسند ہے۔

جب ہم ترقی پسند ادب کہتے ہیں تو اس کی وسعت لامحدود ہے۔ قصہ، کہانی، نظم، غزل غرض کہ ہر فکر و عمل کے کارہائے نمایاں جن سے انسان کی فلاح و بہبود مقصود ہو وہی دراصل ترقی پسند ادب ہے۔''

ترقی پسند ادب جو ترقی چاہتا ہے اسی کی ایک مثال افسانہ 'ایک شوہر کی خاطر' ہے۔ یہ افسانہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

''اور یہ سب کچھ بس ذرا سی بات پر ہوا مصیبت

آتی ہے تو کہہ کر نہیں آتی پتہ نہیں وہ کون سی گھڑی تھی کہ ریل میں قدم رکھا کہ اچھی بھلی زندگی مصیبت بن گئی۔ بات یہ ہوئی کہ اگلے نومبر میں جودھپور سے بمبئی آ رہی تھی۔ سب نے کہا ''دیکھو پچھتاؤ گی مت جاؤ، مگر جب چیونٹی کے پر نکلتے ہیں، تو موت ہی آتی ہے۔''

جیسے جیسے افسانہ پڑھتے جاتے ہیں گتھیاں کھلنے لگتی ہیں۔ کون سفر کر رہا ہے اور کیوں سفر کر رہا ہے وغیرہ۔

ریل کا سفر کرنے والی ایک عورت دوسری عورت سے بات چیت کرتی ہے اور اس کے بارے میں مختلف سوالات کرتی ہے۔

یہ افسانہ واحد متکلم کے صیغے میں لکھا گیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ریل کے واقعات بیان کرتی ہے۔ اس کی ریل میں ایک بچے والی عورت سے دوستی ہوتی ہے۔ شادی کے موضوع پر گفتگو ہوتی ہے۔ مختلف خیالات کو مکالموں کے انداز میں سمیٹا گیا ہے۔

عصمت چغتائی نے ایسے موضوعات پر بھی لکھا جن پر لکھنے والوں کو عوام میں اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اور ایسے لکھنے والوں کو فحش نگار کہا جاتا تھا۔ منٹو کے بعض افسانوں پر مقدمہ بازی ہوئی تو عصمت کو بھی ان کے بعض افسانوں کے لیے کئی تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑا۔ عصمت چغتائی کا افسانہ 'لحاف' اس کی مثال ہے۔ اس افسانے میں عصمت چغتائی نے ہم جنسی کو موضوع بنایا ہے۔ لحاف سے جنسی لذت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ سماج میں موجود برائی کو اس طرح ظاہر کیا جس طرح ایک ڈاکٹر مریض کے مرض کو دریافت کرتا ہے اور اس کا علاج بتاتا ہے۔ عریانیت سے بچتے ہوئے عصمت چغتائی نے اس افسانے کو مکمل کیا ہے۔

'آدھی عورت آدھا خواب' میں عورت کے مختلف روپ کو اجاگر کیا ہے۔ 'اپنا خون' افسانہ بھی عورت پر مظالم کو اجاگر کرتا ہے۔ 'اف یہ بچے' اور دیگر افسانوں میں خواتین اپنے مختلف مسائل کے ساتھ نظر آتی ہیں۔

'چھوٹی آپا' ایک پڑھی لکھی خاتون کی کہانی ہے۔ چھوٹی آپا کے پرانے خطوط کے بارے میں عصمت چغتائی اس افسانے میں لکھتی ہے:

''کون نہیں جانتا کہ چوری بری ہوتی ہے پر بعض چوریاں ایسی مزیدار ہوتی ہیں کہ نیت بھٹک ہی جاتی ہے۔ پوشیدہ خطوط، پرانی کتابیں اور کاپیاں اور ہزاروں ڈھکی چھپی چیزیں جنھیں لوگ کپڑوں کی تہوں کے نیچے چھپا کر رکھتے ہیں یہ چیزیں اگر ہاتھ لگ جائیں تو پھر کیا کہنے!۔''

عصمت چغتائی نے بہت ساری ڈھکی چھپی چیزوں کو اجاگر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کا افسانہ 'خدمت گار' میں بہت ساری باتوں کو مکالموں کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے۔

افسانہ 'عورت'، میں عورت کے بارے میں مختلف رائے کو پیش کیا ہے۔ اس اقتباس کو دیکھیے:

عورت......عورت......عورت......

بڑی اچھی، بے وفا، باوفا، ایسی ویسی اور خدا معلوم کیسی کیسی۔

ہر ملک اور ہر زمانے میں بڑے بڑے مفکروں نے عورت کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے ضرور قائم کی ہے۔ کوئی صاحب اس کے حسن پر زور دے رہے ہیں تو کوئی اس کی پارسائی اور نیک سیرتی پر مصر ہیں۔ ایک صاحب کا خیال ہے 'خدا کے بعد عورت کا مرتبہ ہے' تو دوسرے صاحب اسے 'شیطان کی خالہ' بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ایک صاحب فرماتے ہیں ایک دھوکے باز مرد سے ایک دھوکے باز عورت زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ جیسے کوئی یہ کہے کہ ایک کالے مرد سے ایک کالی عورت زیادہ کالی ہوتی ہے کس قدر شاندار بات کہی ہے، کہ بس جھوم اٹھنے کو جی چاہتا ہے اور اگر میں خود عورت نہ ہوتی اور ان اقوال نے مجھے بوکھلا نہ دیا ہوتا تو کہنے والے کا منہ چوم لیتی۔ مصیبت تو یہ ہے کہ ان نامعقول مقولوں نے سٹی گم کر رکھی ہے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ جتنا مردوں نے عورت کو سمجھنے کا دعویٰ کیا ہے اتنا عورتوں نے مردوں کے متعلق کبھی کوئی قول اپنی عقل سے نہیں بنایا۔ مردوں نے کہا 'مرد ظالم ہوتا ہے' وہ چپ چاپ ظلم سہنے لگیں۔ مردوں نے کہا 'عورت ڈرپوک ہوتی ہے' وہ چوہیا تک سے ڈرنے لگیں۔ پھر فرمایا ''وقت پڑے تو عورت جان پر کھیل جاتی ہے'' پس پھٹ سے جان پر کھیل گئیں۔''

عصمت چغتائی نے ایسے موضوعات پر بھی لکھا جن پر لکھنے والوں کو عوام میں اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اور ایسے لکھنے والوں کو فحش نگار کہاجاتا تھا. منٹو کے بعض افسانوں پر مقدمہ بازی ہوئی تو عصمت کو بھی ان کے بعض افسانوں کے لیے کئی تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑا. عصمت چغتائی کا افسانہ 'لحاف' اس کی مثال ھے. اس افسانے میں عصمت چغتائی نے ہم جنسی کو موضوع بنایا ھے. لحاف سے جنسی لذت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ سماج میں موجود برائی کو اس طرح ظاھر کیا جس طرح ایک ڈاکٹر مریض کے مرض کو دریافت کرتا ھے اور اس کا علاج بتاتا ھے. عریانیت سے بچتے ھوئے عصمت چغتائی نے اس افسانے کو مکمل کیا ھے.

'چوتھی کا جوڑا' عصمت چغتائی کا نمائندہ افسانہ ہے۔ یہ ایک غریب بیوہ بی اماں کے خاندان کی کہانی ہے۔ دو بیٹیوں کی ماں گھر میں زری کا کام کر کے اپنی اور بیٹیوں کی کفالت کرتی ہے۔ کبریٰ بڑی لڑکی ہے جس کی عمر کافی بڑھ چکی ہے اور اس کی شادی کی فکر میں وہ گھلی جا رہی ہے۔ جب کہ چھوٹی بیٹی وحیدہ ہے۔

زری اور کترن کے کام میں بی اماں بہت زیادہ ماہر تھی اور محلے کی عورتیں جن کپڑوں میں مکمل سلائی نہ ہوتی وہ لا کر بی اماں کے حوالے کر دیتی اور وہ اس طرح سے کترن کرتی کہ کپڑا برابر ہو جاتا۔ یہ مہارت و استقلال کے ساتھ کرتی اور محلے کی عورتیں حیرت سے اس کا منہ تکتی۔

بی اماں کی مہارت کے بعد عصمت چغتائی نے اس بیوہ کی دلی خواہش کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اپنی بیٹی کی شادی کی خواہش دل میں لیے وہ بار بار چوتھی کا جوڑا بناتی اور پرانا ہونے پر اسے ادھیڑ کر پھر سے نیا کر دیتی۔ بی اماں کی کیفیت کو وہ اس طرح بیان کرتی ہیں۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد بی اماں ایک بڑا صندوق کھول کر بیٹھ جاتی جس میں رنگ برنگے ڈوپٹے، شادی اور چوتھی کے جوڑے وغیرہ ہوتے۔ اسے دیکھ کر وہ کبریٰ کی شادی کے بارے میں سوچتی۔ محلے کی کتنی دلہنوں کے لیے جوڑا تیار کرنے والی بی اماں اپنی بڑی بیٹی کبریٰ کے لیے جوڑا تیار کرتی اور جب وہ پرانا ہو جاتا تو اسے ادھیڑ دیتی اور پھر سے نیا جوڑا بناتی۔

جب محلے کی چار عورتیں جمع ہوں تو مختلف مسائل پر گفتگو بھی ہوتی ہی ہے، ساتھ ہی کبھی کبھی بیہودہ مذاق بھی ہوتے تھے۔ ان مذاقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لطیف انداز میں عصمت چغتائی لکھتی ہیں۔

جب محلّہ کی عورتیں جمع ہو جاتی اور مذاق کرنے لگتی تو کم عمر اور کنواری لڑکیوں کو دور بیٹھا دیا جاتا۔ جب زور دار قہقہہ بلند ہوتا تو وہ لڑکیاں سوچنے لگتی کہ ہم کب اس طرح کا قہقہہ لگا سکیں گے۔ اس چہل پہل سے دور کبریٰ مچھروں والی کوٹھڑی میں سر جھکائے بیٹی رہتی۔

کبریٰ کی عمر بڑھ رہی ہے اور مچھروں والی کوٹھڑی میں پڑی رہتی ہے۔ اس کی چھوٹی بہن حمیدہ اس کہانی کا اہم کردار ہے اکثر جملے عصمت چغتائی نے اسی کے

ذریعے سے کہلوائے ہیں۔ حمیدہ کے ابو کی تفصیلات بھی حمیدہ کے ذریعے سے ہی بتلائی گئی ہیں:

حمیدہ چھوٹی بیٹی ہے اور اسے اپنے ابو کی یاد آتی ہے۔ ابو کتنے دبلے پتلے تھے جیسے محرم کا علم، ایک بار جھک گئے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح نیم کی مسواک توڑ لیتے اور پھر حمیدہ کو گھٹنے بٹھا کر نہ جانے کیا سوچتے ہوئے مسواک کرتے، مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا تو کھانستے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اتر آتی۔''

بی اماں کے شوہر کی بیماری کا تذکرہ عصمت چغتائی نے مکالمے کے ذریعے کیا ہے:

''کچھ دوادارو کیوں نہیں کرتے، کتنی بار کہا تم سے''

''بڑے شفا خانے ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ۔ روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن کھاؤ۔''

''اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر بھلا ایک تو کھانسی اوپر سے چکنائی، بلغم نہ پیدا کردے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی کو۔''

''دکھاؤں گا''

یہ کہہ کر وہ حقہ گڑگڑاتے۔

گھر کے اہم فرد کے انتقال کے بعد گھر کے حالات بالکل بدل جاتے ہیں۔ عصمت چغتائی نے ان تبدیلیوں کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

ابا ایک دن چوکھٹ پر گر گئے اور انھیں اٹھانے کے لیے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آسکا اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کی ضد کرنی چھوڑ دی اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اٹھ رہی ہے مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگ کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔''

کہانی میں ایک اہم موڑ اس وقت آتا ہے جب حمیدہ کے منجھلے ماموں کا بیٹا راحت اس بیوہ کے گھر میں ایک امید کی کرن بن کر آتا ہے۔ بیوہ بی اماں یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کے بھائی کا بیٹا یہاں آیا ہے تو ہوسکتا ہے اس کج داماد بن جائے۔ اپنے گہنے اور زیورات بیچ کر یہ بیوہ راحت کے لیے راحت کا سامان مہیا کرتی ہے تا کہ وہ مہمان نوازی سے خوش ہو اور کبریٰ سے شادی کرلے۔ عصمت چغتائی حمیدہ کی زبانی راحت کے آنے کی تفصیلات اس طرح فراہم کرتی ہیں:

''ایک دن منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلے میں آرہا ہے۔ بی اماں کو تو بس ایک دم جیسے گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا جانو راحت نہیں، چوکھٹ پر بارات آئی کھڑی ہو اور انھوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری ہو ل سے ان کے تو چھکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا۔''

راحت کے آنے کے بعد کبریٰ کی شادی کے لیے آس لگا کر گھر کو صاف کرتی ہے۔ مختلف قسم کے پکوان کی تیاری کرتی ہے۔ اس کی تفصیلات دیکھیے:

''تھوڑا سا چونہ منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آرہے تھے۔''

راحت کے آنے کی اطلاع پا کر حمیدہ بھی خوش ہوتی ہے۔ اور خوشی میں وہ فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی ''اللہ میرے اللہ میاں، اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے، میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی''۔

کبریٰ وہی کوٹھری میں چھپی رہتی ہے جب راحت صبح سوئیوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کرکے بیٹھک میں چلے جاتے تو کبریٰ نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کوٹھری سے نکلتی اور جھوٹے برتن اٹھا لیتی۔

کبریٰ اور حمیدہ میں مذاق بھی ہوتا ہے۔

لاؤ! میں دھوؤں بی آپا، حمیدہ نے شرارت سے کہا

''نہیں وہ شرم سے جھک گئی''

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی اماں مسکراتی رہیں اور کریپ کے دوپٹے پر پلو ٹانکتی رہیں۔

بیوہ کے گھر میں روز دعوتیں ہوتیں پھر گھر کے سامان کہاں گھر میں رہتے ہیں۔ پھول پتا اور چاندی کی پازیب فروخت کرکے وہ راحت کے لیے پراٹھے، کوفتے، پلاؤ وغیرہ کا انتظام کرتی اور خود پانی سے روکھا نوالہ نگلتی۔ داماد کو گوشت اور مچھلی کھلاتیں۔

راحت کے دل و دماغ میں ہوس سوار رہتی ہے اور اس کی نظر شروع سے وحیدہ پر تھی۔ جب وحیدہ ملیدہ لے کر راحت کے پاس جاتی ہے اور راحت سے کہتی ہے کہ یہ ملیدہ ہے۔ راحت منہ کھول دیتا ہے۔ وہ منہ میں نیاز کا ملیدہ ڈالنے کے لیے آگے بڑھتی ہے۔ راحت اسے دبوچ لیتا ہے اور وحیدہ کی عزت کو تار تار کر دیتا ہے۔

راحت کی واپسی کے بعد گھر کا نقشہ عصمت چغتائی نے وحیدہ کی زبانی اس طرح کھینچا ہے:

''صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی اس کے بعد اس گھر میں انڈے نہ تلے گئے، پراٹھے نہ پکے اور سوئٹر نہ بنے گئے۔ دق جو ایک عرصہ سے بی آپا کی تاک میں بھاگی بھاگی پیچھے آرہی تھی ایک ہی جست میں انھیں دبوچ لیتی تھی اور انھوں نے سر جھکا کر اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا''

بی اماں جو اپنی بیٹی کبریٰ کی شادی کا ارمان دل میں لیے چوتھی کا جوڑا تیار کرتی ہے وہ اسی لڑکی کے لیے کفن تیار کرتی ہے۔ افسانے کے آخر میں عصمت چغتائی نے اس مسئلے کی انسانی ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے لکھا ہے:

''کفن کے لٹھے کی کان نکال کر انھوں نے چوہرا تہہ کیا اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔ ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور موت بھرا اطمینان تھا۔ جیسے انھیں پکا یقین ہو کہ اور جوڑوں کی طرح یہ چوتھی کا جوڑا سینتا نہ جائے گا''

عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں میں عورت اور اس سے متعلق مسائل کو نہ صرف سمجھا بلکہ افسانوں میں شامل بھی کیا ہے۔ افسانوں کے موضوعات کے علاوہ افسانوں کے عناوین بھی عورت کے مختلف روپ کو اجاگر کرتے ہیں۔ 'کنواری'، 'گیندا'، 'دلہن'، 'ڈائن' اور بھی بہت سے افسانے ہیں جن کے عنوان خاتون کے نام پر ہیں یا خواتین سے متعلق ہیں۔

جذبات نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری کے بہترین نمونے ان کے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ عصمت چغتائی کو ہم بے شک ایک عظیم فنکار کہہ سکتے ہیں۔

■

Mohammed Kaleem Mohiuddin,
H.No.9-10-68/A/144/A, Resham Bagh,
Golconda Fort, Hyderabad- 500008 (AP)

محمد عرفان

قرۃ العین حیدر
عنوانات کے آئینے میں

ضلع بجنور ہندوستان کی تاریخ میں ادبی و سیاسی نقطۂ نظر سے ایک بلند مقام رکھتا ہے۔ آسمانِ سیاست کے آفتاب، حافظ محمد ابراہیم، سابق وزیرِ صوبۂ یوپی و وزیر کابینۂ ہند اور گورنر پنجاب، نگینہ ضلع بجنور کے متوطن تھے۔ ضلع بجنور میں ایک اور مردم خیز خطہ، قصبہ نہٹور اور اس کے قرب و جوار تک پھیلا ہوا ہے۔ ساداتِ نہٹور میں بڑے اولوالعزم ادیب اور اہلِ قلم پیدا ہوئے جن میں سے سجاد حیدر یلدرم اور ان کی صاحبزادی قرۃ العین حیدر نے ابدآباد کے لیے شہرت پائی ہے۔

قرۃ العین حیدر ایک صاحبِ طرزِ ناول نگار ہیں ان کے ناولوں کی فہرست طویل تو نہیں لیکن وقیع ضرور ہے۔ ان کے ناولوں میں جو چند ناول شہرۂ آفاق کہلائے ان میں 'سفینۂ دل'، 'میرے بھی صنم خانے'، 'آخرِ شب کے ہمسفر'، 'کارِ جہاں دراز ہے' اور 'آگ کا دریا' نہایت اہم اور قابل ذکر ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی یہ وہ تخلیقات ہیں جنھوں نے اردو ناول میں نئی جہتوں اور نئی سمتوں کا اضافہ کیا۔ قرۃ العین حیدر نے اردو کو جن امکانات و تجربات، جس جدت و انفرادیت اور جس تعمیق و وسعت سے آشنا کرایا وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

تکنیکی طور پر اردو ناول نگاری میں عرصۂ دراز سے ایک خلا، چلا آرہا تھا اس خلا کو پر کرنے کا اعزاز قرۃ العین حیدر ہی کو پہنچتا ہے، یوروپین ناول نگاری میں علم نفسیات کی ترقی کے زیراثر ناول نگاری کی ایک نئی تکنیک کا آغاز ہوا جس کو انگریزی میں 'اسٹریم آف کانشسنس' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اردو میں جس کا ترجمہ 'شعور کی رو' کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس میں مشہور ماہرنفسیات فرائڈ ینگ، ایڈلر وغیرہ کی نفسیاتی دریافتوں اور تجربوں کا اثر کارفرما نظر آتا ہے۔ ان حالات کے زیراثر ایک نئی ادبی فضا قائم ہوئی جس میں پہلا اقدام ایک یوروپین خاتون 'ڈورتھی رچرڈسن' کے نام جاتا ہے جن کی اوّلیت کو ایک دوسری خاتون ناول نگار 'ورجینیا وولف' نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ مردوں میں شعور کی رو تکنیک کا سب سے مکمل استعمال 'جیمس جوائس' نے کیا لیکن ایک طرح سے اس نفسیاتی اندازِ تحریر کی بنیاد ان سب سے بہت پہلے 'لارنس اسٹرن' کے یہاں پائی جاتی ہے۔ اردو میں اس تکنیک کو معراج کمال تک پہنچانے کا اعزاز قرۃ العین حیدر کو پہنچتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری ایک پوری لائبریری کی متقاضی ہے۔ ان کے ناولوں پر نام بنام تحقیق و تفصیل سے لکھنے کا یہ موقع نہیں ہے اور ان کی ناول نگاری کے گرداگرد نقد و نظر کا ایک مفید ترین ذخیرہ پہلے ہی جمع ہو چکا ہے۔ البتہ قرۃ العین حیدر کے ناولوں کے عنوانات کی استعاریت و اشاریت کا موضوع ابھی بہت تشنہ ہے۔ اگرچہ ان کے ناولوں کے عنوانات کے ماٰخذ کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔ اس پر بھی ان کے شہرۂ آفاق ناول 'آگ کا دریا' کا عنوان مزید تحقیق کا مستحق ہے۔

قرۃ العین حیدر ایک ایسی ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں کے لیے بیشتر عنوانات شعر وسخن سے اخذ کیے ہیں۔ مثلاً فیض کا یہ خوبصورت شعر:

آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

یا اقبال کا یہ شعر:

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اَب میرا انتظار کر

اسی طرح 'سفینۂ دل' اور میرے بھی صنم خانے، دنیائے شعر و ادب سے ماخوذ ہیں، اور اہل نقد و نظر ان تمام مآخذ سے بخوبی آشنا بھی ہیں لیکن قرۃ العین حیدر کا شہرۂ آفاق ناول 'آگ کا دریا' اس کلیے سے مستثنیٰ ہے اگر چہ یہ عنوان یعنی آگ کا دریا ذہن کو اردو کے اس مشہور شعر کی طرف مبذول کرتا ہے:

یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

لیکن یہ شعر ناول 'آگ کا دریا' کے عنوان کا ماخذ نہیں ہے بلکہ اس عنوان کا ماخذ کوئی مخصوص اور متعین طور پر ہے ہی نہیں۔ کیوں کہ اس عنوان کے پس منظر کا پھیلاؤ شعور کی رو کی تکنیک کی زمین سے لے کر فلسفہ الٰہیات کو آسمانوں تک پھیلا ہوا ہے۔ جس کے درمیان میں کتنی ہی متعد اور کڑیاں بھی ہیں — جو اس زمین کو ان آسمانوں سے جوڑتی ہیں۔

تکنیکی سطح پر آگ کا دریا ناول کے عنوان کی حیثیت سے اس شعور کی رو کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس کے میڈیم میں اس عظیم ناول کی تخلیق ہوئی ہے لیکن اس عنوان کے معنوی تانے بانے یہیں پر ختم نہیں ہو جاتے جیسا کہ اگلی تفصیل سے معلوم ہو جائے گا۔ مندرجہ بالا شعر ناول کے عنوان کا ماخذ اس لیے نہیں ہے کیونکہ قرہ العین حیدر کے ناول کا مرکزی خیال عشق نہیں بلکہ وقت ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر شمع افروز زیدی کا قول ہے کہ آگ کا دریا کا مرکزی کردار وقت ہے لوگ بدل جاتے ہیں وقت نہیں بدلتا، وہ رواں تھا اور رواں ہی رہتا ہے۔ جناب ماجد کلیم ناول 'آگ کا دریا' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس ناول میں وقت کا یہ تسلسل کرب کے لمحوں سے مرتب ہے۔ دریا وقت کی علامت ہے جو تباہ کن ہے اور قائم بھی رہتا ہے۔ یہ دریا آگ کا دریا اس لیے ہے کہ اس وقت سے مفر نہیں اور وقت کا ہر لمحہ کرب کا لمحہ ہے۔

یعنی زندگیاں موت کے گھاٹ اترتی رہتی ہیں لیکن وقت کی تلوار اپنی جگہ قائم رہتی ہے اس لیے 'خبر صادق' میں فرمایا گیا ہے 'الوقت سیف' یعنی وقت ایک تلوار ہے۔ اب اس میں وقت کی تباہ کن صلاحیت اور اپنے آپ میں قائم رہنے کی حیثیت بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ مصنفۂ محترم کی نظر ان حوالوں تک یا ان تک جو آگے آئیں گے پہنچ سکی ہے یا نہیں، لیکن جس کی نظر میں آگ کا دریا کے عنوان سے یہ اشارات و علامات ابھرتے ہیں وہ شخص آگ کے دریا کے متن کو ان اشارات و علامات کے سیاق و سباق میں دیکھنے پر مجبور ہے اور ان علامات و اشارات کو ذہن میں رکھ کر ناول میں جو تہہ داری ایک صاحبِ نظر کو محسوس ہوتی ہے وہ

تکنیکی طور پر اردو ناول نگاری میں عرصۂ دراز سے ایک خلاء چلا آرہا تھا س خلا کو پر کرنے کا اعزاز قرۃ العین حیدر ہی کو پہنچتا ہے، یوروپین ناول نگاری میں علم نفسیات کی ترقی کے زیراثر ناول نگاری کی ایک نئی تکنیک کا آغاز ہوا جس کو انگریزی میں 'اسٹریم آف کانشسنس' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اردو میں جس کا ترجمہ 'شعور کی رو' کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس میں مشہور ماہر نفسیات فرائڈ ینگ، ایڈلر وغیرہ کی نفسیاتی دریافتو ں اور تجربوں کا اثر کارفرما نظر آتا ہے۔ ان حالات کے زیراثر ایک نئی ادبی فضا قائم ہوئی جس میں پہلا اقدام ایک یوروپین خاتون 'ڈور تھی رچرڈسن' کے نام جاتا ہے جن کی اوّلیت کو ایک دوسری خاتون ناول نگار 'ورجینیا وولف' نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

ان کی غیر موجودگی میں ایک خلا پیدا کرتی نظر آتی ہے۔

وقت کی تباہ کن حرکات و حادثات کا حوالہ شیکسپیئر نے اپنے ایک سانیٹ کے خوبصورت پیکر میں پیش کیا ہے۔ وقت کی تباہ کن خصوصیت کے بعد اس کے تسلسل کا نمبر آتا ہے تو یہاں پر ہم مشہور فلاسفر برگ ساں کے فلسفۂ امتداد و استمرار زماں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس میں وقت کے تسلسل و تواتر کو اس قدر پر اثر انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ شاعر مشرق علامہ اقبال بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ وقت کو زندگی کا زمان و مکان تصور کرتے ہوئے شاعر مشرق علامہ اقبال اس تسلسل و تواتر کے لیے بحر بیکراں، جاوداں، رواں دواں جیسے مترادفات استعمال کرتے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

دمادم رواں ہے یم زندگی
(بال جبریل)

یعنی زندگی کا سیلاب ہمہ وقت رواں دواں رہتا ہے۔

دوسری جگہ مثنوی اسرار و رموز میں فرماتے ہیں:

این و آں پیداست از رفتارِ وقت
زندگی سریست از اسرار وقت
اصلِ وقت از گردشِ خورشید نیست
وقت جاوید ست و خود جاوید نیست

یعنی وقت مجموعۂ راز ہے زندگی اسی کا ایک عشرِ عشیر ہے۔ وقت امروز و فردا کا نام نہیں جن کی آمد و شد طلوع و غروب آفتاب کی مرہون منت ہوتی ہے۔ بلکہ وقت بذاتِ خود ایک زندۂ جاوید شے ہے باقی ہر شے عارضی ہے۔

اسی طرح انگریزی کا ایک رومانی شاعر ایک دوسرے موقعہ پر عارضیت و تواتر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

"نسلِ انسانی تو آنی جانی ہے لیکن دریا کا تواتر و تسلسل خلل سے بے نیاز ہے۔"

یہاں تک ہم نے اس پر تبصرہ کیا کہ وقت کو دریا کیونکر کہا جاسکتا ہے۔ اب ہم لفظ 'آگ کا دریا' کی ترکیب کے مآخذ پر غور کرتے ہیں اور اس کے کرب و اذیت پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

آگ کا رقیق تصور ہمیں مشرقی ادب کی مشہور اصطلاح 'آتش سیال' میں بھی ملتا ہے۔ اسی آتش سیال کا پیمانہ اگر لبریز ہو جائے تو وہی آگ کا دریا بن جاتا ہے۔ آگ کے دریا کا ایک معتبر تصور ہمیں ملٹن کی نظم 'فردوسِ گم شدہ' میں بھی ملتا ہے۔ جہاں ابلیس کو آگ کے سیلابِ رواں و تلاطم آتش فشاں سے متصادم پیش کیا گیا ہے اور ابلیس اور اس کے پرستاروں کو کرب و اذیت کی ہمیشگی سے دوچار دکھلایا گیا ہے۔ یہ ہے ناول کے عنوان آگ کا دریا کا پس منظر جس میں وقت کو مرکزی کردار مان کر اسے دریا کے کرب و اذیت کی صورت میں پیش کیا گیا ہے کیونکہ ناول کے شخصی کرداروں کو کرب و اذیت کشش و کشمکش، تصادم و تلاطم کی ایک مسلسل اور لامتناہی کیفیت کا شکار

دکھلایا گیا ہے۔

ہمارے عام تصور کے مطابق کسی ناول کے کردار غیر شخصی نہیں ہوا کرتے جب کہ 'آگ کا دریا' کا مرکزی کردار وقت ہے تو کیا اس جدت کا پس منظر بھی کسی روایت میں ملتا ہے یا نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر کی یہ جدت بھی خلا کی پیداوار نہیں ہے بلکہ صدیوں قبل یونانی و اطالوی کلاسیکی ڈراموں میں تقدیر یا مشیت کو مرکزی کردار کر کے پیش کیا گیا ہے جس روایت کو کچھ ردو بدل کے ساتھ شیکسپیئر نے برتا۔ آگے چل کر انگریزی کے مشہور ناول نگار تھامس ہارڈی نے اپنے یہاں کہیں تقدیر کہیں مشیت کہیں موسم اور کہیں ماحول کو کبھی پس منظر میں اور کبھی مرکزی کردار کر کے دکھایا ہے۔ اس طرح 'آگ کا دریا' اپنے عنوان کی تہہ داری کی طرح ایک نہایت ہی گیرائی اور گہرائی والا ناول ہے جس میں بصارت و بصیرت کے ساتھ معانی کی پرتیں یکے بعد دیگرے کھلتی چلی جاتی ہیں اور ناول نگار کو جدتِ اسلوب اور عظمتِ تصور کی عظیم بنیاد پر دورِ حاضر کا عظیم ترین ناول نگار کر کے پیش کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کو شاید اپنی ایک ہم نام شاعرہ قرۃ العین طاہرہ کے ساتھ ایک ٹیلی پیتھی یعنی روحانی لگاؤ نظر آتا ہے۔ اس کا ایک مشہور مصرعہ ہے:

دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

قرۃ العین حیدر کے عنوانات چوں کہ اپنے اندر علامتیت و اشاریت اور رمزیت و سریت لیے ہوئے ہیں اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے ناولوں کے متن کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ان کے ناولوں کے عنوانات میں پوشیدہ معانی کو بھی سمجھنا پڑے گا جس کے بغیر قرۃ العین حیدر کی فکر و فن کی عظمت سے لطف لینا ممکن نہیں۔

اِس مقام پر آ کر مجھے ایک دلچسپ شعر یاد آتا ہے جو اس طرح ہے:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

اگر ناول 'آگ کا دریا' کی محترم تخلیق کار میری اس

ہمارے عام تصور کے مطابق کسی ناول کے کردار غیر شخصی نہیں ہوا کرتے جب کہ 'آگ کا دریا' کا مرکزی کردار وقت ہے تو کیا اس جدت کا پس منظر بھی کسی روایت میں ملتا ہے یا نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر کی یہ جدت بھی خلا کی پیداوار نہیں ہے بلکہ صدیوں قبل یونانی و اطالوی کلاسیکی ڈراموں میں تقدیر یا مشیت کو مرکزی کردار کرکے پیش کیا گیا ہے جس روایت کو کچھ رد و بدل کے ساتھ شیکسپیئر نے برتا۔ آگے چل کر انگریزی کے مشہور ناول نگار تھامس ہارڈی نے اپنے یہاں کہیں تقدیر کہیں مشیت کہیں موسم اور کہیں ماحول کو کبھی پس منظر میں اور کبھی مرکزی کردار کرکے دکھایا ہے۔

طویل خامہ فرسائی پر نگاہ ڈالیں تو شاید ان کو تھوڑا انتظار اور تھوڑا اخلفشار پیدا ہوگا، کیونکہ ابھی تک جس امر واقعہ کا تذکرہ ہونا تھا وہ معرضِ اظہار میں نہیں آ سکا لیکن اب آتا ہے۔

جارج برنارڈ شا (George Bernard Shaw) کا ایک مشہور نیم تاریخی اور نیم تخلیقی ڈرامہ ہے جس کا عنوان 'سینٹ جون' (St. Joan) ہے، جس میں فرانس کی مشہور نیم تاریخی، نیم افسانوی ہیروئن سینٹ جون کو سیاسی اغراض اور مذہبی مقاصد کی بنا پر 'دریائے آتش زار' کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ جارج برنارڈ شا کے اس ڈرامے کے باب آخر میں یعنی (Epilogue) نہ صرف یہ کہ اُس آتش زار کو جس کے حوالے سینٹ جون کر دی گئی تھی ایک 'آگ کا دریا' کی صورت میں پیش کیا گیا ہے بلکہ صدیوں کے نظام الاوقات کو خواب اور شعور کی

رو— (Dream & Stream of Consciousness) کی تکنیک کے ذریعے لمحوں اور دقیقوں کی علامت سے تحریر کیا گیا ہے اور یہ کل تکنیک مع اپنے آتشیں عنوان کے قرۃ العین حیدر کے شہرۂ آفاق ناول 'آگ کا دریا' کا آخری ماخذ نظر آتی ہے۔

اس گفتگو کی طغیانیوں میں بہتے بہتے ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جس کا سرا لوٹ کر پھر نقطۂ آغاز سے جا ملتا ہے اور وہ شعر جس کو ہم ناول کے ماخذ سے باہر سمجھتے تھے، وہ شعر تحقیق و تنقید کے مزید دریچوں پر دستک دیتا ہوا دلچسپ نشان دہانیاں کرنے لگتا ہے۔ شعر یہ تھا:

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

دیکھنا یہ ہے کہ اردو شاعری میں 'آگ کا دریا' بطورِ تصور کہاں سے در آیا ہوگا، اور ڈوب کر تیر نکلنے کی کیا اہمیت ہوگی! اِس پر غور و فکر کرتے کرتے اتفاقاً ہماری نگاہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے تذکرے کے ان صفحات پر پہنچ جاتی ہے جہاں وہ اپنی اوائلِ عمر کی طوفان شناسیوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک طرف دریا سے ہم عنانی کا ذوق و شوق دوسری طرف آگ کے شعلوں سے سیراب ہونے کی یہ تشنگی— شاید یہ اس لیے ہو کہ اقلیم زندگی کی سطح پر پانی بہتا ہے، تہ میں آگ بھڑکتی رہتی ہے۔

اسی لیے نکتہ سرایانِ حقیقت کو کہنا پڑا کہ:

ہم سمندر باش ، ہم ماہی کہ در اقلیم عشق
روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

یعنی بطور ترجمہ شاعر کہتا ہے کہ دنیائے عشق میں بسنے والے کو بیک وقت دو طرح کا مزاج پیدا کرنا ہوگا۔ پہلے تو 'سمندر' نام کے اس جانور کا جس کا آشیاں آگ کے شعلوں سے ہی مرتب ہوتا ہے اور دوسرا مچھلی کا کہ جو پانی سے دور زندہ رہ ہی نہیں سکتی۔ اس طرح سمندر بن کر دریائے عشق کی گہرائی میں شعلوں سے لوہا لینا اور سطح کی نرم سیر موجوں کا لطف اٹھانا، یہ دونوں کیفیات پیدا ہوں تب انسان صاحبِ عشق کہلا سکتا ہے۔

اب اس سے آگے اگر پرواز کی جاتی ہے تو جبریلِ تخیل کے بازوؤں کو جل اٹھنے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہیں پر قطع کلام۔

□

Mohd Irfan, Qazi Sarai, H.M. I. Lane, Chhanga Wala Chowk, Nagina (Bijnor) 246762 U.P

ریاض احمد

کیرلہ کے اخبارات پر اردو زبان کے اثرات

انیسویں صدی کی شروعات میں مالابار میں (جو کیرلہ کا شمالی حصہ ہے ملیالم زبان میں اخبار اور رسالے نکالے جانے کا بہت ہی ذوق وشوق دیکھا گیا ہے۔ تمام اخبارات اور رسالوں کے بنیادی ڈھانچے اور ساری زبانوں کے لیے پالیسی یکساں تھی۔ بیشتر اخبارات میں اردو سیکھنے والوں کے لیے تھوڑی جگہ مخصوص ہوتی ہے تاکہ اردو زبان سیکھنے والوں کے لیے آسانیاں فراہم ہوں۔ اس سلسلے میں کئی کوششیں کی گئیں۔ اردو کی معروف کہانیاں، مضامین اور شاعری کا ملیالم زبان میں ترجمہ کر کے بھی شائع کیا گیا۔ اردو زبان کئی مدرسے میں بھی داخل نصاب ہوئی۔ کالی کٹ جو ایک تجارتی مرکز ہے، یہاں کے پریس اور کتابیں شائع کرنے والے ادارے بھی اردو کی اشاعت میں مددگار رہے۔ وہ اردو کے اسکالر اور شاعروں کے کلام کو شائع کرتے تھے۔ اس کے سرپرست جناب محمد سلیم تھے۔ ساہاکاری نیوز پیپر 1922 میں شروع کیا گیا۔ اس سے پہلے 1902 میں ایک اخبار 'پرواُپاکاری' نکالا گیا تھا، جس کو سید ثناء اللہ نے شروع کیا تھا۔ جو اردو داں اور مصنف تھے۔ وہ اردو کالم کی اہمیت کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ اس وقت اردو اسٹنسیل میں لکھی جاتی تھی۔ ہدایت ایک اور اخبار تھا جو نومبر 1922 میں آنجناب کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ اس اخبار کی خاص بات یہ تھی کہ اردو کالم کے علاوہ مذہب اسلام اور گاندھی ازم کے بارے میں بھی لکھا جاتا تھا جس کا خواجہ حسین ترجمہ کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ خواجہ حسین نے گاندھی جی کے نام جو خطوط لکھے تھے وہ 'درویش' رسالے میں ملیالم میں ترجمہ کر کے شائع کیے گئے۔ ایک اور رسالہ 'الامین' جس کو جنوری 1926 میں شائع کیا گیا تھا جس کو کے احمد اور کے ایم محمد نے کالی کٹ سے شائع کیا تھا۔ 'نصر الاسلام' کی اشاعت 1930 کی ہے یہ کیرلہ میں پہلا ہفت روزہ اخبار تھا جس میں ملیالم زبان کو عربی زبان میں نقل کیا جاتا تھا۔ اس طرح یہ عربی، ملیالم رسالہ تھا۔ اس رسالے کو بھی اردو کے شائقین بہت دلچسپی سے پڑھتے تھے۔

کالی کٹ سے 1930 میں شائع ہونے والا ایک ہفت وار رسالہ 'البیان' جس کے ایڈیٹر اور مالک محمد مولوی صاحب تھے۔ 'پاوَراواشکتی' (1938)، المنار (1952)، مالاباری (1952)، چنداکم (1953) بھی ہفتہ وار اخبار تھے۔ اس کے بعد پتھانم عبداللہ دو سال تک چنداکم رسالہ شائع کرتے رہے۔ اور اس مدت میں انھوں نے بطور ایڈیٹر اردو کی یادگار خدمات انجام دیں۔

کچھی میمن برادری کے لوگ گجرات سے یہاں آئے تو وہ اردو زبان کو بھی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ انھوں نے تلچری میں ایک مدرسہ 'مقام' اور ایک مسجد بنائی اور اس جگہ سینکڑوں خاندان مل جل کر رہنے لگے تھے۔ انھوں نے مدرسہ یوسفیہ میں اردو کلاسس کا انتظام بھی کیا تھا، جو ان کے اور دکنی لوگوں کے بچوں کے لیے عام تھا اور شام کے اوقات میں ان نوجوانوں کے لیے بھی کلاسس لیے جاتے تھے جنھیں اردو زبان سیکھنے سے دلچسپی تھی۔ ان کوششوں کی بنا پر لوگوں میں ایک ماہنامہ رسالہ نکالنے کا خیال پیدا ہوا۔ چند معزز لوگوں نے، جن میں عبدالستار سیٹھ، صابر سیٹھ، عبدالکریم سیٹھ اختر، داؤد سیٹھ، طاہر محمود، موسیٰ سیٹھ شامل تھے، یوسفیہ مدرسہ میں جمع ہو کے فیصلہ لیا اور یہ عزم کیا کہ ایک اردو ماہنامہ شائع کریں گے، جس کے لیے دکنی لوگوں کی بھی انھیں حمایت حاصل تھی۔ انجمن اصلاح البیان سے وابستہ لوگوں اور اردو کے شائقین نے، انجمن ترقی اردو جیسے اداروں کے ساتھ مل کر رسالہ 'نارجیلستان' کی ابتدا کی۔ ستمبر 1937 میں اس کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ اس کے ایڈیٹر سید ہارون ندوی اور اس کے مالک وسرپرست عبدالکریم سیٹھ، اختر تھے۔ یہ رسالہ حقانی پریس مدراس میں طبع کرا کے شائع کیا گیا تھا۔ اس کے منیجر اصغر حسین تھے۔ وائے افسوس کہ اردو کا یہ مبارک سفر حالات کی ستم ظریفی کی نذر ہو گیا۔ یہ تحریک آزادی کے عروج کا زمانہ تھا، جب شمالی ہند میں فرقہ وارانہ فسادات بھڑک اٹھے تھے۔ ان حالات میں میمن برادری کے لوگ نقل مکانی کر کے مختلف مقامات جیسے کراچی، بمبئی، میسور اور دوسرے پرامن مقامات پر منتقل ہو گئے۔ 'نارجیلستان' کی مدت اشاعت چھ سال رہی۔ اس قلیل مدت میں بھی مقامی لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا جن مقامی لوگوں کی نگارشات 'نارجیلستان' میں شائع کی جاتی تھیں، ان میں ابوبکر منشی فاضل، اختر، صابر سیٹھ، محترمہ عائشہ بائی، ایس ایم سرور، موسیٰ ناصح شامل ہیں۔ جن مشہور اہل قلم کی نگارشات 'نارجیلستان' کے صفحات کی زینت بنیں، ان میں خاں ہاین محمود، علی خاں، سلیم ہزاروی، محمد اسحاق، یعقوب، مولانا علی اختر حیدرآبادی، معین صدیقی عثمان پوری، حضرت مولوی صدیقی، مولانا جعفر علی خاں، مولانا مسیح نقوی لاہوری، سیماب اکبرآبادی، سید دلدار علی، ابوکر ہاشم قطب بنگلوری وغیرہ شامل ہیں۔

رسالہ کی وجہ تسمیہ

جب مولانا ظفر علی خاں ناریل کے دیس، کیرلا تشریف لائے تو یہاں کی دلکشی اور ہریالی سے بے حد متاثر ہوئے۔ کیرلہ کی سرزمین وہ سرزمین تھی جس کو لوگ بجا طور پر 'خدا کی سرزمین' کہا کرتے تھے۔ اس موقعے پر انھوں نے کیرلہ کو خطاب کرتے ہوئے ایک نظم لکھی تھی جو 'نارجیلستان' کے عنوان سے چھپی تھی۔ جب اردو ماہنامہ کے عنوان کا سوال اٹھا تو سیماب اکبرآبادی نے اس کے لیے نارجیلستان ہی تجویز کیا تھا جس کو اختر صاحب نے بھی تسلیم کر لیا۔ اس طرح یہ رسالہ اردو دنیا میں کافی مشہور

و مقبول ہوا۔

چندریکا

انیسویں صدی کی ابتدا میں کیرلہ میں بہت سے نئے اخبارات و رسائل نکلنا شروع ہوئے تھے۔ جو لوگوں کے مختلف مسائل کو زیر بحث لایا کرتے تھے۔ اس وقت انڈین یونین مسلم لیگ کے لیڈروں (جن میں حاجی عبدالستار سیٹھ، سلطان آدی راجا، عبدالرحمٰن چھیر مین، ممو کیئی، کنی مایم، حاجی کے ایم سیتھی اور او پی صاحب وغیرہ شامل تھے) نے مل کر ایک متفقہ فیصلہ کیا کہ ایک پریس اور ایک اخبار مسلمانوں کے لیے شروع کیا جانا چاہیے جو انڈین یونین مسلم لیگ کا ترجمان بھی ہو۔ اس خیال کو جب مسلم کلب (جو اس وقت مسلمانوں کے معزز اور بارسوخ اشخاص پر مشتمل تھا) کے ممبروں کے روبرو پیش کیا گیا تو مسلم لیگ اور مسلم کلب کے ممبروں نے ایک متفقہ میٹنگ حاجی علی مسجد میں منعقد کی اور یہ تاریخی فیصلہ لیا کہ 'چندریکا' نام سے ایک اخبار کی ابدا کی جائے۔ مسلم لیگ کے لیڈروں کے علاوہ کئی اہم شخصیات جیسے جسٹس کن حامد کٹی، کلیم اللہ، کے ایم مولوی اور اے کے مولوی بھی اس میٹنگ میں شریک تھے۔

وہ 26 مارچ 1934 کا دن تھا جس دن 'چندریکا' کی اشاعت تلچری میں شروع ہوئی۔ پہلے یہ اخبار ہفت روزہ تھا۔ 1938 میں اسے روزنامہ کر دیا گیا۔ 1946 میں اس کا پریس تلچری سے کالی کٹ منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت ملیالم زبان کے کئی ہفتہ وار اور ماہنامے اور روزنامے نکلتے تھے۔ الامین اور اس طرح کے دوسرے دیگر ادارے ارو و زبان کو فروغ دینے کے لیے سرگرم عمل تھے۔ لیکن 'چندریکا' ان میں سب سے پیش پیش تھا۔ یہ سبقت اس نے پچھلے پچھتر (75) سال سے اب تک بنائے رکھی ہے۔ چندریکا کے روزنامے، ویکلی اور سپلیمنٹ ویکلی نے اپنی فراخدلانہ کوششوں سے اقلیتی زبانوں (عربی، اردو، سنسکرت) کو ترقی کی شاہ راہ پر گامزن کر دیا۔

چندریکا نے اردو سیکھنے والوں کے لیے ایک علیحدہ کالم ہی وقف کر دیا تھا تا کہ اردو زبان سیکھنے کے خواہش مند لوگ خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں۔ کئی مترجم حضرات اردو کی شاعری، کہانیاں، اور مضامین اردو سے ملیالم میں ترجمہ کر کے 'چندریکا' میں شائع کراتے تھے۔ اس طرح انھوں نے علامہ اقبال، سرسید احمد خاں، جوش ملیح آبادی، میر تقی میر اور مرزا غالب، شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور محمد سرور جیسے اردو کے مشہور ادبا و شعرا اور دانشوروں کو غیر اردو داں لوگوں سے متعارف کرایا۔

ٹی محمد چندریکا کے پہلے ایڈیٹر تھے۔ وہ خود ایک معروف اردو داں تھے۔ چندریکا میں مستقل طور پر لکھنے والوں میں عبدالقیوم، ابوبکر منشی فاضل، کے ایم مولوی، سید محی الدین شاہ، وکوم عبدالقادر مولوی، پروفیسر شاکر، ایس ایم سرور، پی وی محمد، الپوزہ سلیمان، کڈن گاڈی ابراہیم مولوی، فضل اللہ چیرو تھی، کے ایس کومکٹی مولوی، مولانا کنّی احمد حاجی، سی این احمد مولوی، پی ابوبکر مولوی نظامی، وی ٹی احمد کٹی، والا پٹنم عبداللہ، پی عبدالقادر مولوی، سی این آر، حنیفہ مولوی، سی حمزہ، محترمہ کوچی اومابائی، کے ٹی سی ویران، پاکر کڈ النڈی، ای احمد، وی اے عبدالکبیر، اوٹا مالیکا، ایس ماین، ایم این سیتہ آرتھی، ایم محمد، کے کے محمد عبدالکریم، یو اے بیرن، اے پی آئی صادق، جیسی اہم شخصیتیں شامل تھیں جن میں کئی مترجم بھی تھے۔

چالیس اور پچاس کی دہائیوں میں چندریکا میں اردو سیکھنے والوں کے لیے ایک کالم کی ابتدا کی گئی تھی۔

آزادی کی جدوجہد کے دوران بھی 'چندریکا' نے اپنا اہم رول ادا کیا تھا۔ اس میں تحریک آزادی کی جدوجہد کو تقویت پہنچانے والے افسانے، مضامین اور تقاریر اردو سے ملیالم میں ترجمہ کر کے شائع کیے گئے۔ ادبی میدان میں اردو اور فارسی کے مشہور شعرا کے کلام کا ملیالم میں ترجمہ شائع کیا جاتا تھا۔ چنانچہ مرزا غالب، ڈاکٹر اقبال، مولانا آزاد، فیض احمد فیض، حافظ شیرازی، پریم چند، کرشن چندر کی تخلیقات، قصہ چہار درویش، حضرت شیخ سعدی شیرازی کے گلستان و بوستان، مثنوی بدر منیر و حسن جمال، نور جہاں، ڈرامہ انارکلی، جنگ بدر، کربلا کے واقعات، ہارون رشید کی کہانیاں، علی بابا چالیس چور کے ترجمے چندریکا کے صفحات کی زینت بن چکے ہیں۔ چندریکا کا اردو زبان و ادب کو کیرلہ کے لوگوں سے متعارف کرانے کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

ملباری آواز

جب عبدالکریم سیٹھ اختر کی ادارت میں شائع ہونے والے 'نار جیلستان' اور انجمن اصلاح العیسان تلچری سے شائع ہونے والے 'چمن' کی اشاعت بند ہو گئی تو اردو داں حضرات بہت مایوس اور بددل ہو گئے۔ اطراف و اکناف سے یہ صدا بلند ہونے لگی اور تقاضے ہونے لگے کہ اردو کا کوئی پندرہ روزہ یا ماہنامہ اخبار ہونا ضروری ہے۔ پھر بھی کسی شخص یا ادارے نے اس جانب توجہ نہ دی۔ اردو کے سچے خیر خواہ، کچھ میمن برادری کے لوگ شہر سے نقل مکانی کر کے مختلف مقامات پر جا چکے تھے۔ تلچری کی فضا میں ناامیدی کے گھنے بادل چھائے ہوئے تھے اور کوئی ڈھارس بندھانے والا نہ تھا۔ ان حالات میں جس دلیر فرد نے پیش قدمی کی وہ تھے اردو پرچار سمیتی کنھا منگلم کے کے ٹی سی ویران نے ایک پندرہ روزہ اخبار، خطاطی سے سہی، نکالنے کا فیصلہ لیا۔ ہمت مرداں مدد خدا کے مصداق خطاطوں کی مدد بھی انھیں حاصل ہوئی۔ ان کا نصب العین اہل اردو کی ہمت افزائی کے علاوہ ان بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنا بھی تھا جو خطاطی کا کورس پاس کیے ہوئے تھے اور بے روزگار تھے۔ یہ کورس مرکزی حکومت کی وزارت ایچ آر ڈی (HRD) نئی دہلی کے ماتحت چلنے والے معروف ادارے NCPUL نے چلائے تھے۔

اس خبر سے اردو کے چاہنے والوں میں خوشی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اس اقدام کا پرزور خیر مقدم کیا گیا۔ ہر طرف سے مالی امداد، زر خریداری کے آفر (offer) آنے لگے۔ جو پرچار سمیتی کے لیے کافی حوصلہ افزا تھے۔ KTC ویران کے لیے امداد کا دریا امڈ آیا۔ تقریباً دو ہزار اڈوانس خریدار اس کے لیے آگے بڑھے۔ جو کیرلہ کے علاوہ باہر کی ریاستوں سے بھی تھے۔ اردو کے اہل قلم سے جو درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنے مضامین اور شاعری اشاعت کے لیے روانہ کریں اس کا اچھا ردعمل دیکھنے کو ملا۔

پرچار سمیتی نے اس رسالے کا نام 'ملباری آواز' تجویز کیا۔ ابتدا میں یہ رسالہ پندرہ روزہ تھا۔ جو بعد میں ویکلی کر دیا گیا۔ ملباری آواز کی اشاعت 1990 میں ہوئی تھی جس کے صرف بارہ صفحے ہوا کرتے تھے جن میں مذہبی امور، ادبی مضامین، سماجی اور سیاسی مسائل، اردو اساتذہ کے مسائل گورنمنٹ اور یونیورسٹی کی خبریں، اردو طلبا اور اساتذہ کے مسائل کو اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ سارے مضامین پندرہ روزہ میں شائع ہونے لگے۔ اردو اسکولوں میں اساتذہ طلبا کو ملباری آواز کو خرید کر پڑھنے کی صلاح دیا کرتے تھے۔ اس کے اشتہارات اکثر اردو میں ہوتے تھے۔ مگر وائے افسوس چھ سال بعد وہی ہوا جو اکثر اردو اخبارات کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ پرچار سمیتی نے اخبار کی اشاعت روک دی۔ انھیں مالی مشکلات نے آن گھیرا تھا۔ اور پھر 'ملباری آواز' نے بھی ہمیشہ کے لیے خاموشی اختیار کر لی۔

■

Prof. R.I. Riyaz Ahmaed, Shahida Quarters, O.V. Road, Tellicherry - 670101 (Kerala)

سیدہ عصمت جہاں

مہدی نظمی: شخصیت اور شاعری

مہدی نظمی اردو ادب کی ایک ناقابل فراموش کثیرالجہات، شخصیت کا نام ہے۔ وہ بیک وقت ایک ادیب، شاعر، ممتاز صحافی اور خطیب کی حیثیت سے اردو ادب کی تاریخ میں اپنی ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔ مہدی نظمی 1923 میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ نام سید ابن الحسین تھا بعد میں 'مہدی نظمی' کے نام سے مشہور ہوئے۔

ابتدائی تعلیم رام پور میں ہوئی۔ 42-1941 میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی اے، کی تکمیل کی پھر لاہور چلے آئے جہاں انھوں نے مختلف فنون کی تعلیم و تربیت پائی۔ وہ مختلف صحافتی اداروں جیسے ناظم و جمہوریت ہفت روزہ ہمت، آغاز، پیام وطن، شیر پنجاب، نئی دنیا ہفت روزہ پیام مشرق، ماہنامہ آستانہ سے وابستہ رہے۔ انھوں نے دو اردو رسالے 'انیس' اور 'راہی' کے نام سے بھی نکالے، جو بعد میں معاشی بحران کا شکار ہوگئے۔ مہدی نظمی کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہوئے اس پہلو کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ انھیں خاندانی ورثے کے طور پر بڑا زبردست پس منظر ملا تھا۔ مہدی نظمی نقوی سادات تھے اور ان کا تعلق خاندان اجتہاد سے تھا۔ آپ کے والد مولانا اولاد حسین شاعر عرف للن صاحب بڑے اچھے ذاکر و خطیب تھے۔ مہدی نظمی کے دادا سید فرزند حسین ذاخر اپنے عہد کے نمائندہ ادیب و شاعر تھے اور ذاخر و عبل ہند کہلاتے تھے۔ مہدی نظمی کی والدہ رضیہ بیگم بھی صاحب تصنیف تھیں ان کی ایک تالیف 'تذکرۃ الصحابیات' بہت مشہور ہے۔

شاعری میں مہدی نظمی نے غزل، نظم، رباعی، قطعہ قصیدہ اور مرثیہ میں طبع آزمائی کی اور ہر صنف میں اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ چنانچہ نظمی خود اپنی شاعری کے بارے میں فرماتے ہیں:

''میری شاعری ایک ندی ہے جو بہتی رہتی ہے اور اس بہتی ہوئی ندی میں خس و خاشاک کا آجانا عین متوقع ہے غیر متوقع نہیں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ندی کا پانی کتنا تازہ ہے کتنا میٹھا ہے اور آدمی کی ادبی تشنگی بجھانے کے کام آتا ہے یا نہیں۔ ندی کے پانی کو بہرحال کیچڑ نہ بن جانا چاہیے۔''

'غزل غزل' مہدی نظمی کی غزلوں کا مجموعہ ہے اس میں روایتی اور جدید اسلوب دونوں کا امتزاج ہے۔ ان کی غزلوں میں نظموں کی طرح جدت اور اچھوتا پن ہے۔ احساس کی شدت اور جذبے کے نشور نے ان میں بڑی رچی ہوئی کیفیت پیدا کردی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں شعریت سے بھرپور ہیں۔ ان میں دل لبھانے والی کیفیت زیادہ ہے اور یہ دل موہ لینے والے انداز احساس نے شدت پیدا کردی ہے۔

احساس کی شدت غزل میں سوز پیدا کرتی ہے۔ لیکن نظمی نے حالات و تجربات کی تلخیوں پر اپنے حسن بیان

> 'غزل غزل' مہدی نظمی کی غزلوں کا مجموعہ ہے اس میں روایتی اور جدید اسلوب دونوں کا امتزاج ہے۔ ان کی غزلوں میں نظموں کی طرح جدت اور اچھوتا پن ہے۔ احساس کی شدت اور جذبے کے نشور نے ان میں بڑی رچی ہوئی کیفیت پیدا کردی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں شعریت سے بھرپور ہیں۔ ان میں دل لبھانے والی کیفیت زیادہ ہے اور یہ دل موہ لینے والے انداز احساس نے شدت پیدا کردی ہے۔

و دلکش طرز ادا سے اسے پرلطف و سرور آگیں بنا دیا ہے۔

زندگی کے تلخ و ترش حوادث، تجربات، ناسازگاری حالات کے باوجود ان کی غزلوں میں ایک امنگ ایک ولولہ ایک جوش ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

دنیا کے تجربوں کا سبق چھوڑ جاؤں گا
میں اپنے بعد بھی یہ ورق چھوڑ جاؤں گا
جن کو پڑھیں گے شوق سے اگلی صدی کے لوگ
ایسے بھی زندگی کے ورق چھوڑ جاؤں گا

مہدی نظمی کی شاعری میں ان کے منظوم ریڈیائی فیچرس نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ 'ساز اور آواز' مہدی نظمی کے موسیقی ریز ریڈیائی فیچرس کا مجموعہ ہے۔ مہدی نظمی نے ان فیچرس میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی تاریخ ''جغرافیائی خوبصورتی، رسوم و رواج کی تفصیلات تہذیبی و ثقافتی خوبیوں اور تیوہاروں کو بطور موضوع اختیار کرکے نہ صرف اپنے خیال کو محدود رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے بلکہ ہر موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف بھی کیا ہے۔

ساز اور آواز کے آخری فیچر 'ترانہ جمہور' میں ہندوستانی جمہوریت کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

پربت ہمالیہ کا ہے پاسباں ہمارا
سو رنگ کے گلوں کا ہے گلستاں ہمارا
مہر و وفا کا گھر ہندوستاں ہمارا
انسان دوستی ہے چلن پرانا
جمہور کا ہے نغمہ جمہور کا ترانہ

'اپنی دھرتی اپنی رُت' کے عنوان سے مہدی نظمی نے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ اس مجموعہ کو جدید بارہ ماسہ کی ایک شکل کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا اس میں مہدی نظمی نے تقریباً تمام موسموں کے بارے میں نمائندہ شعرا کے اشعار کا انتخاب کرکے اور اپنے اشعار شامل کرکے ایک اچھا شعری سرمایہ بھی دیا ہے اور اپنی شعری جمالیات کی وضاحت بھی کردی ہے کہ شاعری صرف نقابت و خطابت نہیں بلکہ فطرت میں ڈوب جانے کا نام ہے۔

'منظر پس منظر' مہدی نظمی کے قطعات کا مجموعہ ہے۔ اردو ادب میں قطعہ نگاری کی تیسری روایت اقبال جگت موہن لال رواں، شبلی، جوش، امجد حیدرآبادی سے ہوتی ہوئی مہدی نظمی تک پہنچی ہے۔ اسی روایت کی انھوں نے نہ صرف پاسداری کی بلکہ اسے آگے بھی بڑھایا اور بلاشبہ اردو ادب کی قطعہ نگاری کی تاریخ میں مہدی نظمی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ایک قطعہ میں اپنی شاعری کا تعارف اس طرح کراتے ہیں:

انیس و حالی و غالب سے واسطہ ہے مجھے
دبیر سے مرا ناطہ نظیر سے رشتہ
میں جوہری ہوں جواہر چنے تو ہیں لیکن

ہر اک نگیں سے جدا ہے اک نگینہ مرا

اردو تنقید نگاری سے بے زاری کا اظہار یوں کر رہے ہیں:

ارباب تعلق کے سبب شعر و سخن کی
ڈولی میں خوشامد کی نکلتی ہے سواری
کچھ ترجمے کچھ روسی ادیبوں کے حوالے
آسان ہے اس دور میں تنقید نگاری

ایک قطعہ میں قلم کی تجارت پر یوں طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اب بھی بازار میں بکتا ہے منصب کا نصیب
ردی کاغذ کی طرح ٹن کی کترن کی طرح
اے قلم والو بجھا دو یہ سلگتے حالات
جن میں فن کار جلا کرتے ہیں ایندھن کی طرح

یہ قطعہ ملاحظہ ہو۔ یہاں شدت احساس بے حد اچھوتی تشبیہ کے ساتھ ابھر کر آتا ہے:

احساس کو دکھاتی ہے تنہائیوں کی شب
کٹتی ہے رات جیسے جولانیوں کا وقت
یوں ہر گھڑی گزرتی ہے میری عمر کی
جیسے کہ قیدیوں سے ملاقاتیوں کا وقت

'ہندوستان ارم نظر' مہدی نظمی کی نظموں کا مجموعہ ہے جو ان کی وطن پرستی وسماجی شاعری کا اہم ترین نمونہ ہے۔ 'ارض وطن' جو اس مجموعے کی پہلی نظم ہے اس سے شاعر کی حب الوطنی کی عکاسی ہوتی ہے:

ہندوستان کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا
دھرتی پہ یہ وطن ہے جنت نشاں ہمارا
سور و کبیر و تلسی میر و انیس و غالب
ہر خسرو سخن ہے شیریں میاں ہمارا
گلشن کے ہیں نگہباں ہندو ہوں یا مسلماں
سب کا وطن ہے یکساں ہندوستاں ہمارا

ایک اور نظم 'وقت کی پکار' میں کہتے ہیں:

یہ حسن نظارہ تو کہیں اور نہیں ہے
سچ ہے کہ سر خاک یہ فردوس بریں ہے

مہدی نظمی نے بلاشبہ قصائد میں ایک نئے رجحان کو آگے بڑھایا جس میں ماضی کی روایات سے انحراف نہیں تھا بلکہ ماضی کی روایات کی توسیع تھی۔ مہدی نظمی اس صنف میں موجد ومفکر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قصائد میں جو ندرت اور جدت کو انھوں نے مقام دیا وہ جدید ادب میں اضافہ ہے۔ قصیدے کی مستقل روش میں انھوں نے ایک استحکام اور نیا پن شامل کیا ہے انھوں نے صنف قصیدہ کی حد بندیوں کو وسعتوں سے روشناس کیا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ ایک ہی لفظ کی تکرار سے وہ حسن پیدا کرتے ہیں، جو زبان پر قدرت کاملہ کا ایک ثبوت ہے، صحیفہ عقیدت کا پہلا قصیدہ ملاحظہ ہو:

امیر کائنات رب ضمیر مرسل عرب علیؑ علیؑ علیؑ علیؑ
فروغ علم کا سبب، امام حکمت و ادب علیؑ علیؑ علیؑ علیؑ
ولی مصطفیٰ لقب رضی، مرتضیٰ لقب علیؑ علیؑ علیؑ علیؑ
رہے یہ نام ورد لب، تمام عمر روز و شب علیؑ علیؑ علیؑ علیؑ

بارہ بند میں یہی تکرار ہے۔ علیؑ علیؑ ردیف ہے اس کی تکرار سے ایک خطیبانہ آہنگ کا اندازہ ہوتا ہے۔ قصیدے میں آہنگ پیدا کرنے کے لیے تکرار قافیہ کی تکنیک، دوسرے لفظوں کی تکرار یعنی ردیف کی تکرار، یہ مہدی نظمی کی خاص تکنیک ہے جس کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو: لفظ 'یہاں' بیس بار استعمال کیا گیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہو:

یہاں آئے خرد والے تو سمجھے حکمت دنیا
یہاں اہل قلم بیٹھے تو انداز رقم آیا
یہاں سازندگان بزم عرفان و طریقت کو
کمال نغمہ سنجی و شعور زیر و بم آیا
یہاں ساز لب زخم جگر سے زمزمے پھوٹے
یہاں نظر عکس رخ زہرہ نغم آیا
یہاں زخمہ زن تار رباب کن کے نغمے سے
لب فریاد میں سوز اذان صبح دم آیا
یہاں نہج بلاغت سیکھ کر اہل سخن اٹھے
یہاں ارباب حکمت کو بیان کیف و کم آیا

اسی قصیدے میں لفظ 'جنوں' چودہ اور 'وفا' اٹھارہ مرتبہ استعمال کیا گیا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

جنوں کے دیدہ حیراں میں جب عکس صنم آیا
دل آوارۂ دشت تمنا تا حرم آیا
جنوں میں چاک دامانی سے رسوائی نہیں ہوتی
کہ تخت مصر پر اک چاک داماں کا قدم آیا
جنوں گزرا در زندان و چاہ دشت کنعاں سے
جنوں بالائے دار و بیش پیکان ستم آیا
وفا کے ہاتھ پر اتری فلک سے عدل کی شمشیر
وفا کے ہاتھ میں دست پیمبرؐ کا علم آیا
وفا کے در پہ آیا سر بہ سجدہ نجم زہرہ بھی
وفا کے آستانے پر ملک بھی سر بہ خم آیا
وفا کرار ہے خیبر شکن ہے کل ایماں ہے
وفا کے دم قدم کے دین کی دعوت میں دم آیا

مندرجہ بالا الفاظ سے مصرعہ کا آغاز ہوتا ہے اور لفظ کی تکرار ابتدا میں ہے، یہ بھی مہدی نظمی کی خاص تکنیک ہے جو ہمیں متقدمین کے یہاں نہیں ملتی۔

مہدی نظمی اردو مرثیہ نگاری میں بھی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں اور 'انیس العصر' کے لقب سے جانے جاتے ہیں۔ 'مظلوم کربلا' ان کے مراثی کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں نو مرثیے ہیں پہلا مرثیہ حضرت امام عالی مقام کی مدینہ سے رخصت کے واقعات پر مشتمل ہے۔ مطلع ہے:

یثرب سے جگر بند پیمبرؐ کا سفر ہے

اس مرثیے کے بہت سارے بند بے حد معروف ہیں۔ یہاں ایک بند ملاحظہ ہو:

کہہ کر یہ سخن بیٹھ گئے سید خوش خو
اور سورۃ الحمد پڑھا تمام کے بازو
بیمار نے پائی گل زہرا کی جو خوشبو
آنکھوں کو تو کھولا پہ ٹپکنے لگے آنسو
ماں نے کہا مجھ میں جو حواس آئے ہیں اماں
کیا میرے مسیحا میرے پاس آئے ہیں اماں

ایک مرثیے میں جناب عباسؑ کے دریا میں گھوڑا ڈالنے کا بیان ہے۔ یہ بیان بے اختیار میر انیس کی یاد دلاتا ہے۔ بند ملاحظہ ہو:

ساحل متاع دیدہ تر دیکھتا رہا
ضبط عطش وفا کا اثر دیکھتا رہا
مرکب بھی منہ پھرا کے نظر دیکھتا رہا
حیرت سے روئے تشنہ جگر دیکھتا رہا
دریا سے منہ کو پھیر کے یاد امام میں
اک ڈھیل دی جری نے فرس کی لجام میں

چونکہ انیس کی روایات کا بار امانت مہدی نظمی نے ہی اٹھایا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جب بھی تاریخ مرثیہ گوئی کا ذکر ہوگا تو مہدی نظمی کا تذکرہ ضرور ہوگا۔ انھوں نے قدیم و جدید کا نیا امتزاج پیش کیا ہے۔ مرثیے کے اجزائے ترکیبی اور انیس کے رنگ میں جوش کا آہنگ شامل کر کے اسے ایک نیا رخ دینا مہدی نظمی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

غرض اردو ادب کی یہ نابغۂ روزگار ہستی 1987 میں ہم سے یہ کہتے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی کہ:

ساحل پہ سمندر سے صدف کیوں نہیں آتے
اب دوست مرے گھر کی طرف کیوں نہیں آتے
میری تربت پہ میرے دوست نہ آئیں ورنہ
قبر کو دیکھ کے احساس ندامت ہوگا

■

Dr. Syeda Asmath Jahan Assistant Professor, Dept. of Persian Maulana Azad National Urdu University, Gachibowli, Hyderabad - 32 (A.P)

عزیزہ بانو

نوح ناروی حیات و شعری کائنات
ایک اجمالی جائزہ

1857 میں ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں جس کو غدر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ہندوستانیوں کی ناکامی نے ایک نئے عہد کا آغاز کیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس غدر میں ہندوستانی مسلمانوں کو زیادہ نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے مسلمانوں میں تعلیم کی روشنی پھیلانے اور ان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ قدیم و جدید کے امتزاج سے نہ صرف ایک نئے معاشرے کی بنیاد پڑی بلکہ اردو کے شعری ونثری سرمائے میں گراں قدر اضافے کے ساتھ ساتھ یہ سرمایہ نئے عہد کے نئے تقاضوں سے ہمکنار ہوا۔

ہندوستان کی ایسی بدلی ہوئی فضا اور ماحول میں یکم شوال بروز عید 1296ھ مطابق 18 ستمبر 1879 موافق 18 کنوار سمبت 1926 بکرمی یومِ جمعہ صبح صادق کے وقت قصبہ بھوانی پور تحصیل سلون ضلع رائے بریلی کے ایک زمیندار گھرانے میں نوح کی ولادت ہوئی۔ ان کا اصل نام محمد نوح تھا۔ محمد نوح دنیائے شعر و شاعری میں نوح ناروی کے نام سے مشہور ہوئے۔

دادا ابوالحسن عبادت گذار اور شریف النفس انسان تھے۔ والد شیخ عبدالمجید بھی نہایت خوش اخلاق، نیک طبیعت، منکسر المزاجی کے ساتھ ساتھ متین زندہ دل ذہین اور قابل انسان تھے۔ نوح اپنے والدین کی اکلوتی اولادِ نرینہ تھے۔ والد کی وفات کے بعد خاندانی تنازعات کا اثر نوح کے عہدِ طفلی، پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت پر بھی پڑا۔ لیکن تمام دشواریوں کے باوجود ان کی والدہ نے اپنے بیٹے کی پرورش میں کوئی کمی نہیں آنے دی اور ان کو وہ سب کچھ دیا جس کا عہدِ طفلی متقاضی تھا۔

تعلیم کی ابتدا درسِ قرآن سے ہوئی۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم مولوی محمد یوسف سے حاصل کی۔ حاجی عبدالرحمٰن سے فارسی، ادب و اخلاق کی تعلیم اور فارسی کے استادِ کامل میر نجف علی سے فارسی اور فلسفہ واخلاق کی تعلیم حاصل کی، جنھوں نے نوح کی شاعرانہ صلاحیتوں کو بھی بیدار کیا۔

نوح کی شادی قصبہ نگیامئی کے ایک شریف گھرانے میں منشی حبیب الحق کی صاحبزادی سے ہوئی۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی کی نعمت سے اللہ نے انھیں نوازا۔ لیکن دونوں بیٹے کم عمری میں ہی انھیں داغِ مفارقت دے گئے۔ بیٹوں کی وفات کا انھیں عمر بھر قلق رہا۔ ان کی اہلیہ یہ صدمہ برداشت نہ کرسکیں اور جلد ہی اس دارِ فانی کو الوداع کہہ گئیں۔ چھوٹے بیٹے خضر کی وفات پر انھوں نے یہ مقطع کہا تھا:

یہ قسمت کے کرشمے ہیں یہ خوبی ہے مقدر کی
خضر اُٹھ جائیں دنیا سے رہیں اے نوح ہم بیٹھے

معتبر لوگوں کے ہاتھوں زمینداری کی تباہ حالی کے بعد جب نوح نے زمینداری کی ذمے داری سنبھالی تو انھیں زبردست جانفشانی کرنی پڑی۔ اس کا ذکر ان کے کلام میں بھی ملتا ہے:

کوئی بھی برے وقت کا ساتھی نہیں ہوتا
اللہ مجھے برا وقت اب نہ دکھائے

اور پھر آزادی کے بعد زمینداری کے خاتمے تک بلاشبہ وہ عیش و آرام کی زندگی گذارتے رہے۔

نوح نے جس جاگیردارانہ ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس میں بازارِ حسن کی سیر کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب طوائف معاشرہ میں کہیں رقاصہ کہیں داشتہ اور کہیں مغنیہ کی شکل میں اپنا سکہ جمائے ہوئے تھی۔ نوح بھی اس سے بچ نہ سکے۔ دیوان سوم اعجاز نوح کے سوانحی حصے میں صاف لفظوں میں حسن پرستی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حسن کسی کا ہو لیکن ایسی چیز ہے جس کا اثر تھوڑا بہت ہر شخص کے دل پر ہوتا ہے۔ میرے خیال میں وہ حسن ہی نہیں جس میں قدرتی جاذبیت نہ ہو شاعر کے لیے اس سے متاثر ہونا یقینی اور لازمی ہے۔ چنانچہ یہ بھی (نوح) اس سے اکثر متاثر ہوئے اور بہت ہوئے۔ مگر جوانی دیوانی کے زمانے میں بھی انھوں نے ہمیشہ تحفظ مراتب و اعزاز ریاست کا خیال رکھا جو کچھ کیا وہ اسی اعتدال کے ساتھ کیا کہ کوئی خراب نتیجہ یا بار جائداد وغیرہ پر نہ پڑے اور نہ کسی حاسد یا بداندیش کو سننے کا موقع ملے۔'' (اعجاز نوح ص 64)

شاہد پرستی کے متعلق کلام میں اشعار بھی ملتے ہیں مثال کے لیے یہ شعر ملاحظہ ہو:

رہنے بھی دو چلو مجھے معلوم ہوگیا
جو گھر سے فالتو ہو وہ تم سے لگائے دل

نوح کو عشق میں ناکامی کا بھی سامنا کرنا پڑا:

اثر ہو کیوں نہ ہمارے کلام میں اے نوح
کہ ہم ہیں عشق و محبت کی چوٹ کھائے ہوئے

نوح لذتِ عشق سے آشنا تھے۔ جہاں وصال کی طمانیت نہیں بلکہ انتظار کا اضطراب تھا:

ملتا رہا سکوں کا مزہ اضطراب میں
یادش بخیر وقت جو گذرا شباب میں

مجموعی طور پر نوح دل آویز شخصیت کے مالک تھے۔ وسیع القلب روادار اور پختہ حنفی عقیدے کے مسلمان تھے۔ دوسرے مذاہب اور اس کے ماننے والوں کے جذبات کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔ حضرت سید شاہ مولانا وارث حسین کوڑہ جہاں آبادی کے دستِ مبارک پر بیعت بھی کی تھی۔ بحیثیت زمیندار رعیت کے ساتھ فراخدلانہ

رویہ تھا۔ پیغمبر اسلام سے تو والہانہ محبت تھی ہی خلفائے راشدین اور امام حسینؓ و حسنؓ سے بھی گہری عقیدت تھی۔ وقتاً فوقتاً صوفیاء کرام اور بزرگان دین کی مزاروں پر بھی حاضری دیتے۔

یوں تو شعر وشاعری ان کا محبوب و مرغوب مشغلہ تھا لیکن بچپن میں کرکٹ اور جوانی میں شکار ان کے مرغوب مشاغل میں سے تھے اور ہمیشہ پوری سرگرمی کے ساتھ قائم رہے۔ گھوڑے کی سواری، کبوتر پالنے اور اڑانے کا بھی بہت شوق تھا۔

نوح نے کافی طویل عمر پائی تقریباً پوری زندگی خوشحالی میں گذری۔ شعری و ادبی خدمات کے پیش نظر حکومت ہند اور حکومت اتر پردیش کی جانب سے انہیں وظیفہ بھی دیا گیا۔ نوح کی وفات 10 اکتوبر 1962 کو نارا میں 83 سال کی عمر میں ہوئی اور اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ نوح کا انتقال نہ صرف ایک فرد بلکہ ایک تہذیب اور ایک انجمن کا انتقال تھا۔ یہ ایک تہذیبی حادثہ تھا۔ نیاز فتح پوری نے 1941 میں لکھا تھا:

''زبان کی صفائی اور محاورات کا برمحل استعمال ان کی (نوح) وہ خصوصیت ہے جسے شاید انہیں کے ساتھ ختم ہو جانا ہے۔'' (بحوالہ نوح ناروی حیات اور شاعری از ظفر الاسلام ظفر ص 62)

بلاشبہ نوح کی وفات کے ساتھ زبان کی شاعری کے سوتے بند ہو گئے۔

نوح نے شاعری کی دنیا میں اس وقت قدم رکھا جب پورا معاشرہ قدیم وجدید کی آمیزش اور رد وقبول کے مراحل سے نبرد آزما تھا۔ سرسید اور حالی کی کوششوں سے شاعری کی قدریں اور موضوعات بدل رہے تھے۔ اس میں وسعت اور تنوع پیدا کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ اس عہد کی شاعری کے افق پر اب بھی امیر، داغ، جلال اور تسلیم کی شاعری اپنی پوری قدر و قیمت کے ساتھ چمک رہی تھی۔ لیکن نظموں کے موضوعات کے ساتھ ساتھ غزلوں کے موضوعات بھی تبدیل ہو رہے تھے۔

1911 سے 1945 تک کے 34 سالہ شعری سفر میں انھوں نے اردو ادب کو چار مجموعہ ہائے کلام دیے۔ سفینہ نوح نوح ناروی کا پہلا دیوان ہے جو 225 صفحات پر محیط ہے اس دیوان میں 464 غزلیں شامل ہیں جن میں کل اشعار کی تعداد 4176 ہے۔ یہ دیوان 1911 میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا اور بہت مقبول ہوا۔ دیوان کے آخیر میں اُس عہد کے کچھ بڑے لوگوں پر لکھی گئی تقریظیں اور تاریخیں شامل ہیں۔ دوسرا دیوان طوفانِ نوح پہلے دیوان کے شائع ہونے کے 14 برس بعد شائع ہوا۔ جہاں پہلے دیوان میں استاد داغ دہلوی کا رنگ نمایاں تھا وہیں دوسرے دیوان میں نوح ناروی کی خود اپنی قوتِ کمال ذہانت اور مشاقی کا رنگ نمایاں ہے اس دیوان میں غزلوں کے ساتھ ساتھ حمد و نعت، منقبت، سلام، قصیدے مرثیے، قومی اخلاقی ملکی تاریخیں ظرافت وغیرہ شامل ہیں۔ تیسرا دیوان اعجاز نوح 1945 میں اسرار کریمی پریس الہ آباد سے چھپ کر منظر عام پر آیا جو 327 صفحات پر محیط ہے اس مجموعے میں کل 6809، اشعار شامل ہیں۔ اس مجموعے میں بھی حمد ونعت منقبت، قصیدہ، سلام کے ساتھ غزلیں شامل ہیں۔ نوح نے اپنے دیوان میں شامل غزلوں پر تاریخ درج کر دی ہے ساتھ ہی متعدد غزلوں سے تعلق رکھنے والے مشاعروں اور مواقع کا اظہار بھی کر دیا ہے۔

بنیادی طور پر نوح غزل کے شاعر تھے۔ دیوان میں شامل بڑی تعداد میں غزلیں اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ حمد ونعت کے علاوہ جہاں منقبت، سلام، اور بزرگان دین کی شان میں اشعار ملتے ہیں وہیں دوسری جانب ان کے کلام میں قصائد، مراثی، خمسے، قطعات، مثنوی، طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات کے ساتھ خمریات پر بھی اشعار ملتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی سے قربت کی وجہ سے ان کے طنزیہ و مزاحیہ کلام میں اکبر الہ آبادی کا رنگ جھلکتا ہے قصائد میں قدما کا رنگ جبکہ مرثیے میں انیس وحالی کا رنگ نمایاں ہے۔ نوح کے دیوان سے ان کے مذہبی عقیدے کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

عقل ہو معذور جس سے قدرت اس کا نام ہے
جو سمجھ ہی میں نہ آئے وہ ہے کام اللہ کا
اعلیٰ ادنیٰ افضل اسفل جن و انساں حور و ملائک
فضل و کرم احسان و ترحم اِس پر اُس پر سب پر تیرا
(حمد)

وہ محبوب الٰہی ہیں وہ مطلوب الٰہی ہیں
کہاں ہمسر کہاں ہمتا محمد کا محمد کا (نعت)
عناصر جسم پاک مصطفےٰ کے
ابوبکر و عمر و عثمان و حیدر
(منقبت)

امام حسینؓ کی شان میں سلام کے یہ اشعار:
جا کر وہی بنا ہے شفق آسمان پر
جتنا گرا تھا خون زمیں پر حسین کا
نیزے پہ کیا چڑھا کہ چڑھا آسمان پر
یوں بھی بہت بلند رہا سر حسین کا
(سلام)

جناب غوث اعظمؒ اور خواجہ اجمیریؒ کی شان میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہمیں بھی کوئی پیمانہ جناب غوث اعظمؒ
رہے آباد میخانہ جناب غوث اعظمؒ
ہزاروں فیض پاتے ہیں ہزاروں فیض پائیں گے
کبھی کم ہو نہیں سکتی ہے دولت میرے خواجہ کی

سوز وگداز اور اثر آفرینی اچھی شاعری کے اہم عناصر میں شمار کیے جاتے ہیں۔ نوح ناروی کی شاعری کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری میں سوز وگداز اور اثر آفرینی کی کمی ہے۔ یہ بات صدفی صد درست نہیں ہے۔ جہاں انہوں نے زبان کے جوہر دکھائے ہیں وہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نوح کے پردے میں ان کے استاد بول رہے ہیں ان کے اشعار میں آتشِ محبت، جوشِ وفا اور شعلہ فشانیوں کی جلوہ سامانیاں ہیں:

ابھی بس میں زباں ہے آپ سن لیں داستاں میری
خدا جانے نظامِ زندگی کس وقت برہم ہو
یہ اگر سچ ہے کہ مجھ کو عشق کرنا آگیا
تو سمجھ لو روز میرا مرنا جینا آگیا
ربط اگر ہو آس میں تو نہ اذیت پائیں ہم
جائیں بلوائیں وہ آئیں وہ بلوائیں ہم

باطنی تجربات اور وارداتِ قلبی کا بیان نوح کی شاعری میں اس انداز میں ہوتا ہے کہ قاری ان کے احساسات و جذبات کو اپنے خیالات واحساسات سمجھنے لگتا ہے:

عیش کے بدلے ہمیشہ غم مجھے سہنا پڑا
جس طرح قسمت نے رکھا اس طرح رہنا پڑا

اپنے استاد داغ دہلوی کی طرح نوح بھی رنگینی و رعنائی اور شوخی کے جویا ہیں۔ ان کے کلام میں جابجا اس کی مثالیں موجود ہیں ملاحظہ ہو:

ہم یہ کہتے ہیں کہ ٹھہرو رات ابھی گذری نہیں
وہ یہ کہتے ہیں کہ جانے دو سویرا ہو گیا
میں کیا بتاؤں کب ہو اگر اب جفا نہ ہو
وہ مجھ سے پوچھتے ہیں جفا اب نہ ہو تو کب ہو

نوح کی شاعری میں بزم راز و نیاز کی بے تکلف گفتگو اور عاشق و معشوق کے پر اسرار مکالمے بڑے خوبصورت انداز میں نظم ہوئے ہیں۔ نوح کے یہاں اس طرح کے اشعار میں ایک خاص بے ساختگی اور عجیب طرح کی دل آویزی پائی جاتی ہے کہ قاری اور سامع اس سے لطف اندوز ہوتے جاتے ہیں اور ان کا لطف بڑھتا ہی جاتا ہے:

اب حیا پرور نگاہیں مجھ سے اٹھ کر مل چکیں
سر جھکا کر کہہ دیا اس نے کہ شرماتا ہوں میں

اے دستِ شوق دامنِ محبوب تھام لے
ٹوٹے گا سلسلہ سوال و جواب کا

نوح کا اپنا ایک خاص رنگ ہے۔ اسلوب بیان، انداز زبان طریقۂ اظہار خیالات ،طرز ادا انتخاب الفاظ اور تنظیم اشعار کے ذریعہ نوح کی شاعری کا بخوبی پتہ چل جاتا ہے کچھ ترکیبیں خاص انھیں کی اختراع ہیں اور انھیں کے حصے کی ہیں:

عشق ان سے کر کے غم سہنے کے قابل ہو گیا
پہلے دل ہی دل تھا اب دل بن گیا دل ہو گیا

شاعری کا کام سرور و انبساط عطا کرنا ہے۔ تھکے ہوئے دماغ کو راحت وسکون بہم پہچانا ہے پر شکوہ الفاظ کی بھول بھلیوں میں بھٹکانا نہیں۔نوح ناروی نے مشکل سے مشکل مطالب اور لمبے چوڑے مضامین کو نہایت ہی سہل مختصر اور روزمرہ کی بول چال کی زبان میں بہت خوبصورتی سے پیش کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلام میں محاوروں کی بندش، زبان کی فصاحت بیان کی سلاست سے ایک شگفتگی پیدا ہو گئی ہے۔ چوں کہ زبان پر انھیں قدرت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ جذبات اور پیچیدہ سے پیچیدہ خیالات کا اظہار صداقت اور صفائی سے اس طرح کرتے ہیں کہ وہ اپنی تمام تر کیفیات کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے بڑی آسانی سے آجاتے ہیں:

بحر الفت میں کیا موجوں نے عالم کو تباہ
جس طرف دریا کا رُخ تھا اس طرف بہنا پڑا

چند خوں آلودہ آنسوں جذب دامن ہو گئے
پیکرِ سادہ میں غم کو رنگ بھرنا آ گیا

مشکل اور خشک زمینوں میں اچھی اور کامیاب غزلیں کہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ چوں کہ نوح کو دلّی کی ٹکسالی زبان پر عبور حاصل تھا۔زبان و بیان پر قدرت روزمرہ کے برمحل استعمال میں نوح کو مکمل دسترس حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ایسی غزلیں بھی مل جائیں گی جس میں انھوں نے ایک مشاق خوش گو اور ایک استاد شاعر کی طرح ہی مشکل اور خشک زمینوں میں بھی ایسے گل کھلائے ہیں جن کی تر و تازگی آج بھی باقی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جدت پسند فطرت کے مالک ہونے کی وجہ سے انھوں نے خود اپنے لیے زمینیں تلاش کیں اور غزلیں کہیں۔

مختلف مضامین کو ایک ہی قافیے میں نظم کرنا آسان نہیں ہے لیکن یہاں بھی نوح نے اپنی فکر کے جوہر دکھائے ہیں۔انھوں نے ایک ہی قافیے پر پوری پوری غزلیں لکھ کر اپنی قوت فکر کا لوہا منوایا ہے:

بادۂ سر جوش کا عالم یہ مے خانے میں ہے
جس کے پیمانے میں دیکھو اس کے پیمانے میں ہے

کلام میں ایسی غزلیں بھی ملتی ہیں جن میں شروع سے آخیر تک سبھی شعر مطلع کے ہیں اور وہ بھی مشکل زمین میں۔ساتھ ہی بڑی ردیفوں میں بھی انھوں نے کامیاب طبع آزمائی کی ہے اور اس خوبی اور خوبصورتی سے بات رکھی ہے کہ بے اختیار زبان سے داد نکل ہی جاتی ہے:

یہ میں تسلیم کرتا ہوں تمھیں مجھ سے عداوت ہے
مگر اتنا سمجھ رکھو محبت پھر محبت ہے

اپنے اپنے رنگ میں یکتا میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے
حسن کی مورت عشق کا پتلا میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے

نوح ناروی کا اپنا ایک خاص رنگ ہے۔ یہ رنگ نشاطیہ ہے۔نوح اپنے رنگ میں تو کامل ہیں ہی انھوں نے اپنے رنگ سے ہٹ کر بھی کامیاب شاعری کی ہے۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر رنگ میں شعر کہنے پر انھیں قدرت حاصل تھی اور سب طرح کے اشعار ان کے قلم سے نکل سکتے تھے۔

چونکہ ابتدا سے ہی نوح نے اپنے استاد داغ دہلوی کا رنگِ سخن اپنایا ہے اسی لیے ان کی شاعری پر داغ کا اثر بہت نمایاں ہے۔زبان کی صفائی، بندش کی چستی، برمحل اور صحیح لفظوں اور محاورات کے ساتھ خوبصورت فصیح اور آسان لفظوں کا استعمال نوح کی شاعری کا خاصہ ہے۔ لفظوں کے انتخاب کا معیار بھی بہت بلند ہے۔ زبان سادہ، آسان اور عام فہم ہونے کے باوجود عوامی نہیں ہے۔کلام نوح سے تغزل کا یہ خوبصورت شعر ملاحظہ ہو:

بڑی سیدھی نگاہ سرگیں معلوم ہوتی ہے
یہ ظالم ہے مگر ظالم نہیں معلوم ہوتی ہے

محاورے کا برمحل استعمال اور شاعرانہ انداز بیان کے ساتھ ساتھ داغ کے رنگ کا بانکپن بھی ملاحظہ ہو:

چھوڑ کر طرزِ تغافل تیغ لے خنجر اٹھا
تو نہ مجھ سے ہاتھ اٹھا تو ہاتھ اب مجھ پر اُٹھا

اس شعر کی شوخی بھی ملاحظہ ہو:

غنچۂ آرزو ہے کھلنے پر
مسکرائے جا مسکرائے جا

سلاست کے ساتھ معنی آفرینی کا کمال بھی ذیل کے شعر سے واضح ہے:

تری تند خوئی تری کینہ جوئی، تری کج ادائی تری بے وفائی
بلا ہے ستم ہے غضب ہے قیامت دہائی دہائی دہائی دہائی

زور بیان روانی مصوری اور فطرت نگاری کا بہترین نمونہ یہ ایک ہی شعر میں نوح کے کلام سے ملاحظہ ہو:

دمِ نظارۂ مے خانہ یہ معلوم ہوتا ہے
سمٹ کر بوتلوں میں ساری دنیا کی بہار آئی

تخلص کی رعایت سے نوح ناروی نے بہت عمدہ کام لیا ہے۔ اردو کی شعری روایت میں مومن کے علاوہ دوسرے شاعروں میں یہ خصوصیت بہت کم ملتی ہے۔تخلص کی رعایت رکھتے ہوئے وہ کس خوبی سے مضمون نظم کر جاتے ہیں ملاحظہ ہو:

حضرتِ نوح آپ کا طوفان
فتنہ حشر کے مطابق ہے

اے نوح اثر اتنا تو کیا تم پر بھی چمن کے منظر نے
طوفان اٹھانا بھول گئے لے بیٹھے فسانہ پھولوں کا

نوح ناروی نے الفاظ کے الٹ پھیر اور خفیف رد و بدل سے مضامین پیدا کر کے شاعری کے تمام لوازمات اور قیود کے ساتھ رنگِ تغزل کو قائم رکھا ہے۔

نوح کے یہاں کہیں میر تقی میر کی جھلک ہے تو کہیں نظیر کا رنگِ سخن کہیں علامہ اقبال کا رنگ و آہنگ اور کہیں ریاض خیر آبادی کا اس ملے جلے رنگ کا اندازہ ان اشعار کے ذریعہ ملاحظہ ہو:

آج آمد چمن میں ہے کس کی
کھل گئی ٹک سے آنکھ نرگس کی

مفلس ہو یا تونگر آئے گی موت سب کو
نیچے زمیں کے ہوں گے اونچے مکان والے

سرحدِ حسن سے نکل حلقۂ عشق اثر میں آ
دل کی نظر کو دیکھ کر دل میں سما نظر میں آ

جام و صبو کا ذکر بہتا پھرے خود میکدہ
اے ابر رحمت ٹوٹ کر ایسا برس اتنا برس

نوح ناروی کی یہ شعری کائنات اردو کے قدیم غزل گو شعرا میں انھیں ایک اہم مقام دلاتی ہے۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ اردو زبان و ادب کی جو گراں قدر خدمت انجام دی ہے اسے ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔نوح شعرائے متاخرین کے اس سلسلے کی آخری کڑی تھے جس کے حلقے امیر ،جلال اور داغ کی تصادیر سے مزین ہیں۔

■

Dr. Aziza Bano, 416/719, Sultanpur Bhawa, Allahabad (U.P)

نوح ناروی

انتخاب کلام نوح ناروی

حسنِ غارت گر کو مطلب میرے یارانے سے کیا
شوق ہے دیوانگی سے ذوق دیوانے سے کیا

اڑ چلا آوارۂ وحشت بھی مثل رنگ و بو
کہہ دیا پھولوں نے کھِل کر تیرے دیوانے سے کیا

ہم ترے اغماض پر دل کو مخاطب کیا کریں
ایک بے گانے کا شکوہ ایک بے گانے سے کیا

دل کے ہوتے میں بتاؤں اور کس کو راز دار
کام جب نکلے یگانے سے تو بے گانے سے کیا

بے طرح نکھرا نظر آنے لگا رنگِ چمن
مے چھلک کر گر پڑی کچھ میرے پیمانے سے کیا

اللہ اللہ یہ شراب تند کا جوش و خروش
توڑ کر خم کو نکل جائے گی مے خانے سے کیا

وضع داری بھی ہے کوئی چیز اے پیر مغاں
آگئے تو آگئے اب جائیں مے خانے سے کیا

شیشہ و خم مہر برلب جام و ساغر اہلِ ظرف
راز مے خانے سے باہر جائیں مے خانے سے کیا

جوش وحشت میں بھی ہم آوارہ پھر سکتے نہیں
ایک ویرانے سے کام ایک ایک ویرانے سے کیا

کردیا اس قافلے نے شاملِ اہلِ جنوں
ورنہ تھا اے نوح مطلب ہم کو ویرانے سے کیا

جہاں میں ہر شے ہے آنی جانی نشاطِ غم اضطراب کب تک
یہ جوش کب تک اُمنگ کب تک ترنگ کب تک شباب کب تک

جو ہے انھیں شوقِ خودنمائی تو آہی جائیں گے سب کے آگے
رہیں گے پردے میں وہ کہاں تک نبھے گا اُن کا حجاب کب تک

کہاں وہ ساغر کہاں وہ مینا مگر وہی تشنگی ہماری
شراب نوشی کی حد ہے کوئی پلائے کوئی شراب کب تک

ہمیں ذرا بھی خبر نہیں ہے کہ آگیا آفتاب سر پر
جو دل ہو بیدار تو یہ سوچیں سکون و آرام و خواب کب تک

یہ ہم لڑکپن میں چاہتے تھے کہ جلد آئے کہیں جوانی
شباب میں اب یہ سوچتے ہیں کہ آخر اپنا شباب کب تک

نقاب چہرے سے وہ اٹھائیں کہ حسن اُن کو خدا نے بخشا
عیاں نہ ہو ماہتاب کیوں کر نہاں رہے آفتاب کب تک

سکونِ خاطر کے واسطے ہم دوا کریں گے دعا کریں گے
ہمیں محبت میں دیکھنا ہے نہ جائے گا اضطراب کب تک

جو ہوگی تکمیلِ غم کی خواہش تو شوق بھی ہوگا درس غم کا
پڑھیں گے الفت کے مدرسے میں ہم ابتدائی کتاب کب تک

اگر ہو ملنا تو ہم سے ملیے نہ ہو جو ملنا تو صاف کہیے
سلام کب تک پیام کب تک سوال کب تک جواب کب تک

کہیں نہ آئے جہاں پر آفت کہیں نہ ہو جائے غرق عالم
جنابِ نوح اپنے اشک روکیں یہ جوشِ طوفانِ آب کب تک

جلتی بھی ہے روتی بھی ہے چپ چاپ کھڑی شمع
بے سمجھے ہوئے آگ میں کیوں کود پڑی شمع

جلتے ہوئے دیکھا نہ شبِ ہجر سحر تک
ہم سمجھے تھے دل سوز ہماری ہے بڑی شمع

یہ حسن کا جلوہ تو سحر تک نہ رہے گا
آتی ہے کوئی لحظے میں بجھنے کی کھڑی شمع

ہوتی نہ کسی شوخ کی محفل میں رسائی
جلنے کے سبب سے تری تقدیر لڑی شمع

اب چین نہ پائے گی پتنگوں کی طرف سے
زحمت میں انھیں ڈال کر آفت میں پڑی شمع

ممکن ہے شبِ ہجر یہی ختم ہو پہلے
شاید نہ سہے میری طرح آنچ کڑی شمع

تنہا جو شبِ ہجر جلا میں تو مزا کیا
دے اور مرا ساتھ ابھی دوچار گھڑی شمع

دعویٰ تھا بہت حسن کا لیکن سرِ محفل
اُس رخ کے مقابل میں نہ دم بھر بھی اڑی شمع

پروانہ و عشاق کا عقدہ نہیں کھلتا
بے درد بڑے تم ہو کہ بے درد بڑی شمع

دل سوز کوئی اور شبِ غم نہیں ہوتا
بس حالِ زبوں پر مرے روتی ہے کھڑی شمع

وہ حال تھا میرا بھی جو تیرا تھا شبِ غم
جلنے کے سوا بات کوئی بن نہ پڑی شمع

راتوں کو گھڑی بھر بھی نہ ٹلتے تجھے دیکھا
کیا بزمِ حسیناں میں تری بال گڑی شمع

طوفان جہاں نوح کے اشکوں نے اٹھایا
آگ اپنی بجھانے کو وہیں کود پڑی شمع

عذر یہ چلتا ہوا اُن کا دمِ الزام تھا
میں نے پوچھا کیوں نہ آئے کہہ دیا کچھ کام تھا
بعد مرجانے کے اطمینان تھا آرام تھا
عمر بھر انسان کو یہ فکر تھی وہ کام تھا
جو سلامت رہ گیا وہ موردِ الزام تھا
کوچۂ قاتل میں مرجانا ہی پہلا کام تھا
عمر آخر ہوگئی اب وقتِ آخر کیا کہیں
کس قدر تکلیف تھی کتنا ہمیں آرام تھا
سانس اکھڑی موت آئی جینے والے مرگئے
چار دن کی زندگی کا اِس قدر انجام تھا
ان کے آگے میری تقریر اک معمہ بن گئی
گفتگو کی گفتگو پیغام کا پیغام تھا
کھل گیا مجھ پر ترے برتاؤ سے تیرا فریب
کچھ نہ تھا پیغام میں پیغام ہی پیغام تھا
کھل گیا دنیا پر اے قاصد تجھی سے رازِ دوست
دے دیا کس کو مرا خط اور کس کے نام تھا
اشک باری کی بدولت ہوگیا مشہورِ خلق
کیوں نہ میں طوفان اٹھاتا نوح میرا نام تھا

دم نکلتا ہے بات کرنے میں
اب نہیں دیر میرے مرنے میں
کوئی مشتاقِ دید مرتا ہے
کوئی مصروف ہے سنورنے میں
بات بھی مجھ سے تم نہیں کرتے
کیا برائی ہے بات کرنے میں
عشق کرنے میں مجھ کو عذر نہ تھا
عذر ہے ترکِ عشق کرنے میں
وعدۂ شام کا نتیجہ کیا
صبح کردیں گے وہ سنورنے میں
کیوں نہ بجلی گرے مرے دل پر
برق ہیں آپ ظلم کرنے میں
کتنے پر کیف تھے شباب کے دن
لطف آتا تھا ہم کو مرنے میں
حضرت نوح جانتے ہی نہیں
کیا ہے تکلیف ڈوب مرنے میں

وہ کہتے ہیں آ ؤ مری انجمن میں مگر میں وہاں اب نہیں جانے والا
کہ اکثر بلایا بلاکر بٹھایا بٹھا کر اٹھایا اٹھا کر نکالا
نشاط والم کے سفید و سیہ نے ہماری نگاہوں کو حیرت میں ڈالا
اِدھر روشنی ہے اُدھر تیرگی ہے کہیں ہے اندھیرا کہیں ہے اجالا
مرا درد پوچھا مرا حال دیکھا مرے دل کا ارمان تم نے نکالا
خدا اور بھی دے زیادہ مراتب سوا اور اس سے بھی ہو بول بالا
بڑی نیو آپس میں گو دوستی کی مگر دوستی کس طرح نبھ سکے گی
اُسے ہے نزاکت مجھے ہے نقاہت نہ وہ آنے والا نہ میں جانے والا
شوالے کی جانب قدم کیوں بڑھاؤں نظر کس لیے سوئے مسجد اٹھاؤں
مرے دل کو اللہ آباد رکھے مرا دل ہی مسجد ہے دل ہی شوالا
فدا کردیا میں نے دل اُس حسیں پر جو بے درد بھی ہے دل آزار بھی ہے
محبت کی دُھن میں نہ سوچا نہ سمجھا نہ جانچا نہ پرکھا نہ دیکھا نہ بھالا
جفا کا فسانہ تغافل کا قصہ مصیبت کی رودادِ غم کی کہانی
اِدھر کہہ رہا ہے اُدھر سن رہا ہے کوئی کہنے والا کوئی سننے والا
ہمیں پر ہوئیں کیا ہزاروں جفائیں ہزاروں پر آئیں ہزاروں بلائیں
زمانے میں کوئی سنبھلے نہ پایا کسی شوخ نے ہوش جب سے سنبھالا
وہ آئے تھے پہلو میں بے ہوش تھا میں کوئی ہوگی دل پر بہت کچھ نوازش
مگر کیا خبر مجھ کو اللہ جانے تمنا نکالی کہ کانٹا نکالا
ہزاروں بلانوش اِدھر بھی اُدھر بھی ملی اتنی فرصت کہاں مے کدے میں
رہا کام پینے پلانے سے سب کو نہ دھوئی صراحی نہ ساغر کھنگالا
محبت کے جوگی ستم کے بروگی وفا کے بھکاری جفا کے پجاری
جہاں دیکھ پاتے ہیں جلوہ بتوں کا بچھاتے ہیں اپنا وہیں مرگ چھالا
چرا لے گیا کوئی دل بھی جگر بھی اڑا لے گیا کوئی صبر وسکوں بھی
یقیں ہے تمنا نکلتے نکلتے نکل جائے گا عاشقوں کا دوالا
وطن سے نکل کر اکیلے چلے تھے مگر خوش یقینی کے قربان جائیں
ملا دشتِ غربت میں اک اک قدم پر ہمیں اک نہ اک جاں پہچان والا
فغاں کی بھی امداد حاصل کروں میں محبت کو بھی کچھ توجہ دلاؤں
بھرم جذب دل کا نکلنے نہ پائے نکل آئے پردے سے وہ سجدے والا
غضب ڈھا گئیں سیدھی سادی ادائیں ستم کرگئیں ترچھی بانکی نگاہیں
یہی شور اٹھا جدھر سے وہ گزرے مجھے مار ڈالا مجھے مار ڈالا
اِدھر طور پر غش میں موسیٰ پڑے ہیں اُدھر ہاتفِ غیب یہ کہہ رہا ہے
ذرا کھو لیے آپ آنکھیں تو اپنی قریب آگیا دیکھیے دور والا
یہ مطلب تھا ارماں اس کے نہ نکلیں جو تڑپیں تو کچھ اور پیچیدگی ہو
مرے خانۂ دل میں رنج والم نے تنا ہر طرف خوب مکڑی کا جالا
تمھارا ثنا خواں تمھارا دعا گو تمھارا فدائی تمھارا سلامی
یہ کیا کہہ دیا اُس نے واقف نہیں ہم وہی ہاں وہی نوح طوفان والا

یہ کیا رخنہ سازی یہ کیا پیش بندی یہ کیسا کنایہ یہ کیسا اشارا
ابھی ناوک آیا نہیں میرے دل تک صدا ناوک انداز نے دی وہ مارا
قراین سے معلوم ہوتا ہے ہم کو کسی روز لٹ جائے گا دل ہمارا
نگاہیں بھی اُس عشوہ گر کی نگاہیں اشارہ بھی اُس فتنہ گر کا اشارہ
مشیت نے دنیا کی نظروں کے آگے ہمیشہ کیا پیش طرفہ نظارا
کسی کو بگاڑا کسی کو بنایا کسی کو دبایا کسی کو ابھارا
حقیقت میں ہستی نہیں کچھ ہماری تصوف کے رو سے نہیں کچھ ہمارا
وہی آپ شیدا وہی آپ شاہد اُسی کی نظر اور اُسی کا نظارہ
کچھ اُمید پیدا ہوئی بے کسی میں مگر کیا خبر رازِ امید کیا ہے
شب ہجر آواز آئی کہاں سے صدا غم نے دی یا اجل نے پکارا
جو سودائی ہوں گے وہ سودا کریں گے جنھیں عقل ہوگی نہ ایسا کریں گے
محبت کے بازار میں ہم نے دیکھا ذرا سا منافع بہت سا خسارا
مجاز وحقیقت کی باریکیوں پر دہ ڈالے نگاہیں جو باریک بیں ہو
ہمارے لیے دین و دنیا یہی ہے خدا کا بھروسہ بتوں کا سہارا
اثر حسن کا جلد ہوتا ہے دل پر طبیعت ادھا دھند آتی ہے اکثر
قیود وشرائط سے کیا اِس کو مطلب محبت میں کیا فال کیا استخارا
تلاطم بپا ہو کہ طوفان اٹھے بلا آئے سر پر کہ ٹوٹے قیامت
وہ دریائے الفت میں دل بستگی ہے کریں گے نہ تیراک اس سے کنارا
کبھی عشق میں انقلاب ایسا آئے محبت کبھی یہ تغیر دکھائے
بدل جائے دل اور دل ہو بدل کر ہمارا تمھارا تمھارا ہمارا
دعا کے لیے ہاتھ میں کیوں اٹھاؤں فغاں کا بھرم کیا سمجھ کر گنواؤں
لگا تار آنکھیں دکھاتا ہے مجھ کو شبِ غم فلک پر سے ایک ایک تارا
سحر ہوگئی شب امیدوں میں گزری یہ کہتے ہوئے لوگ اٹھے انجمن سے
جواب تک نہیں کی تو اب کا کرے گا وہ خاطر تو صنع عنایت مدارا
نشاط ومسرت کی صورت نہ دیکھی مرے دل نے آزار وغم میں بسر کی
وہ سچ کہہ رہے ہیں اگر کہہ رہے ہیں محبت کے مارے کو آفت کا مارا
نہ کوئی عداوت نہ کوئی خصومت نہ رنجش نہ آپس میں اسبابِ رنجش
ہزاروں ستم ڈھائے مجھ پر فلک نے ضرور اِس میں تھا کچھ تمھارا اشارا
وفا میں دل اپنا تصدق کروں میں محبت میں جان اپنی کردوں نچھاور
تری پیاری پیاری اداؤں کے آگے نہ یہ مجھ کو پیاری نہ وہ مجھ کو پیارا
طریق طلب طرفہ تر جوش دارد بایں جوش ایں طرفہ تر ہوش دارد
خدائی نمی خواہم اندر خدائی کہ می خواہم اندر خدائی خدا را
کبھی کوئی صدمہ کبھی کوئی ایذا کبھی یہ مصیبت کبھی وہ مصیبت
ہم اس کے علاوہ سبب کیا بتائیں نوازش ہے دل کی کرم ہے تمھارا
ہزاروں کھلے راز سرِ بستہ لیکن یہی بات اب تک سمجھ میں نہ آئی
نگاہوں کے آگے تو ہے بزمِ عالم نہاں ہے نگاہوں سے وہ بزم آرا
جو آنا ہے اے نوح ان کو تو آئیں وہ رستہ طرف فاصلہ کچھ نہ پوچھیں
چلیں ریل پر اور پہنچیں سر اتھو، سر اتھو سے نو میل دھن ہے نارا

میرے اوسان کا خدا حافظ
عشق میں جان کا خدا حافظ

سیکڑوں بددعائیں ملتی ہیں
تیرے دربان کا خدا حافظ

دل ہوا شیفتہ ستم گر پر
ایسے نادان کا خدا حافظ

تیر دل میں چبھو کر اُس نے کہا
اب تری جان کا خدا حافظ

وہ مجھے دھیان میں نہیں لاتے
جان پہچان کا خدا حافظ

جمع ہوں جس میں چند دیوانے
اُس بیابان کا خدا حافظ

ترکِ الفت ہم اُن سے کر بیٹھے
نفع نقصان کا خدا حافظ

میری خاطر سے کیا غرض ان کو
رخصتی پان کا خدا حافظ

خیر مجھ کو نظر نہیں آتی
عشق میں جان کا خدا حافظ

ایک کافر سے عشق ہے مجھ کو
میرے ایمان کا خدا حافظ

دستِ وحشت ہوا گلے کا ہار
اب گریبان کا خدا حافظ

فرض ہیں اہلِ عشق پر آداب
مجھ سے ان جان کا خدا حافظ

نوح جو شعر ہے وہ ہے طوفان
تیرے دیوان کا خدا حافظ

زمانے کو قضا نے مار ڈالا
ہمیں تیری ادا نے مار ڈالا

دعائیں بھی مری بے کار ٹھہریں
تمھاری بد دعا نے مار ڈالا

کہیں گے حشر میں قاتل کے منہ پر
ہمیں اِس کی ادا نے مار ڈالا

تری سیدھی نظر سے بچ گیا میں
مگر بانکی ادا نے مار ڈالا

کیا تھا مجھ کو پیدا جس خدا نے
اُسی میرے خدا نے مار ڈالا

مرض تھا کچھ مجھے درماں ہوا کچھ
طبیبوں کی دوا نے مار ڈالا

دل ہماری طرف سے صاف کرو
جو ہوا وہ ہوا معاف کرو

اہلِ گلشن بہار آپہنچی
خار و خس سے چمن کو صاف کرو

جب ستم ہوگا پھر کرم کے بعد
تو کرم سے مجھے معاف کرو

مجھ سے کہتی ہے اُس کی شانِ کرم
تم گناہوں کا اعتراف کرو

یہ بھی عادت میں کوئی عادت ہے
جو کہو اُس کے برخلاف کرو

کیوں بجھاؤ پہیلیاں بے کار
گفتگو مجھ سے صاف صاف کرو

ایک دو تین چار پانچ نہیں
سب خطائیں مری معاف کرو

حسن ان کو یہ رائے دیتا ہے
کم امید کے خلاف کرو

حضرتِ دل یہی ہے دیر و حرم
محفلِ یار کا طواف کرو

تم سزا دو مگر بحسبِ قصور
میں یہ کہتا نہیں معاف کرو

اس میں بھی شان پائی جاتی ہے
ہو کوئی بات انحراف کرو

سخت جانوں کا قتل کھیل نہیں
کچھ دنوں اور ہاتھ صاف کرو

تم کو قہرِ کرم نما کی قسم
فیصلہ میرے برخلاف کرو

کھلتے ہیں دل کے اُتنے ہی جوہر
جتنا اِس آئینہ کو صاف کرو

دل میں ہیں خارِ آرزو لاکھوں
آؤ کانٹوں سے گھر کو صاف کرو

طور سینا کی سمت جائیں کلیم
نوح تم سیرِ کوہِ قاف کرو

مرے دل میں رونق نظر آئے کیوں کر مقدر میں لکھی گئی بدشگونی
ہزاروں تمنائیں لاکھوں امیدیں مگر پھر یہ بستی ہے سونی کی سونی

خدا کے کرم سے تمھاری گلی میں مجھے شوقِ کامل نے پہنچا دیا ہے
اب آیندہ جو کچھ مقدر دکھائے جماتا ہوں بستر رماتا ہوں دھونی

جو آزار و غم پیش آئیں وہ سہ لوں بہت کچھ اِسی کو غنیمت سمجھ لوں
کروں گا اگر اُن سے ترکِ محبت تو اُن کی محبت مجھے ہوگی دونی

خدا سے شکایت اگر میں کروں گا تو کچھ بھی نہ ہوگا شکایت سے حاصل
قیامت میں اپنی بریت کی خاطر وہ کہہ دیں گے مجھ کو کہ یہ ہے جنونی

نہ پہلو میں دل بر نہ آغوش میں دل نہ دل بر کو الفت نہ دل کو مسرت
تمنائیں جس پر مچلتی تھیں پہلے وہی اب مری سیج رہتی ہے سونی

اڑا لے گئے دل وہ پہلو سے فوراً ادائیں دکھا کر نگاہیں ملا کر
محبت میں آئے تو کیا چین آئے ہوئی ابتدا ہی میں یہ بدشگونی

اِدھر اپنے سائے سے بھی اُن کو وحشت اُدھر باغ و صحرا کی بھی دل میں رغبت
ترے عاشقوں کا عجب حال دیکھا جو ہے ایک دیوانہ تو اک جنونی

اگر مرگیا میں تو کیا تجھ کو حاصل کہاں تک ستم اور کب تک تغافل
کرم کر کرم کر اِدھر آ اُدھر آ کہ آغوش میری ہے مدت سے سونی

محبت کے رستے نہ پہچانتا تھا یہ آئینِ الفت نہ میں جانتا تھا
جو پائے طلب چلتے چلتے رکیں گے تو میری طلب ہوگی پہلے سے دونی

یہی ماحصل جوشِ وحشت کا ٹھہرا کہیں بھی نہ دیوانۂ عشق ٹھہرے
جنوں میں جسے کچھ میسر سکوں ہو مری رائے ناقص میں وہ ہے جنونی

دلِ خوگرِ غم یہی چاہتا تھا دلِ خوگرِ غم یہی چاہتا ہے
کہ حسرت فزوں ہو محبت سوا ہو مصیبت زیادہ ہو زحمت ہو دونی

انھیں کی تجلی سے پرنور آنکھیں انھیں کے نظارے سے مسرور نظریں
نہ ہوں جس میں دو چار بھی حسن والے وہ بستی ہے ویراں وہ محفل ہے سونی

عجب کیا ہمیشہ اذیت ہی جھیلو کہ آثار اچھے نہیں پائے جاتے
اٹھایا عبث تم نے طوفان رو کر محبت میں کی نوح یہ بدشگونی

■

ماخذ: دیوانِ سوم اعجازِ نوح، **تصنیف:** عالی جناب ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر منشی و مولوی محمد نوح صاحب، **بحسن اہتمام:** مجید احمد صاحب مجید و سہیل احمد صاحب سہیل ناروی

ادارہ

راہی معصوم رضا

راہی معصوم رضا کی پیدائش 1 اگست 1927 کو اتر پردیش کے ضلع غازی پور کے قصبہ گنگولی میں ہوئی۔ انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں 'طلسم ہوش ربا' میں ہندوستانی تہذیب وثقافت' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی اور وہیں شعبہ اردو میں جزوقتی طور پر ملازم ہوگئے بعد میں ان کو بعض وجوہ کی بنا پر شعبہ سے نااہل قرار دے کر سبکدوش کردیا گیا۔ راہی نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی گھر والوں کی مرضی سے فیض آباد کی مہربانو سے 18 سال کی عمر میں جو تین سال بعد طلاق پر ختم ہوئی۔ دوسری شادی انھوں نے 1965 میں علی گڑھ میں نواب رام پور کے سالے کرنل یونس کی بیوی نیر جہاں سے کی۔

راہی کی شخصیت ہمہ گیر ہے۔ انھوں نے شاعری کی ناول لکھے۔ تنقیدی مضامین لکھے، سیاسی اور سماجی مسائل پر اظہار خیال کیا، فلموں اور ٹی وی سیریلوں کے لیے ڈائیلاگ اور اسکرپٹ لکھے۔ وہ ایک بے باک تنقیدی مزاج رکھنے والے ادیب تھے، اگرچہ وہ ترقی پسند تھے لیکن ترقی پسند اور ترقی پسندوں پر تنقید سے بھی باز نہیں آتے تھے۔

راہی معصوم رضا ادب میں شاعری کے راستے داخل ہوئے۔ الہ آباد سے نکلنے والے مشہور زمانہ رسالے 'نکہت' اور 'جاسوسی دنیا' سے بھی وابستہ رہے۔ نکہت کے شاعری والے حصے کو راہی معصوم رضا اور نثری حصے کو ابن صفی ترتیب دیتے تھے۔ ناول نگاری سے قبل راہی بحیثیت شاعر ادب میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ انھوں نے 1857 کے انقلاب کو بنیاد بنا کر کرانتی کتھا لکھی، جو 1957 میں شائع ہوئی۔ یہ ایک رزمیہ ہے جسے پورے تاریخی سیاق میں پیش کیا ہے۔ رزمیہ کے علاوہ ان کے تین شعری مجموعے 'ایک پھیری والا'، 'شیشے کے مکان والے' اور 'غریب شہر' شائع ہوچکے ہیں۔

1974 میں وہ ایک کامیاب مکالمہ نویس اور اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے مشہور ہوچکے تھے، اس کے باوجود انھوں نے ادبی اور تصنیفی کام ترک نہیں کیا۔ ان کے نزدیک ''فلم تو میری روزی روٹی ہے اور ادب میرا اوڑھنا بچھونا، میں ادب کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کرسکتا۔'' انھوں نے فلم اور ٹیلی ویژن کے پیشے سے ادب کو یکسر الگ رکھا، ناول نگاری کے علاوہ رسائل و جرائد میں سماجی اور سیاسی موضوعات پر بھی لکھتے رہے علاوہ ازیں فلم کا سماج اور ادب سے کیا رشتہ ہے ان موضوعات پر وہ رسائل و جرائد میں مسلسل لکھتے رہے ان کی وفات کے بعد وہ تمام تحریریں کتابی شکل میں تین جلدوں میں شائع ہوئیں۔ اس ضمن میں ان کی رائے نیز فرقہ وارانہ مسائل، سیاسی، بدعنوانی، مذہبی تجارت اور ادبی وسماجی موضوعات پر ان کی بے باکی اہمیت کی حامل ہے۔

راہی معصوم رضا کی زندگی انسانیت کی جدوجہد کے حصول میں گزری۔ ان کی نظر میں انسانیت، آدمی کو مذہب، نسل، فرقہ اور طبقات کو بنیاد بنا کر تقسیم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ راہی ہندوستانی تہذیب وثقافت کے گرویدہ تھے۔ ان کی تحریروں میں اس کی جھلک نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔

راہی ہندی میں کئی برسوں تک لکھتے رہے لیکن شاعری وہ اردو میں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ہندی شاعری اور اردو کی تخیلی زمین میں کافی کچھ مماثلت رکھتے ہوئے بھی مختلف ہے انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ جس زبان میں کوئی شخص چالیس برس سے لکھ رہا ہو، اس کے لیے کسی اور زبان میں لکھنا آسان نہیں۔

راہی کی پہلی باقاعدہ نثری تصنیف 'چھوٹے آدمی کی بڑی کہانی' ہے۔ اس کتاب میں راہی نے پرم ویر چکر یافتہ حوالدار عبدالحمید کی سوانح لکھی ہے جو 1965 میں شائع ہوئی۔ راہی نے دس ناول لکھے جن میں آدھا گاؤں (1966)، اور ٹوپی شکلا (1968) بہت ہی مقبول ہوئے۔ 'آدھا گاؤں اردو رسم الخط' میں لکھا گیا تھا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر یہ ہندی میں شائع ہوا۔ راہی کے دوسرے ناول بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں ان میں ہمت جونپوری (1969)، اوس کی بوند (1970)، دل ایک سادہ کاغذ (1973)، سین 75 (1977) کٹرہ کی آرزو (1978)، اسنتوش کے دن (1986) ہیں۔

راہی کے تنقیدی نوعیت کے مضامین کا ایک مجموعہ 'خدا حافظ کہنے کا موڑ' 1999 میں شائع ہوا۔

یہ کتاب ادبی وثقافتی مضامین پر مشتمل ہے۔ 'لگتا ہے بیکار گئے ہم' 1999 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں راہی نے سیاسی اور لسانی مسائل پر بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ راہی کے ایک اور مجموعہ مضامین 'سنیما اور سنسکرتی' 2000 میں شائع ہوئی۔ راہی نے تقریباً 300 فلموں کے اسکرپٹ اور مکالمے تحریر کیے، ٹی وی کے لیے سو سے زائد سیریل/ایپی سوڈ کے اسکرپٹ اور مکالمے لکھے جن میں 'مہابھارت' اور 'نیم کا پیڑ' بے حد مقبول ہوئے، راہی کا انتقال 19 مارچ 1992 کو ممبئی میں ہوا۔

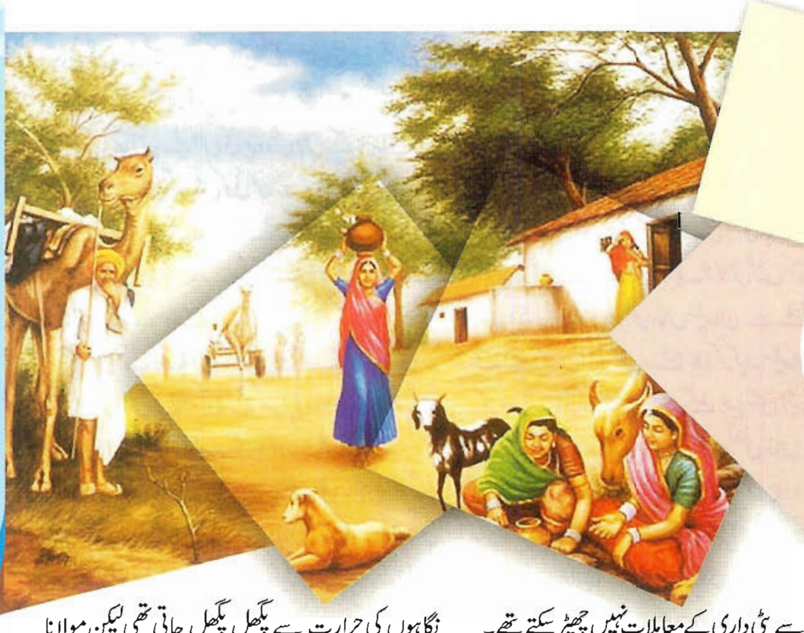

نمک

مصنف : راہی معصوم رضا
مترجم: اسلم جمشید پوری

سلیمان ایک چھتنار درخت کی طرح تھے جس کے سائے میں بچھن کو بڑھنے کا موقع نہیں ملتا تھا لیکن سلیمان میاں جو سال بھر کے لیے جیل گئے تو بچھن تڑ سے جوان ہوگئی۔ اسے باپ کے رنگ کے ساتھ ساتھ ماں کا نمک بھی مل گیا تھا۔ وہ کاجل نہیں لگاتی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے صبح اٹھتے ہی جھنگٹیا بو نے اس کی آنکھوں میں بڑے پیار سے جل ڈالا ہے۔ اُس نے قد بھی خوب نکالا تھا۔ اُس کی کمر اتنی پتلی تھی کہ خواہ مخواہ ہاتھ میں لینے کو جی چاہنے لگے اور کمر کے نیچے چوڑے کولہوں کے خم یوں لگتے تھے جیسے نیاز کے کورے کونڈے ہوں۔ ان کا سینہ تو دوپٹے کے قابو میں نہیں آتا تھا۔ دسہری کے قاشوں کی طرح بھرے بھرے تر و تازہ ہونٹوں سے ہوکر جو آواز نکلتی تھی وہ اتنی رسیلی ہوتی تھی کہ رَس اب ٹپکا اور تب ٹپکا۔ اُس کا جوڑا اتنا بڑا ہوتا تھا کہ نعیمہ بی کا سر چھوٹا معلوم ہونے لگتا تھا۔

نعیمہ بی اُس سے بہت جلتی تھیں اور جھنگٹیا بو تو اس کے حسن سے ڈرنے لگی تھیں۔ گاؤں بھر میں بچھن کے ٹکر کی ایک بھی لڑکی نہ تھی۔ وہ اتنی خوبصورت نکلی تھی کہ مولوی سید بیدار حسین زیدی صدر الفاضل کے بدن میں بھی گدگدی ہونے لگتی تھی اور وہ یہ سوچنے لگے کہ ہڈی کی فکر میں اپنی زندگی خراب کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ایک روز انھوں نے حکیم صاحب سے کہا ''بڑھوتی آ گئی بھائی کبیر اتنا بڑا گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے ہے۔'' حکیم صاحب نے وہی جواب دیا جو اُنھیں دینا چاہیے تھا۔ بولے ''میں تو کہتا ہوں متعہ کرلو۔''

''یہی میں بھی سوچتا ہوں۔ سلیمان کی لڑکی بچھنیا کیسی رہے گی؟''

حکیم صاحب کو یہ رشتہ پسند نہیں آیا کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ شمال پٹی کی ایک جائیداد کا کوئی حصہ جنوب پٹی والوں کے ہاتھ آئے لیکن جب عمر ضائع کرنے کے بعد مولوی بیدار حسین صدر الفاضل کو شادی کا خیال آیا تھا تو وہ بے دردی سے پٹی داری کے معاملات نہیں چھیڑ سکتے تھے۔

بات یہ تھی کہ مولوی بیدار کوئی بیس سال سے اپنے گھر میں تنہا رہتے تھے۔ چالیس سال پہلے ان کی بھاوج کا انتقال ہوا تھا۔ ایک بھتیجی تھی آسیہ۔ اس کی بھی شادی ہوگئی تھی نُہرا کے علی اکبر میاں سے۔ اُس کی شادی کے کچھ ہی دنوں بعد مولانا کے بڑے بھائی کا بھی انتقال ہوگیا اور مولانا گھر میں بالکل اکیلے رہ گئے۔ یہ کوئی بیس سال پہلے کی بات ہے۔

مولانا نے شادی اس لیے نہیں کی کہ اُن کے والد قبلہ وکعبہ ہونے کی حد تک مولانا تھے۔ بڑے نسّاب بھی تھے۔ انھوں نے جو ہندوستان کے سید خاندانوں کے نسب ناموں کو کھنگالا تو معلوم ہوا کہ اب کوئی بے داغ سید گھرانا ہے ہی نہیں کہ جس سے وہ دوسری بہو لائیں۔ چنانچہ مولوی بیدار حسین صدر الفاضل ایک لق و دق مکان میں زندگی کو بھگتنے کے لیے تنہا رہ گئے۔ دن تو جیوں تیوں گزر جاتے لیکن راتیں پریشان کرتیں۔ باہری مکان میں تو اُن کے چرواہے اور دو نوکر سوتے لیکن وہ خود رواج کے مطابق زنان خانے میں سویا کرتے تھے۔ ایک ایسے زنان خانے میں جو برائے نام زنان خانہ تھا۔ چنانچہ محرابوں کے خم گئی رات اُن کا منہ چڑھایا کرتے تھے۔

مولانا کے مکان کا زنانہ حصہ خاصا لمبا چوڑا تھا۔ کیونکہ جب مولانا کے مورثِ اعلیٰ نے یہ مکان بنوایا تھا تو انھیں اس کا خیال بھی نہیں آیا تھا کہ ایک زمانے میں سیدوں کا ایسا اکال پڑے گا کہ بیدار کو کوئی لڑکی نہیں ملے گی۔ مولوی بیدار اسی ویران زنان خانے میں قید تنہائی کے دن گزار رہے تھے۔ گیا اہیر کی لاٹھی کھانے کے بعد تنہائی کا یہ درد اس قدر بڑھ گیا تھا کہ دلریا بھگن ان کی نگاہوں کی حرارت سے پگھل پگھل جاتی تھی لیکن مولانا سے دیکھتے رہنے کے سوائے جب اور کچھ نہ ہوسکا تو دلریا بھی ان سے نفرت کرنے لگی۔ دلریا کا میاں مہابیر اُس سے بارہ سال چھوٹا تھا۔ دلریا بائیس تیئیس سال کی کسی کسائی لڑکی تھی۔ کوئی چار سال پہلے جب وہ بیاہ کر آئی تھی تبھی سے اُس نے گنگولی میں چھوٹی موٹی ہزاروں نہیں تو سینکڑوں اور سینکڑوں نہیں تو پچاسوں رقابتوں کی بنیاد ضرور ڈالی تھی۔ وہ جدھر سے ٹوکرا لے کر گزر جاتی اُدھر راستوں کی شاخوں میں آنکھوں کی ہزار کلیاں کھل جاتیں۔ دروازے باہیں بن جاتے اور بنسکھٹوں میں نبضیں دھڑکنے لگتیں۔ حد تو یہ ہے کہ اس سے کام کروانے کے لیے کئی راقیوں اور جلاہوں نے اپنے اپنے مکانوں میں پاخانے بنوا ڈالے ورنہ سیدانیوں کے علاوہ تمام عورتیں غول بنا کر لوٹے لے کر کھیتوں میں جاتی تھیں اور وہاں پاس پاس بیٹھ کر ساسوں کی شکاتیں کرتی تھیں یا سوگوشیوں میں اپنے خوابوں اور محرومیوں کی باتیں کرتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی لڑکی اندھیرے میں ذرا دور سرک جاتی تھی تو کوئی نئی بے زبان کہانی بن جاتی تھی۔ صرف سیدانیوں کے پیروں میں ان کہانیوں کی زنجیریں تھیں کیونکہ وہ کھیت نہیں جاتی تھیں بلکہ ان کے لیے گھروں میں گندے سڑے ہوئے سنڈاس تھے لیکن ایسا نہیں تھا کہ سیدانیوں کے حصے میں کہانیاں ہی نہ آئی ہوں۔ فلاں میاں کی بیوی اپنے بھتیجے سے پھنسی ہے، فلاں کو اُن کے دیور نے رکھ چھوڑا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کہانیوں میں بھی ہڈی کا خیال رکھا جاتا تھا یعنی یہ کبھی نہیں ہوسکتا تھا کہ فلاں کی بیوی فلاں راقی یا جلاہے سے پھنسی ہوئی ہے۔

مولوی بیدار حسین صدر الفاضل کے حصے میں کوئی

کہانی اس لیے نہیں آئی کہ اُن کے زنان خانے میں کوئی عورت ہی نہیں تھی۔ آسیہ کی ماں کا انتقال چونکہ بچپن ہی میں ہوگیا تھا اس لیے اس کی پرورش اس کے ننیہال میں ہی ہوئی تھی۔ جس گھر میں کوئی عورت ہی نہ ہو اس گھر میں کوئی عورت کس بہانے سے آئے۔ چنانچہ جب ڈُلریا آئی بھی تو مولوی بیدار بیچارے کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اُسے دیکھتے رہنے کے سوائے اور کیا کریں۔

اسی لیے ڈُلریا اُن سے نفرت کرنے لگی اور کسی نہ کسی طرح اس نے مولانا کے گھر اپنی بیوہ نند کو لگا دیا جو کوئی پچاس سال کی نہایت ہی بدصورت عورت تھی۔

مولانا صاحب بیچارے بالکل ہی مایوس ہوگئے تھے کہ ایک روز انھوں نے پھتن میاں کے گھر سے جھانکتی ہوئی بچھن کو دیکھ لیا جو سامنے ہی کبڈی کھیلنے والے لڑکوں کو دیکھ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ مولانا اُسے مڑمڑ کر نہیں دیکھ سکتے تھے اس لیے وہ بڑھتے چلے گئے لیکن کئی دنوں تک بچھنیا کا خیال لال چیونٹیوں کی طرح ان کے بدن سے لپٹا رہا حکیم صاحب کو یہ تفصیلات معلوم نہیں تھیں لیکن انھوں نے اپنے بال دھوپ میں نہیں سفید کیے تھے۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ پچاس برس کے مولانا ایک غیر سید اور حرامی لڑکی کے بارے میں باتیں کررہے ہیں تو انھوں نے جان لیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اس لیے انھوں نے مولوی بیدار کے سوال کا فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔

''بھئی او تو حرامی ہے!'' آخر انھوں نے اعتراض کا ایک پہلو نکال لیا۔

''تا اِے میں اُو کا کون قصور ہے؟'' مولوی بیدار نے کہا۔

''اُو کا قصور تا نا ہے، باقی لوگ کا کہیں!''

''ای تا کہیں نا لکھا ہے کہ حرامی لڑکی سے نکاح ناجائز ہے... آخر ہمہوں سلطان با مدارس میں بھاڑ نا نہ جھونکا ہے۔ ہواں قرآن حدیث نہ پڑھتے رہے!''

''تا کا ہیں ای نا لکھا ہے کہ حرامین سے بیاہ نا کرے کو...''

حکیم صاحب کو یہ معلوم تھا کہ یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ حرامیوں سے شادی نہیں ہوسکتی پھر بھی انھوں نے سوال کیا۔ کیونکہ لکھا ہو یا نہ لکھا ہو لیکن یہ بات کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی کہ کوئی سید زادہ کسی حرامی کی لڑکی سے شادی کرے اور حرامی بھی کیسی کہ جس کی ماں چمائن ہو اور وہ بھی جنوب پٹی کی چمائن چونکہ حکیم صاحب یہ باتیں نہیں کہہ سکتے تھے اس لیے مولوی بیدار حسین صدر الفاضل نے انھیں قائل کرلیا۔ طے پایا کہ سلیمان کی ننیہال والوں کے ذریعے بات چیت شروع کی جائے۔ چنانچہ رجب علی میاں کی مجلس میں شرکت کرنے کے لیے جو حکیم صاحب پارے گئے تو انھوں نے موقع نکال کر سلیمان کے ماموں علی مرتضیٰ خاں سے یہ ذکر نکالا کہ بیدار میاں کی عمر زیادہ ہے تو کیا ہوا۔ اتنی بڑی جائیداد ہے اور پھر یہ کہ بچھن کے لیے کوئی شریف لڑکا مل نہیں سکتا۔ چنانچہ جب ایک جمعہ کو علی مرتضیٰ خاں سلیمان سے ملنے ضلع جیل گئے تھے انھوں نے اِس رشتے کا ذکر کیا۔ سلیمان نے کہا کہ وہ بھیا تانی وزیر میاں اور منجھلے بھیا یعنی بشیر میاں کی رائے کے بنا کچھ نہیں کرسکتا تو علی مرتضیٰ خاں نے وزیر میاں سے ذکر کیا۔ وزیر میاں نے کہا کہ چودہ ہزار سکۂ رائج الوقت پر نکاح ہو تو انھیں کوئی اعتراض نہیں۔ علی مرتضیٰ خاں نے یہ جواب گنگولی جاکر مولوی بیدار کو سنا دیا اور حکیم صاحب کی مخالفت کے باوجود مولوی بیدار نے بات مان لی۔ طے یہ ہوا کہ چند مہینوں بعد جب سلیمان جیل سے چھوٹ کر آجائیں گے تو نکاح ہوجائے گا۔ یہ خبر چھپی رہنے والی تو تھی نہیں، پر لگا کر اڑی اور آسیہ کی سسرال کی کھپریل پر بیٹھ کر بانگ دینے لگی۔ آسیہ نے یہ سنتے ہی ڈولی منگوائی۔

آسیہ کی ڈولی جنوب پٹی کے بڑے پھاٹک میں اُتری۔ وہاں نعیمہ بی اور ان کی بہن کبریٰ کے سوائے اور کوئی نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ آسیہ جیسی کھری سیدانی ان پپندیوں کی مہمان نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ وہ اگو میاں کے خالی گھر سے ہوتی ہوئی پھسّو میاں کے گھر چلی گئی۔

صبح کا وقت تھا۔ ربن بی دھوپ میں بیٹھی تام چینی کے ایک بڑے پیالے میں چائے پی رہی تھیں اور پھسّو کی بیوی سکینہ بی باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی اپنے مائیکے کو یاد کررہی تھیں جب کہ ان کی بڑی بیٹی سلمٰی چپاتیاں بیل رہی تھی۔

''پھوپھو آداب!'' آسیہ نے ربن بی کو سلام کیا۔

''جیتی رہو!'' ربن نے پیالے کو پلنگ پر رکھ کر کہا ''اے دھیا توں تا نشیہر والن کو ایک دمے بھول گئیو۔''

''کا بتائیں پھوپھو کبھی ہی بیمار ہے تو کبھی ہو بیمار ہے۔ آ پھر ہیاں کے کے پاس آویں!'' آسیہ بولی ''ایک ٹھو چچا ہیں تا سن رہے کہ او بچھنیا سے بیاہ کر رہیں۔''

''نوج!'' ربن نے ناک پر انگلی رکھی ''ای بیدار سٹھیا گئے ہیں کا!''

''لیو تا او بیچارے اکیلے گھر واہیں کا کریں؟'' سکینہ نے باورچی خانے سے ٹکڑا لگایا۔ ''اب بیچارے بڑھائے ہیں۔ بدن اور دل دُکھت ہوئیہے!''

''ہم مزاخ نہ کر رہے ہیں بھاوج۔'' آسیہ نے کہا ''بچے ای بیاہ ہوگا تو برادری والے کا کہیئیں؟''

''تا برادری والے آ کے اُن کا بدن دباویں۔ ان کے کھائے پیئے کا خیال کریں۔ اور اُو تو ہیں ان کی بڑی فکر ہے تا توں لے جا کے رکھ لیو انھیں۔'' سکینہ نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیا۔ ''ای کہیو کے سوچیو کہ اب اُو بیاہ کہن اور لڑکا بالا ہوگوا تو زمیندار یا چلی جیئیہے۔''

آسیہ تلملائی۔

''جے کی زمینداری ہوئیہے اُو ہے نا فکر کریہے۔''

''اے بہینی ہمہوں کو نو بھکھ منگن کے گھر سے نا آئے ہیں...''

سکینہ نے سوچا کہ فاصلہ زیادہ ہے اس لیے وہ باورچی خانے سے اٹھ کر آنگن میں آگئی لیکن ربن بی نے مداخلت نہیں کی۔

بہت دنوں کے بعد گنگولی کی ٹھہری ہوئی زندگی میں کوئی طوفان آیا تھا۔ فوجداریاں وو جداریاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ مرد ہیں تو تاک جھانک بھی کریں گے۔ رکھنیاں بھی رکھیں گے۔ آخر گورے میاں نے یاقوت کو رکھا اور ظہیر میاں نے پکھراج کو۔ پھُنن کرامت علی کی بیوی کو نکال لائے لیکن اب تک کسی سید نے کسی رکھنی کی لڑکی کو بیاہ نہیں دیا تھا۔ ایسے موضوع تو کئی زندگیوں کے بعد ملتے ہیں۔ چنانچہ ربن بی نے اپنی بہو کو گھڑک دیا۔

''اے دلہن، ای تاکو نو لڑے کی بات نا ہے۔''

سکینہ دل ہی دل میں ربن کو کوستی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہ ربن بی سے سخت نفرت کرتی تھی۔ بڑھیا مرنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ کنجیاں سنبھالے بیٹھی ہوئی تھی اور سکینہ کو ایک ایک پیسے کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ ربن بی نے جو پہنا دیا پہننا پڑا، جو کھلا دیا کھانا پڑا۔ پھسّو اس لیے دم سادھے رہتے تھے کہ جائیداد ربن بی کی ہی تھی جس کے بل بوتے پر وہ رئیس سب نے حقہ پیتے تھے اور آسامیوں کو گالی دیتے تھے۔ ویسے پھسّو بھی سکینہ سے بہت خوش نہیں تھے۔ انھیں سکینہ کی بدصورتی سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ بیویوں کے لیے خوبصورت ہونا بالکل ضروری نہیں ہے۔ خوبصورتی تو رنڈیوں کے لیے ضروری ہے۔ انھیں شکایت یہ تھی کہ سکینہ کے یہاں تابڑتوڑ سات لڑکیاں ہوچکی تھیں اور پھسّو میاں ایک بیٹے کے ارمان میں مرے جا رہے تھے۔ جب لڑکی پیدا ہوتی تو پھسّو منّتیں وَنّتیں مان کر اور گنڈے تعویذ میں جکڑ جکڑا کر پھر کوشش میں لگ جائے۔ یہاں تک کہ سکینہ کو متلی ہونے لگی اور وہ کورے برتن میں کھانے لگتی۔ یہ دن پھسّو بڑی بے چینی

سے گزارتے۔ یہاں تک کہ پھر لڑکی ہوجاتی اور پھسو کا منہ لٹک جاتا اور تبن بی ہاتھ اٹھا اٹھا کر سکینہ کو کوسنے لگتیں۔ ''لڑکیئے لڑکی پیدا تا کیے جارہی ہو۔ باقی ای گھر میں رو کڑنا دھرا ہے۔''

سکینہ ان کوسنوں کو پی جاتی۔ تنہا ہوتی تو روتی اور اپنے کو بدعا دیتی۔ خود اُس نے بھی اَن گنت منتیں مان رکھی تھیں۔ سادھوؤں اور فقیروں پر نہ معلوم کتنے پیسے خرچ کرچکی تھی۔ ربن بی کو یہ معلوم نہیں تھا مگر سکینہ نے اپنا اُتراج بکوا کر ایک عامل سے چھلا کھنچوایا تھا۔ اس کے نتیجے میں تیسری لڑکی ہوئی تھی اور تب دعا تعویذ پر سے سکینہ کا اعتقاد اٹھ گیا تھا اُس نے نماز پڑھنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ دو لڑکیاں مزید ہوئیں تب اس نے سوچا کہ لڑکی یا لڑکا ہونے کا اللہ میاں کے کارخانے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس خیال سے اس کی عقائدی زندگی میں پھر سکون پیدا کردیا اور وہ آٹھویں لڑکی کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوگئی۔ چنانچہ وہ تو پھر باورچی خانے میں چلی گئی اور وہاں بیٹھ کر سلمٰی کو دیکھنے لگی جو چپاتیاں بنارہی تھی اور سوچنے لگی کہ سلمٰی اور بچھنیا میں آٹھ ہی دن کی تو چھوٹائی بڑائی ہے۔''

یہ بات ربن اور پھسو کو بھی معلوم تھی۔ پھسو بھی رشتے کی فکر میں تھی اور ربن بی ذہن دوڑا رہی تھیں۔ مگر ان دنوں رشتہ کرنے سے جی ڈرتا تھا۔ خدا غارت کرے موئے جرمنوں کو جنھوں نے لڑائی چھیڑ رکھی تھی! فوج میں بھرتی ہورہی تھی۔ خود گنگولی میں حکیم علی کبیر کے دروازے پر بھرتی کا دفتر کھل گیا تھا۔ دھڑ ادھڑ لوگ فوج میں بھرتی ہورہے تھے۔

''ای بخت اپنی اپنی لڑکیین کو چھاتی سے لگا کے بیٹھے کا ہے۔ اے بھینی کا پتہ کب کون فوج پر چلا جائے۔''

یہ بات انھوں نے اگو میاں کی بیوی سے کہی تھی۔ جب وہ سلمٰی کے لیے قاسم کا پیام لائی تھیں اور یہ بات اگو میاں کی بیوی کے دل میں تیر کی طرح ترازو ہوگئی تھی کیونکہ قاسم ان کا پہلوٹھی کا لڑکا تھا اور اگو میاں کی مخالفت کے باوجود فوج میں بھرتی ہوگیا تھا۔

''ناہیں بھینی مت بیاہا!'' ابو میاں کی بیوی نے کہا تھا ''سینت کے رکھل اپنی بیٹین کو!''

ربن بی نے اپنی لڑکیوں کو واقعی 'سینت' کے رکھ لیا۔ کئی بار اس بات پر بہو سے تکرار بھی ہوگئی کیونکہ سکینہ کا خیال تھا کہ بیاہ ماں باپ کا کام ہے۔ آگے لڑکیاں جانیں اور اُن کی تقدیر جانے اور ''کون جانے اِی لڑائی کھبو ختموں اہوئیہے کی ناہیں۔ ہر چیز میں تا آگ لگ گئی ہے۔ ٹاٹ کا دوپٹہ اوڑھے اوڑھے کندھا دُکھنے لگا۔ نذر نیاز کو چلین نا ملے۔ پر سال ایک ٹھومنت اُتارے کو رہا نا علم پر چڑھاوے کو کپڑا نا ملا۔ ای تا لڑائی ختم ہووے کے لچھن ناہیں۔''

''ای ہے تا موہوں کہہ رہیوں!'' ربن بولی ''کا لڑکیا کو ای ہے ٹاٹ کا کپڑا دے کر بدا کر یہیں۔''

ربن بی کی اس دلیل نے سکینہ کو لاجواب کردیا تھا لیکن جب وہ سلمٰی کی طرف دیکھی تو گھبرا جاتی کہ زمانے کے پاس کچھ ہو یا نہ ہو لیکن زبان گز بھر کی ہے۔ اگر کسی نے لڑکیوں کو کچھ کہہ دیا تو غضب ہوجائے گا۔ چنانچہ وہ ساس کا غصہ سلمٰی پر اتارتی تھی اور گویا لڑائی جرمن نے نہیں شروع کی تھی بلکہ خاص سلمٰی نے شروع کی تھی۔ اس لیے وہ جو باورچی خانے میں پہنچی تو اُس وقت شامت کی ماری سلمٰی سب سے چھوٹی بہن کے لیے آٹے کی گڑیا بنا رہی تھی۔ بس سکینہ ابل پڑی:

''ای تو روٹی بیل رہیو!''

''ای روٹی رہی!''

''تنی چر غوکم'' سکینہ بالکل آپے سے باہر ہوگئی۔ ''لہڑا بھر لڑکیین کے واسطے چڑی بنائے کو ہوتا من بھر آٹا چاہیے۔''

■

ماخذ: 'آدھا گاؤں'، **مصنف:** راہی معصوم رضا، **مترجم:** اسلم جمشید پوری، **ناشر:** شری رامانند سرسوتی پستکالیہ موضع جوکیہرا، اعظم گڑھ اتر پردیش

راہی معصوم رضا کے منتخب کلام

کرانت کتھا

سنو بھائیو، سنو بھائیو، کتھا سنو ستاون کی
کان کھول کر سنو کتھا ہے کرانت کے پہلے ساون کی
دلی جیتی جیداروں نے کانپ گئی اندھیاری
انگریزوں کے خون سے پھوٹی نئی بھور کی لالی
اتر، دکھن، پورب، پچھم سب نے ایک صدا دی
دلی شہر کے نام پہ آئی کرانت کی اب اگوائی
جوت جگا دی دیوانوں نے سوتے مغل سنگھاسن کی
سنو بھائیو، سنو بھائیو، کتھا سنو، ستاون کی

دلی میں وہ دیپ جلا ہے دور دور اجیالا
کالکھ بچی اگر ہے کہیں پر گوروں کا منہ کالا
اعظم گڑھ کی گردن میں ہے دلی کی جے مالا
جونپور کے ہاتھوں میں بھی ہے جو ہی کا بھالا
کاشی نے بھی سختی دیکھی اپنی اٹھتی گردن کی
سنو بھائیو، سنو بھائیو، کتھا سنو ستاون کی

ہر جانب سے فوجوں نے دلی کا رستہ پکڑا
اتنے قدموں کی آہٹ سی چونک پڑا سناٹا
رات نے اپنی آنکھیں کھولیں دن نے یہ منظر دیکھا
طوفانوں نے جب دستک دی جاگا ہر دروازہ
دیکھتے دیکھتے دنیا بدلی کھیت کی ڈھیلی چتون کی
سنو بھائیو، سنو بھائیو، کتھا سنو ستاون کی

میڑھوں نے تو کمانیں کھینچیں، پودوں نے تلواریں
خوشے آپس میں یہ بولے گوروں کو اب ماریں
زیل غرائے، آؤ ہم دشمن کو للکاریں
درویودھن ہار رہا ہے، کھیت اب کیش سنواریں
کون بتائے، وَشا بھیؑ کا بڑے بڑے جمیدارن کی
سنو بھائیو، سنو بھائیو، کتھا سنو ستاون کی

اپنے خون سے دیوانوں نے سینچا جب ہر تھالا
تب جاکر اک کونپل پھوٹی نکلا اک جی والا
بین بجائی آزادی نے اور گوندھی اک مالا
تب بانبی کی اوٹ سے نکلا پھن کاڑھے اک کالا
دھرتی کی آنکھیں تھیں پیاسی کنور سنگھ کے ورشن کی
سنو بھائیو، سنو بھائیو، کتھا سنو ستاون کی

کلکتہ سے پیشاور تک ایک ہوا اک موسم
یہاں پہ شور زیادہ ہے گر وہاں پہ کچھ کم کم
ایک طرح کے زخم دلوں پر، ایک طرح کا مرہم
دیوانوں میں نعرے گونجے، انگریزوں میں ماتم
کانپور کی حالت دیکھ کے گھگھی بندھ گئی راون کی
سنو بھائیو، سنو بھائیو، کتھا سنو ستاون کی

○

اندھیرے میں چھپی ہوئی ہوا کی شائیں شائیں میں
دبی دبی سی گفتگو، گھٹی گھٹی شکایتیں
ہر ایک لفظ اک کراہ، ایک ٹھنڈی سانس ہے
نہ جانے کون لوگ ہوں نہ جانے کس طرح ملیں
مرے خیال کو جو سانپ ڈس رہا ہے دیر سے
نہ جانے اُس سوال پر، یہ رو پڑیں کہ ہنس پڑیں

ماآخذ: 1857، **مصنف:** راہی معصوم رضا، **ملنے کا پتہ:** نیا کتاب گھر، انوپ شہر روڈ، علی گڑھ، فردوس پبلی کیشنز، الہ آباد، 3

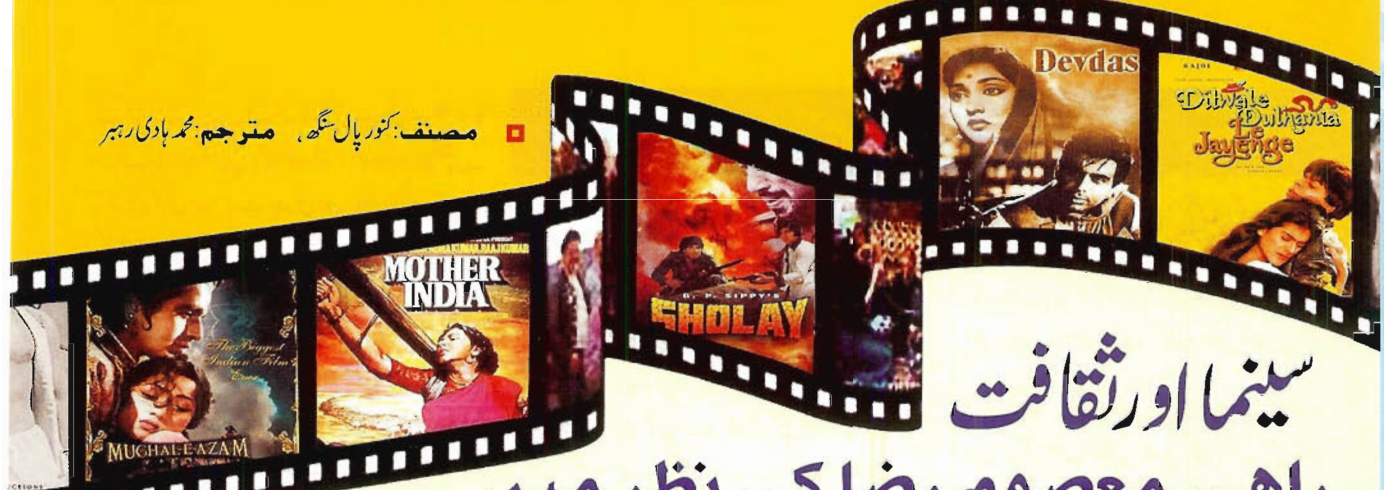

مصنف: کنور پال سنگھ، مترجم: محمد ہادی رہبر

سینما اور ثقافت

راہی معصوم رضا کی نظر میں

یہ بحث اب زور پکڑتی جا رہی ہے کہ فلم کو ادب عالیہ کی ایک صنف کے طور پر تسلیم کرلیا جائے، اس کے پرزور حمایتی راہی معصوم رضا تھے۔ آج کی دنیا چھوٹی ہوگئی ہے، گلوبل ولیج کا تصور مسلسل زور پکڑتا جا رہا ہے۔ عوامی ذرائع ابلاغ کا تیزی سے پھیلتا نیٹ ورک، پردے پر رقص کرتی پرچھائیوں کو عام آدمی کے بیڈروم تک لے آیا ہے۔ اس پس منظر میں فلم اور ٹیلی ویژن جیسے الکٹرانک میڈیا صرف تفریح کے آلات نہیں رہ گئے ہیں۔ ٹی وی کا تصور تفریح سے قطع نظر تعلیم اور دوسرے میدان میں اپنی اہمیت کو تسلیم کروا چکا ہے، لیکن فلم کو آج بھی عام طور سے تفریح کا ذریعہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ سنیما آج ہر سماج کا بے حد اہم حصہ بن چکا ہے، بھارت جیسے ملک میں سنیما عام آدمی کی ذہنی کیفیت، اس کے طور طریقے، اس کی آرزوؤں، گفتگو کے انداز یہاں تک کہ مینرزم تک کو متاثر کرتا رہتا ہے، یہاں ایک بڑے طبقے کے لیے عوامی تفریح کے بے حد محدود ذرائع اور مواقع ہیں، ایسے میں سنیمائی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

ادب کی طرح فلم بھی انسانی زندگی کے فنی اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ بھی اپنے سماج کی ذہنیت اور سمت کا آئینہ ہے۔ ادب ہی کی طرح یہ سماجی تبدیلی کی رفتار اور رجحان کو اپنی طرح سے پیش کرتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک بات اور! ہمارے ملک میں آج بھی شرح تعلیم 50 فی صد ہے، اس میں تعلیم یافتہ لوگوں کا فیصد اس کا نصف رہ جاتا ہے۔ اس تعلیم یافتہ طبقے میں کتنے لوگ کتابیں اور رسائل و جرائد پڑھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، اس کا حساب لگایا جائے تو دو فی صد ہوتا ہے، اس کثیر آبادی والے ملک کو دیکھتے ہوئے ہماری کتابوں کی دنیا بہت چھوٹی ہے۔ اس لیے ادب ایک بہت چھوٹے حصے تک ہی پہنچ پاتا ہے اور اس کے سماجی حوالوں کا اثر عوام الناس پر نہیں پڑتا۔ بہت بڑی تعداد اَن پڑھ لوگوں کی ہمارے سماج میں ہے۔ بے حد غریبی اور مشکل حالات سے گھرے، ملک کی ترقی کا حال خود بخود ظاہر ہو رہا ہے۔ ان سب کے باوجود فلم کی پہنچ عوام کے بہت بڑے حصے تک ہے۔ ایک طرف سنیما گھروں میں بھیڑ ہے تو دوسری طرف جھوپڑپٹیوں تک میں ٹیلی ویژن موجود ہے۔ آج کسی دوسری تہذیب یا عوامی ذرائع کی اتنی زبردست پکڑ عوام میں نہیں ہے۔ اس لیے سنیما کے سماجی رول کی نشاندہی کرنا اسے عوام تک پہنچانا، اس فنی ذرائع کی اہمیت کو پہچاننا اور اس میں حصہ داری کرنا بہت ضروری ہے۔

روپہلے پردے کی اس پراسرار دنیا میں قدم رکھنے سے قبل چھٹی دہائی تک راہی معصوم رضا ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے تسلیم کیے جا چکے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی لکچررشپ چھوٹنا اور ذریعہ معاش کے لیے نئے راستوں کی تلاش میں علی گڑھ ترک کرنے کا فیصلہ ان کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ حالات سے گھرے راہی کے سامنے پوری زندگی ایک کھلا چیلنج تھی۔ ان کے جیب میں تھا قلم اور دوستوں کا پیار جس کے سہارے انھوں نے ممبئی کا رخ کیا۔ ممبئی میں اپنے ادیب دوستوں کے ذریعے وہ فلم نگاروں سے متعارف ہوئے، ان کی کوششوں سے انھیں فلمیں ملیں اور اسی طرح انھوں نے اسکرپٹ نگاری اور مقالہ نگاری کی شکل میں فلمی دنیا میں جگہ بنائی۔ ابتدائی دنوں کو یاد کرتے ہوئے ایک مرتبہ راہی نے کہا تھا کہ جب وہ ممبئی میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے تو ان کے 'خیر خواہ' نغمہ نگار شاعر دوست ان سے اسکرپٹ نگاری اور مکالمہ نگاری میں زیادہ امکانات کی بات کرتے'، ویسے ہی 'خیر خواہ' اسکرپٹ اور مکالمہ نگار دوست انھیں فلموں میں نغمہ لکھنے کی صلاح دے رہے تھے۔ بہر حال ایک اچھے شاعر اور ناول نگار کی حیثیت سے شہرت اور دوستوں کی مدد سے انھیں نامی گرامی ہدایت کار ملے اور بڑے بینر کی فلمیں ملیں، فلمی اسکرپٹ اور اس کی زبان سے وہ آہستہ آہستہ واقف ہوتے گئے، اس فن کو سیکھنے میں انھوں نے بہت محنت کی۔ ایک مرتبہ گفتگو کے دوران انھوں نے اپنے ابتدائی دنوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ راج کھوسلہ کی فلم کے مکالمے انھوں نے لکھے، راج کھوسلہ اسکرپٹ دیکھنے لگے۔ وہ ہر صفحے کو پڑھتے ... ''کیا بات ہے! بہت خوب، بہت اچھا! جیسے الفاظ سے تعریف کرتے جاتے لیکن صفحہ کاٹتے جاتے۔ دو ورق میں بمشکل دو تین مکالمے کام کے رہ جاتے، پھر سمجھ میں آیا... یہاں کہانی کی اسکرپٹ اور مکالموں کے درمیان محدود جگہیں ہوتی ہیں۔ طویل زمانوں کا ذکر صرف دو تین مکالموں میں کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مناظر وغیرہ کی الگ زبان ہوتی ہے، جہاں صرف منظر نگاری اور کیمرہ بہت سی کہانی کہہ ڈالتے ہیں۔ بہت مرتبہ ایک طویل واقعے کو کیمرے کی آنکھ ایک شاٹ میں کہہ دینے کی اہل ہوتی ہے اور یہیں لفظ کی طاقت اور اس کی اہمیت منظر نگاری کئی گنا بڑھا دینے میں کامیاب ہوتی ہے، تبھی راہی نے پہچانا یہ روپہلا پردہ صرف نغمہ و رقص یا ڈھشُم ڈِھشُم تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس فنی ذرائع میں سماجی فکر و شعور کے اظہار کی بے پناہ گنجائش بھی ہے، اس کی دسترس ایک تجارتی فنی ذرائع کی صورت میں سماج کے بہت بڑے طبقے تک ہے۔

فلم جیسے مقبولِ عام فنی ذرائع کی اہلیت اور احساسات کو سمجھنے اور استعمال کرنے کی تخلیقی اور شعوری کوشش میں راہی تنہا نہیں تھے۔ فلم کے ابتدائی مرحلوں میں چارلی چیپلن نے سمعی و بصری ذرائع کا بخوبی استعمال کیا اور تفریح کی جملہ خصوصیات کے ساتھ افکار کو تحریک کی شکل دی۔

جاپانی فلم ساز کوروساوا کی فلمیں نہ صرف اپنے مواد میں بلکہ پردے پر علامتوں اور اس کی پیش کش میں حیرت انگیز تھیں، یہ فلمیں ناظر کے احساسات پر اثر انداز ہونے میں کامیاب رہتی تھیں، کوروساوا جیسے کلاسیکل فلم سازوں کی فلمیں فنکاری اور اپنے سماجی پیغاموں کے

ساتھ آدمی کے ذہن میں اتر ہی نہیں جاتیں بلکہ فن کی عظمت کو بھی قائم کرتی ہیں اور ساتھ ساتھ فنکار اور فن کو ابدیت عطا کرتی ہیں، اس سیاق میں راہی بنگالی سنیما میں ستیہ جیت رے مرنال سین کے علاوہ ہندوستانی میں بمل رائے، گووند نہلانی، رشی کیش مکھرجی، گلزار جیسے فلم سازوں کے نام بار بار لیتے ہیں۔

ادب کے مقابل سنیما کو رکھتے ہوئے راہی نے واضح کیا کہ فلم کو بھی انھیں تقاضوں کو پورا کرنا چاہیے جو دوسری ادبی اصناف کرتی ہیں، یعنی کہ وہ تبلیغ اور پروپیگنڈہ نہیں ہے، وہ عوام کو سکھ مہیا کراتا ہے اور سکھ سے وہ سماج کو صحت مند بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر نظم، ناول یا کوئی تخلیقی ادب جو اس فرض کو پورا نہیں کرتا وہ بے کار ہے، اس طرح جو فلم اس فرض کو پورا نہیں کرتی وہ بھی بے مصرف ہے۔ (ص23)

ہمارے یہاں جب بھی فلموں پر سنجیدہ گفتگو کی کوشش ہوئی، دانشوروں کے مابین یہ گفتگو ہمیشہ تجارت یا فن (یا غیر تجارتی) فلم کے درمیان آکر ٹھہر گئی۔ ایسا ہی کچھ ہندی کہانی کے پس منظر میں، نئی کہانی، کے بعد 70 کی دہائی میں ابھرے 'غیر کہانی پن' اور پھر عوامی کہانی (جنوادی کہانی) کے دور میں ہوا۔ چھٹی دہائی کے بعد ملک کی سیاست اور معاشیات میں اہم تبدیلی ظاہر ہونے لگی تھی۔ مزدور پیشہ کسان، چھوٹے کسانوں اور مزدوروں کی نکسلی جدوجہد یا اسی طرح کی دوسری تحریکیں ہر جگہ ہر سطح پر موجود تھیں۔ دانشوروں، ادیبوں، اداکاروں کا ایک طبقہ یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ آزادی کے بعد سماجوادی (اشتراکی) اور مساوات پر مبنی سماج کی تعمیر کا تصور کیا گیا تھا، وہ خواب دھندلا گیا ہے اسی وجہ سے زمیندار، سرمایہ دار اور اقتدار کا اتحاد روز بروز مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔

اس ادبی سماجی ماحول کا اثر دنیائے آرٹ کے مختلف اصناف پر پڑنا فطری تھا، ادب کے ساتھ ساتھ فلمی دنیا میں بھی سہل علامتیں حاوی ہونے لگیں۔ تجرباتی اور تجربوں کے نام پر کھلی من مانی کرنے کی چھوٹ تھی۔ اس متوازی رجحان نے آرٹ اور تجارت کے نام پر فلمی دنیا میں تیزی سے ترقی کی، یہاں بھی فلم سازوں کا ایک طبقہ ایسا تھا جو سماجی واسطوں اور ترقی پسند فکر و نظر میں یقین رکھتا تھا' جاگتے رہو'، 'بوٹ پالش'، 'دو بیگھہ زمین'، 'عورت' جیسے مختلف سماجی، اقتصادی سوالوں سے دوچار کرنے والی فلموں کی ایک لمبی قطار اور فلم سازوں کی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔ لیکن باقاعدہ اب گولی داغو پوسٹر کی شکل میں فلمیں بھی بننے لگیں، اور انھیں آرٹ فلم یا متوازی فلم کا نام دیا گیا۔

اس متوازی فلمی تحریک میں دو طرح کے میلانات ظاہر ہوئے، ایک طرف ترمنی کول کی 'اس کی روٹی' جیسی مہمل تجرباتی فلم تھی جو صرف فلم سازوں اور اس جیسے 'دانشور' طبقے کے لیے تھی۔ دوسری طرف خواجہ احمد عباس کی 'نکسلائٹ'، مظفر علی کی 'گمن'، 'آگمن' یا سعید مرزا کی 'البرٹ پنٹو کو غصہ کیوں آتا ہے' جیسی فلمیں تھیں۔ (یا مرنال سین کی کسان مزدور تحریکوں پر منحصر) جو اپنے آپ میں بے حد اہم اور کارآمد تھیں لیکن اس کی کہانی مبہم تھی، عام ناظر تک پیغام رسانی میں ناکام رہیں۔ پھر اعلیٰ فنکاری اور ایک خاص ذہنیت کی وجہ سے ان آرٹ فلموں کا دور اور عوام کے درمیان ناپسند کیے جانے کی وجہ سے جلد ہی ختم ہوگیا۔ لیکن اس بے لاگ تبصرہ کے ساتھ کہ فلمیں خالص تفریح کے لیے ہوتی ہیں، اس میں سماجی سوال اور اس پر غور کرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ حالانکہ اس دور کی 'انکور'، 'آکروش'، 'پار'، 'دامل' جیسی فلمیں یادگار ہیں، لیکن ان میں سے کئی نے سنیما گھر کا پردہ تک نہیں دیکھا۔

بنیادی سماجی حقیقت کو محسوس کرنا اور اس کو انسانی پس منظر میں ہر طرح کے فن میں متحرک کرنا ضروری ہے، اس تحریبی کہانی کی دور کے بعد بھی سرگرم انقلابی عوامی کہانی کے شکل میں غیر حقیقت پسند کہانی کا دور جتنی جلدی ختم ہوگیا، اس سے بھی زیادہ سرعت سے خود ساختہ آرٹ فلموں کا دور ختم ہوگیا کیونکہ فلمیں سیدھے سیدھے عوام سے جڑتی ہیں۔ اس لیے ان پر ردعمل فوراً ظاہر ہوجاتا ہے۔ کم مدت کے لیے ہی سہی، حقیقت پسندی اور سماجی فکر کی فلمیں بنانے والے گمراہ تو ہوئے ہی، ان لوگوں کے ذریعے تجارت کے نام پر برہنگی اور مار دھاڑ والی فلمیں بنائی جانے لگیں۔ ایسا لگتا ہے اب ان ہی کا دور ہے۔

ادب کے علاوہ آرٹ اور فلم میں ذاتی تجربہ اور تجزیہ سے گزرتے ہوئے ایک متوازی فکر کے ساتھ تخلیقیت کی تعمیر ممکن ہے۔ تجارتی، غیر تجارتی یا آرٹ فلم اور بمبیا فلم ایسی تقسیم کی لکیریں مٹنے لگی ہیں۔ عام روش سے ہٹ کر کوئی سماجی انقلاب کوئی فن یا ادبی تحریک کامیاب اور بامعنی نہیں ہوسکتی، جب تک اسے عوامی قبولیت کے لائق اور متاثر کن نہ بنایا جائے۔ عام روش کی فلم کہیں یا تجارتی سنیما، اس میں بھی بامعنی سماجی سروکار اور مسائل کو پیش کیا جاتا ہے، عوام کے مابین خیال پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ایک خود ساختہ عام بمبیا فلم میں ایک جاگیردار گھرانہ ہے، اس کے یہاں یکے بعد دیگرے دو لڑکیوں کی پیدائش کے بعد تیسری مرتبہ بھی لڑکی پیدا ہوتی ہے، لڑکی کا جاگیردار باپ اپنی گھریلو نوکرانی کو اس کے قتل کے لیے حکم دیتا ہے، نوکرانی بچی کو لے کر اپنے گھر چلی جاتی ہے اور نہایت خاموشی سے اس کی پرورش اپنے گھر میں کرتی ہے۔ آخرکار ایک طویل جدوجہد کے بعد وہ باصلاحیت اور پراعتماد خاتون کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ نسوانی بازیافت کا یہ موضوع کیا ترقی پسند نہیں کہا جاسکتا؟ کیا اس لیے کہ اسے خود ساختہ بمبیا فلم کے ذریعے پیش کیا گیا ہے اس کی اہمیت کو کمتر گردانا جائے۔ بعد کو ایسے ہی موضوع پر مہیش بھٹ کی ہدایت میں 'تمنا' فلم بنی، اس اعلان کے ساتھ کہ سچے واقعے پر منحصر ہے، نوزائیدہ بچے کا قتل ہمارے سماج کی بہت بڑی لعنت ہے، 'اردھ ستیہ'، 'ماچس'، 'ہوتو تو' جیسی عام روش کی اہم فلمیں ہیں، یہ فلمیں مختلف سماجی مسائل اور مثالوں کو نظر کے سامنے موثر طریقے سے پیش کرنے میں کامیاب ہوئیں۔

راہی معصوم رضا نے فلم کا مطالعہ بہت گہرائی سے کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ جس طرح اچھا ادب اور برا ادب ہوتا ہے، اس طرح اچھی فلمیں اور بری فلمیں بھی ہوتی ہیں، فلم کا تعلق بالخصوص ہدایت کار سے ہوتا ہے، لیکن راہی نے یہ بھی دیکھا کہ فلم ایک کمرشیل آرٹ ہے، یہاں زیادہ سرمایہ لگتا ہے اور اس سرمایہ کو وصول کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس لیے اکثر سماجی فکر و نظر رکھنے والے فلم ساز کاروباری دباؤ کے تحت سمجھوتہ بھی کرتے ہیں، اور عوام کی پسند کو فوقیت دینے لگتے ہیں، بمل رائے 'مدھومتی' میں بقائے دوام کی کہانی کہنے لگتے ہیں، تو کبھی سمجھدار فلم ساز و ہدیت کار بھی جاگیردارانہ رسم و رواج کو مثالی عورت کے کردار میں پیش کرنے لگتے ہیں۔

اس کے باوجود فلم، زمانے کو پردے پر لے آنے اور اس کے ذریعے سماجی پیغام دینے کی اہل ہے، (جو کبھی کبھی مذہب اور سماج کے خود ساختہ ٹھیکیداروں کے لیے پریشانی کا سبب بن جاتا ہے) یہی (تجارتی پہلو) فلم کی طاقت بنتی ہے۔ سماجی حقیقت کے مختلف پہلو رو پہلے پردے پر بہ نفس نفیس موجود ہوتے ہیں، اسی لیے بڑی تعداد میں لوگ پیسہ خرچ کرکے ہیرو کی جدوجہد میں شامل ہوتے ہیں، اسے لڑتے مرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں، دکھی ہوتے ہیں، اس کی شکست کو اپنی شکست اور اس کی کامرانی کو اپنی فتح تسلیم کرتے ہیں۔ (ص42)

یہیں پر کہیں عام آدمی فلم کے ہیرو سے رابطہ قائم کرتا ہے، وہ اس کو اپنے جیسا ہی لگتا ہے، جو آخر میں اکیلے ہی سماج سے لڑ رہا ہے، مابعد جدیدیت بھی تو اپنے عہد کی اکیلے شخص کی شکل میں ترجمانی کرتی ہے، اجتماعی اور سماجی

جدوجہد کا فلسفہ تو سماجوادی فکر کا ماخذ ہے آج گلوبلائزڈ دنیا کے سماجی نظام میں آدمی تنہا ہے، وہ مکمل اکائی ہے، اس کی جدوجہد بھی ذاتی ہے، یہ تنہا مجبور آدمی رو پہلے پردے پر پورے نظام سے ٹکرا جاتا ہے، اور جب کامرانی اس کے حصے میں آتی ہے، تو زندگی کے مختلف مورچوں پر جدوجہد کررہے عام آدمی کے لیے بہت بڑی راحت ہوتی ہے، چاہے وہ کچھ گھنٹوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ ہیرو کی شکل میں اسے ایک رول ماڈل ملتا ہے، یہ رول ماڈل قطعی حقیقی نہیں ہے، مثبت بھی نہیں، لیکن سماجی حالت اور عام آدمی کی سماجی جدوجہد کی سچائی سے عبارت ہے۔

راہی اس ضمن میں کہتے ہیں ''اگر پچھلے (آٹھ دس) برسوں کی فلموں کا جائزہ لیں تو ایک حیران کن سچائی سامنے آتی ہے، سچائی یہ ہے کہ قانون اور قانونی شعبوں پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا ہے، اب مجرمانہ ذہنیت کے لوگ ہماری فلموں کے ہیرو ہونے لگے ہیں۔'' (ص41)

'شعلے' فلم کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''سوال یہ ہے کہ شعلے کا ہیرو پولس کے پاس کیوں نہیں گیا، خود پولس افسر (لیکن ایماندار) ہوتے ہوئے بھی وہ پولس کے پاس اس لیے نہیں گیا کہ پولس عوام کی نگاہوں سے گرچکی ہے، پولس ڈاکوؤں سے لڑتی بھی نہیں، وہ اس سے رشوت لیتی ہے اور لوٹ کے مال میں اپنا حصہ لگاتی ہے کیونکہ پولس خود مجرمانہ ذہنیت کی ہے ... اس سماجی مسئلے کا حل سنسر بورڈ کے پاس تو نہیں لیکن ہمارے سیاسی اور سماجی ڈھانچے کے پاس ہے۔'' (ص42)

راہی اس کو بدلتے سماجی منظر اور ذہنی رویہ کا مظہر تسلیم کرتے ہیں، 'دو بیگھہ زمین' میں کسان مزدور بنا، بیچارہ ہیرو 'زنجیر' کا اینگری مین ہے جو 'دیوار' تک آتے آتے مافیا ڈان بن چکا ہے۔ مافیا ڈان آج معاشرے کا سب سے زیادہ پسندیدہ ہیرو ہے۔ 'مدر انڈیا' کا ایسا ہی ہیرو ماں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے، 'مجھے جینے دو' میں وہ ہتھیار رکھ دیتا ہے۔ 'دیوار' کا ہیرو مجرم بن کر خود کو تسلیم کرواتا ہے۔ فلم 'بازی گر' کا ہیرو آخرکار کولڈ بلڈیڈ مرڈرر بن کر اپنی معشوقہ کو بھی نہیں بخشتا، قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ ہیرو جب مرتے ہیں تو پورے سنیما گھر کے ناظرین کی ہمدردی اور لڑکیوں کے آنسو اس کے ساتھ ہوتے ہیں یہ مجرم ہیرو آج کے نئے سماج کے ہیرو ہیں۔ راہی بار بار سنیما اور تجارت کے رشتے کا ذکر کرتے ہیں، خالص تجارت کے ضمن میں 'ادب آرٹ' غائب ہو جاتا ہے اور صرف 'کمرشیل' رہ جاتا ہے، یہی وہ تجارت ہے جہاں عورت کا جسم بکتا ہے ... ضعیف العقیدہ مذہبی انسان بکتا ہے، پرانے جاگیردارانہ سماج کی طرح آج صرف طوائفیں ہی جسم نہیں بیچتیں، آج کے مارکیٹنگ سسٹم والے سماج میں بلیک منی اور دلال تہذیب نے ایک ایسی خود ساختہ 'ہائی سوسائٹی' یا عیش پرست طبقہ پیدا کیا ہے جہاں کوئی ممانعت نہیں کوئی حد نہیں، پیسہ ہی پہلا اور آخری دھرم ہے۔ اس سماج میں جسم کا مذہب سیدھے سیدھے تجارت اور کنزیومر سسٹم یعنی صارفی سماج سے منسلک ہے، یہ سماج کبھی عورت کو راغب کرنے کے لیے اس فلسفے کی تشریح کرتا ہے کہ جسم نجات کا ذریعہ ہے جسم کی تجارت بازار کے لیے لازمی ہے اس لیے اس کو مشتہر کرنا بھی ضروری ہے۔

فلم میں اسی تجارت اور بازار کے ذریعے عورت کے جسم کو خاطر خواہ طریقے سے پیش کرتا ہے۔ یا پھر کبھی ہندو سوشل فلم یا مسلم سوشل فلم دکھائی جاتی ہے جس کا بازار چل نکلا اسی طرف فلم دوڑ پڑی، یعنی ہندو مسلم سماج بھی بازار بن گئے۔ اگر ایک فلاپ ہوا تو دوسرا سماج حاضر ہے،

یہ تقسیم خطرناک ہے۔ راہی کہتے ہیں کہ تاجر فلم ساز یہ نہیں سمجھنا چاہتا ہے کہ کہانی اچھی ہوگی تو فلم بھی اچھی تیار ہوگی، صرف جسم کی نمائش، بوسہ اور ہیجانی رقص سے فلم نہیں چلتی۔

ایک اور خطرے کی طرف راہی اشارہ کرتے ہیں کہ مذہبی ضعیف الاعتقادی ناظرین پر تھوپی جاتی ہے، جنتر منتر و جادو ٹونا اور مذہبی کرشموں کی وجہ سے ہماری فلمیں ہندو یا مسلمان ہوتی جارہی ہیں، ہندو اور مسلمان کی شناخت الگ ہورہی ہے، کم از کم ہندوستان کے لیے یہ چیز خطرناک ہے، دانشور حضرات کو اس نظریے کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے'' (ص45) راہی کہتے ہیں کہ دیومالائی فلمیں پہلے بھی بنتی تھیں، لیکن ذمے دار فلم ساز انھیں نہیں بناتے تھے، دیومالائی فلمیں اسٹنٹ فلم کی طرح تیسرے درجے کے لوگوں کے ہاتھوں میں تھیں، عیاری اور ضعیف الاعتقادی کو ذریعہ بنا کر مذہبیت، سماج اور سیاست سے اقتدار کا کھیل کھیل رہی ہے۔ مذہب بھی تجارت بن گیا ہے اور تجارت سے دولت اور اقتدار دونوں حاصل ہوتے ہیں۔

راہی کہتے ہیں 'دیوار' بنائی یش چوپڑہ نے 'کرم' بنائی بی آر چوپڑہ نے اور 'بیراگ' کے ہدایت کار ہیں اجیت سین۔ 'دیوار' کے ہیرو ہیں امیتابھ بچن، 'کرم' کے ہیرو ہیں راجیش کھنہ اور 'بیراگ' کے ہیرو ہیں دلیپ کمار ... دیوار میں 786 'بلا' بیراگ میں شیو کے ناگ کے ڈس لینے سے پیدائشی اندھے کو آنکھ مل جانا، کرم میں ڈاکٹروں کے جواب دے دینے کے بعد ایک بھجن کے بعد بھگوان شنکر کی مورت سے روشنی کا نکلنا، سفر کرنا اور مرتے مرتے ہیرو کے جسم میں داخل ہو جانا، جس کی وجہ سے ہیرو کا بچ جانا وغیرہ۔ 'امر اکبر اینھونی' میں سائیں بابا کا کرشمہ، نروپا رائے کو غنڈوں سے بچاتا ہے، راہی کہتے ہیں کہ ان پڑھے لکھے مشہور ہدایت کاروں اور اداکاروں کی وجہ سے تیسرے درجے کی سطح سے اوپر اٹھ کر فلمیں صف اوّل میں شمار کی جانے لگیں۔'' (ص44)

راہی سوال کرتے ہیں کہ ان فلموں کو لکھنے اور بنانے والے یہ اداکار پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ ہیں ... تو آخر یہ لوگ ایسی فلمیں کیوں بنا رہے ہیں کیونکہ ان سب لوگوں کے لیے فلم ایک تجارت ہے اور بازار میں وہی اشیا لے آئیں گے، جس کا مصرف ہوگا، یعنی ''بات پھر وہی آگئی کہ بازار میں، سماج میں اور سماج کے باشعور طبقے میں اس سماج مخالف، عوام مخالف برتاؤ کی مخالفت میں آواز نہیں اٹھائی گئی تو تاجرانہ فلمیں عوام کی سطحی ذہنیت کا فائدہ اٹھائیں گی ہی۔ ایسی طاقتیں مذہب اور ریاکاری کے نوٹ کو اتنا چلائیں گی کہ بازار میں کوئی سکہ نہیں رہ جائے گا۔'' (ص45)

اپنی موت سے تقریباً چار مہینے قبل 25 نومبر 1991 کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں خطبہ دیتے ہوئے راہی نے کہا کہ فلم کو باقاعدہ ادبی نصاب میں ایک صنف کے طور پر شامل کیا جانا چاہیے، جس طرح ادبی تنقید کا پیمانہ ہوتا ہے اس طرح فلمی تجزیہ کے لیے پیمانوں کا تعین بھی اکادمی سطح پر ہونا چاہیے، فلم کی سماج میں رسائی چونکہ لکھے ہوئے لفظ سے کہیں زیادہ ہے، اس لیے ادب اور سماجیات جیسے موضوع فلم جیسی موثر صنف کو نظرانداز نہیں کرسکتے، اس لیے اسے تعلیم و تفہیم کے طور پر قبول کرکے ادبی نصاب میں شامل کرنا ضروری ہے۔

شاعری ہو یا کہانی، ادب میں مصوری ایک لازمی صفت کی حیثیت رکھتی ہے۔ راہی کے خیال میں یہ یونیورسٹیوں کا فرض ہے کہ ادب پڑھتے اور پڑھاتے وقت قاری کو تصورات کی مصوری کرنا سکھائیں۔ سنیما لکھے لفظ کو مناظر کے طور پر جسم عطا کرتا ہے۔ ناظر ان

چلتی پھرتی پرچھائیں اور کرداروں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ سب کے ساتھ ہنستا ہے روتا ہے، تالیاں بجاتا اور قہقہے لگاتا ہے یہ سب اجتماعی ردعمل کا حصہ ہوتے ہیں، اس لیے یہ سماجی نفسیات کے مطالعے کا موضوع ہے۔

ادب کی سماجی توجیہ کو نشان زد کرتے ہوئے راہی کہتے ہیں کہ ادیب اور اداکار کا ایک نظریہ (پرس پیکٹو) ہوتا ہے جب کوئی تصنیف دیتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی قاری بھی ایک نظریہ ہونا چاہیے۔ اسی طرح ناظر کے نظریہ کو بھی اہمیت دینی چاہیے۔ لیکن ادب کے قاری اور سنیما کے ناظر کی ٹریننگ کون کرے گا؟ اس لیے راہی کہتے ہیں کہ یہ ذمے داری جتنی کالجوں، اسکولوں کو ادب کے تئیں نظریہ تعمیر کرنے کی ہے اتنی ہی ضرورت سنیما کے ناظر کے نظریہ کو تعمیر کرنے کی ہے، اس لیے وہ بار بار سفارش کرتے ہیں کہ دانشور فلم کی طرف پیٹھ کرکے نہ بیٹھ جائیں۔

فلم کو ادب کے نصاب میں شامل کر لینے کے بعد جس طرح ہم ادب اور دوسرے اصناف کی تعریف کرتے ہیں اسی طرح سنیما کی بھی تعریف کرنا ہوگی۔ اس کی زبان اور تکنیک کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ ''آج جس طرح ہمارے اساتذہ، غزل، قصیدہ، کہانی، ناول کا طریقۂ تدریس سکھاتے ہیں، اسی طرح سنیما دیکھنا، سمجھنا اور سیکھنا پڑے گا۔ یہ طے کرنا پڑے گا کہ فلم کا مصنف کون ہے جو اسکرپٹ لکھتا ہے یا جو کیمرہ کے قلم سے تصویری رسم الخط میں اسی اسکرپٹ کو دوسری مرتبہ لکھتا ہے، یا وہ اداکار اور اداکارائیں جنھوں نے فلم میں کام کیا ہے، یا وہ ہدایت کار جس نے فلم سازی کے دوران اس کے فکری سرچشموں کو روانی دی ہے۔'' (ص 21)

جب ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ سنیما ادب کی ایک صنف ہے تو اسے بھی انھیں تقاضوں کو پورا کرنا چاہیے جو دوسرے ادبی اصناف کرتے ہیں۔ راہی اس ضمن میں کہتے ہیں کہ ادیبوں اور دانشوروں کو کسی بمل رائے، ستیہ جیت رے، یا کسی گوند نہلانی کو بھی وہی اعزاز دینا چاہیے، جو کسی غالب، میر یا تلسی کو دیتے ہیں۔ اگر ہم نے یہ قبول نہیں کیا تو ''سنیما ایک جنگل کی آگ کی طرح پھیلے گا اور سماج میں آگ لگا دے گا۔'' (ص 24)

مجھے یاد آتا ہے، بہت پہلے دہلی یونیورسٹی کے جلسہ اسناد میں مہمانِ خصوصی کے طور پر بلراج ساہنی جی کو مدعو کیا گیا تھا، وہ ایک فلم اداکار ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ فنکار تھے، وہ پڑھے لکھے اور ادب کے سنجیدہ پارکھ تھے، اپٹا سے بھی وہ ایک مدت تک منسلک رہے، اس وقت کچھ لوگوں نے واویلا مچایا تھا اور تعلیمی ادارے میں فلمی دنیا سے منسلک دانشوروں کو مدعو کرنے پر سوالیہ نشان قائم کیا تھا، ہوسکتا ہے یہ حوالہ انھیں بھی یاد ہو، اس لیے راہی بار بار کہتے ہیں کہ طالب علموں کو اچھی اور بری فلموں میں فرق بتانا ضروری ہے۔ ادب بڑے پیمانے پر جو نظریہ نہیں دے سکتا فلم وہ کام بخوبی کرسکتی ہے۔

اسٹیج پر کھیلے جارہے ڈراموں کے مقابلے میں سنیما کو وہ ناظرین تک رسائی حاصل کرنے میں بہتر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ڈرامہ روشنی اور صدا کا پابند ہو کر رہ جاتا ہے، لیکن سنیما نے ان حد بندیوں سے خود کو آزاد کیا ہے، ''سنیما لانگ شاٹ سے زوم (بڑے مناظر کو مختصر) کرکے اداکاروں کی آنکھوں کی پتلیوں تک کو دکھانے میں کامیاب ہوگیا ہے، آواز کا دباؤ ہٹ جانے سے کرداروں میں مکالمہ معمولی اور فطری انداز میں کہے جانے لگے اور تو اور کردار کو سرگوشی ... کرنا بھی آگیا۔'' (ص 27) یہی وجہ ہے کہ کردار چلتے پھرتے اپنے درمیان کے معلوم ہی نہیں ہوتے بلکہ ناظرین کو خود اپنے ساتھ شریک بھی کر لیتے ہیں۔

حالانکہ راہی ٹیلی ویژن کے کردار کو سنیما سے الگ تسلیم کرتے ہیں، چونکہ یہ تصور ابھی بھی قائم ہے کہ ٹیلی ویژن ایک تفریحی ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ علم و سائنس اور تعلیم کے میدان میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ بات بہت حد تک صحیح ہے لیکن خصوصیت اس کی بھی تفریح اور خبر رسانی کے میدان میں ہی ہے۔ محلوں سے لے کر جھونپڑپٹیوں تک ٹیلی ویژن کی موجودگی اور عام آدمیوں کے بیڈروم تک اس کا داخل ہونا اس کے سماجی کردار کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔

راہی ٹیلی ویژن کو سنیما کے مساوی ادبی اعزاز دینے کو تیار نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وسعت کے فقدان میں ٹی وی ناظرین کو کوئی نظریہ نہیں دے سکتا، کیونکہ اس میں لانگ شاٹ کا فقدان ہے۔ ٹی وی پانی کی ایک بوند کو سمندر کی شکل میں (کلوز اَپ کے ذریعہ) پیش تو کرسکتا ہے لیکن نہ تو یہ پورے سمندر کو وسعت دے سکتا ہے، اور نہ ہی اس بوند کا سمندر سے رشتہ دکھا سکتا ہے۔ ''وہ (ٹی وی) دودھ کی طرح ایک بوند کو اس وہم میں تو ڈال سکتا ہے کہ وہ دودھ کی ایک بوند نہیں بلکہ پوری جھیل ہے، مگر سنیما دودھ اور پانی ملے دودھ میں فرق کرسکتا ہے۔'' (ص 21)

ادب اور ثقافت کے سوال پر گفتگو کرنے اور اس کی معنویت اور رسائی عام آدمی تک آج بہت ضروری ہے، مذہب اور فرقہ پرستی کی بنیاد پر بھارت کی مشترکہ تہذیب اور سماج کو توڑنے اور بکھیرنے کی کوشش جس تیزی سے ہو رہی ہے، مگر مخالفت کی آواز کافی دھیمی نظر آرہی ہے۔ رسائل و جرائد کا ایک طبقہ، اور ہمارے دانشوروں کا بھی ایک حصہ کالے زمانے کی کالی آندھی کے ساتھ بہہ نکلا ہے۔ صارفی سماج میں موجود لالچ اور خود غرضی کی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ گجرات میں ہونے والا مسلم فرقے کا کھلا قتل عام دانشوروں اور ادیبوں کو مبہوت کیے ہوئے ہے، احتجاج کی آواز الگ الگ جماعتوں سے اٹھ رہی ہے، دہشت گردی اور فرقہ وارانہ تشدد کی سیاست کو ان گہری انسانی سطح پر صرف ادب کے ذریعے ہی سمجھا جاسکتا ہے، ایسے میں منی رتنم کی 'روجا' اور 'بامبے' گلزار کی 'ماچس' اور 'ہوتو تو' یاد آرہی ہیں، 1992 کے بعد بامبے تیار ہوئی۔ کیا پھر کوئی منی رتنم گجرات سانحہ پر فلم بنائے گا۔ مجھے یاد ہے 'بامبے' کے دوران پورے سنیما گھر میں گہرا سناٹا تھا۔ عام طور پر ہونے والے شور شرابے اور ہو ہلہ کا نام و نشان نہیں تھا۔ تمام ادب ایک طرف اور ایک فلم ایک طرف— اور منی رتنم کے لیے بھی راہ آسان نہیں تھی۔

آج ادیب اور اسٹیج سے منسلک فنکار دھیرے دھیرے سنیما کے میدان میں مداخلت کر رہے ہیں۔ معیاری رسائل میں ادبی تجزیہ کی طرح سنیما پر تجزیہ اور بحث شروع ہوچکی ہے۔ سنیما کی کہانی اور اس کے مثبت غیر حقیقی خطروں اور پیغام پر گفتگو ہو رہی ہے۔ یونیورسٹیز میں ادب کے نصاب میں سنیما کو کب شامل کیا جائے گا، یہ تو ادب کے غیر دلچسپ دقیانوسی اساتذہ پر منحصر ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ حاشیے سے ادب کی عام روشنی میں سنیما کو شامل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اچھے اور برے سنیما کی پہچان، اس کے تجزیاتی عناصر کو بدلتے پیمانوں پر مسلسل گفتگو ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ سنیما پر گفتگو اور تبصرہ صرف رسمی نہ ہو اور نہ ہی اداکاروں کی تعداد تک (ان کے مقام طے کرنے کے لیے) محدود رہے۔ ادب پر ہونے والی سنجیدہ تنقید کی طرح سنیما کے جائزے میں اس کی عوامی دلچسپی کے ساتھ ساتھ اس کی سماجیاتی معنویت کے عناصر بھی شامل ہوں۔ اس پر مسلسل سنجیدگی سے غور کرنے اور تصنیف کے ساتھ سمت کے تعین کی بھی ضرورت ہے۔

آج کے اس مشکل دور میں ادب، سماج اور سنیما کے پورے پس منظر میں راہی ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور ہمارا کام آسان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

■

ماخذ: ہندوستانی ادب کے معمار: راہی معصوم رضا، مصنف: کنور پال سنگھ، مترجم: محمد ہادی رہبر، ناشر: ساہتیہ اکادمی نئی دہلی

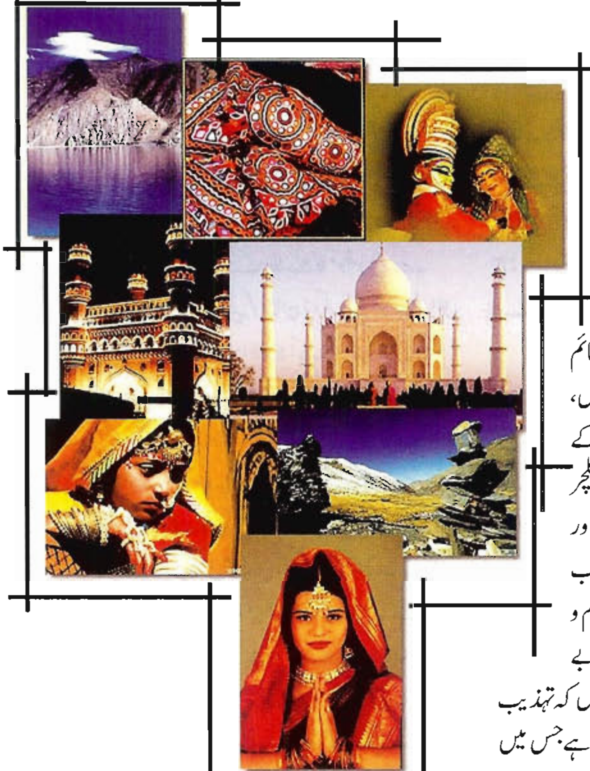

مناظر عاشق ہرگانوی

ثقافت اور تہذیب میں فرق

عام طور پر اردو میں 'ثقافت' اور 'تہذیب' ہم معنی الفاظ ہیں اور انھیں ایک ہی مفہوم میں ادا کیا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ دونوں میں بنیادی فرق ہے۔

اگر لفظ 'تمدن' کو بھی سامنے رکھیں تو تینوں الفاظ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات تہذیب کو تمدن کا مترادف سمجھا جاتا رہا ہے جب کہ انگریزی لفظ Culture ثقافت ہے، Civilization تہذیب ہے اور Urban Culture تمدن ہے۔

لیکن ان اصطلاحوں کے ابہام کو شاید بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ وہ کون سے عناصر ہیں جو ثقافت کو تہذیب سے اور تہذیب کو ثقافت سے جدا کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ثقافت، کسی خطۂ زمین کے فنون لطیفہ (یعنی مصوری، سنگ تراشی، رقص و موسیقی اور شاعری وغیرہ) کی پیداوار ہیں جو بجائے خود اس خطۂ زمین کے مزاج اور اس کی آب و ہوا کے اثرات کے تحت خلق ہوتے ہیں۔ ثقافت پودے کی طرح اپنی جنم بھومی سے جڑی ہوتی ہے۔ جب کہ تہذیب خوشبو کی طرح نہ صرف اپنی سرزمین پر پھیلتی ہے بلکہ اس کی سرحدوں کو عبور کرکے دور دور تک بھی جاتی ہے اور اس سفر کے دوران، ہر اُس خطے کے کلچر کی خوشبو پر اثرانداز ہوتی ہے جو اس کے راستے میں آتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ثقافت اور تہذیب کو ایک ہی سکے کے دو رخ قرار دیا ہے۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ ثقافت، تخلیقی رخ ہے اور تہذیب تقلیدی رخ، تہذیب مزاجاً رجحانِ نقل (یعنی میم) کے تابع ہے۔ ماڈل کے مطابق مصنوعات تیار کرنا اس کا وظیفۂ حیات ہے۔ وزیر آغا کے نزدیک کلچر اور ثقافت کا لغوی مفہوم 'کاٹ چھانٹ' ہے۔ جب مالی اپنے پھولوں کی کیاری کو جڑی بوٹیوں سے پاک صاف کرتا ہے، پودوں کی تراش خراش کرتا ہے اور پھولوں کو کھلنے کے مواقع فراہم کرتا ہے تو گویا کلچر کے سلسلے میں پہلا قدم اٹھاتا ہے۔ خود انسان کا باطن بھی ایک جنگل کی طرح ہے جو جذبات کی خارزار جھاڑیوں سے اٹا پڑا ہے اور جس میں سے راستہ بنانا بڑے جان جوکھم کا کام ہے۔ انسان کے وہ تخلیقی اقدامات جن کی مدد سے اس نے اپنی ذات کے گھنے جنگل میں راستے بنائے اور پھر ایک مسلسل تراش خراش کے عمل سے ان راستوں کو قائم رکھا، کلچر کے زمرے ہی میں شامل ہیں، دراصل کلچر اور تہذیب میں فرق ہے جو بیج کے مغز اور اس کے چھلکے میں ہوتا ہے۔ چنانچہ کلچر بنیادی طور پر کومل، سیال، قوتِ نمو کا منبع اور سماجی ارتقا کا محرک ہے جب کہ تہذیب اصولوں اور قدروں، قوانین اور ضوابط، رسوم و رواج کے تابع ہے اور اسی لیے بیضوی اور بے لچک ہوتی ہے۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب روایات، رسوم، قوانین اور آداب کا وہ جھولا ہے جس میں سوسائٹی آرام کی نیند سوتی ہے۔ اور کلچر وہ روحِ بیدار ہے جو اس سوسائٹی کو خواب خرگوش سے جگاتی رہتی ہے۔

میتھیو آرنلڈ کہتا ہے کہ کلچر کی مثال ایسی ہے جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہو۔ اس میں شہد بھی ہوتا ہے اور موم بھی۔ شہد میں شیرینی بھی ہے اور غذا، دوا اور شفا بھی۔ چھتے میں جو موم ہوتی ہے اس سے منیر و...... شمع بنتی ہے۔ انسان کو نورِ علم اور شیرینی کردار دونوں کی ضرورت ہے اور کلچر کا لب لباب یہی دو عناصر ہیں۔ یہ بھی کہ تہذیب تربیت یافتہ فطرت کا نام ہے اور بہترین تہذیب وہ ہے جس کے اندر ہر فرد کو اپنی ممکنات کو معرضِ شہود میں لانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر ہوں۔

روسو کہتا ہے کہ انسان کو فطرت نے آزاد پیدا کیا تھا لیکن تہذیب و تمدن نے اسے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا دی ہیں۔

کارلائل اپنے دور کا جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ تہذیب تین عناصر پر مشتمل ہے۔ بارود، چھاپہ خانہ اور پراٹسٹنٹ (Protestant) مذہب۔ ان سب سے الگ اگر غور کیا جائے تو ثقافتی خزانوں کو چھ بڑے درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

فن تعمیر، مخطوطات اور خطاطی کے نادر نمونے، چھوٹی تصویروں کی نقاشی، سنگ تراشی، سفال سازی اور ذیلی فنون لطیفہ۔

ثقافت کی نمائندگی بعض چیزیں بہتر طور پر کرتی ہیں جن سے لوگوں کی شخصیت، روح اور احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ جس طرح جسم کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں آنکھ داخلی جذبات کا سب سے موثر طریقے پر اظہار کرتی ہے اسی طرح فنون کسی قوم کے چہرے کو جاندار اور ابلاغی بناتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کا کہنا ہے کہ ثقافت تین چیزوں سے عبارت ہے۔ مذہب، تاریخ اور جغرافیہ۔ اور تین چیزیں اسے نمو بخشتی ہیں یعنی دل، دماغ اور دھرتی۔

دل ماحول کی اشیاء اور تصورات کو محسوس کرتا ہے۔ دماغ سوچتا ہے، اشیا اور تصورات کی تراش خراش، آراستگی و پیراستگی اور نوک پلک سنوارنے میں مسلسل مصروف رہتا ہے اور دھرتی دیوی اور دماغوں محسوسات اور سوچ کے تبادلے اور امتزاج اور انھیں نت نئے روپ دینے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ جب سے انسانی معاشرے میں بستی، قبیلے یا دیس کے روپ میں منظم نگاری کا آغاز ہوا ہے، ثقافت کی بنیاد مذہب رہا ہے۔ کسی زمانے میں مذہب جادوگری اور اوہام کا دوسرا نام تھا۔ پھر آگ کی پرستش اور بتوں کی پوجا کا نام بنا اور اس کے بعد توحید کے تصور نے مذاہب کو نیا رنگ دیا۔ اس دوران سوچنے سمجھنے اور رہن سہن کے سارے پہلو مذہب کے تابع نہیں تھے تو کم از کم اس سے متاثر ضرور تھے۔ روحانی اور جذباتی زندگی کے پہلو بہ پہلو معاشی زندگی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں جغرافیہ کارفرما ہوتا ہے اور مذہب اور معاش جب مختلف مراحل سے گزرتے ہیں تو ان سے تاریخ بنتی ہے۔ زبانیں زیادہ ہوسکتی ہیں، زبان ایک ہو تو بنیادی ڈھانچہ ایک ہی رہتا ہے لیکن مختلف علاقوں میں اس کے انداز مختلف ہوتے

ہیں۔ زبانوں کی کوکھ سے ادب جنم لیتا ہے۔ پہلے لوک کہانیاں، پھر لوک رومانی، پھر لوک گیت اور اس کے بعد تحریری ادب۔ انسانوں کے میل جول سے اخلاقی قدریں ترتیب پاتی ہیں، روایات جنم لیتی ہیں۔ محبت کے بارے میں، شجاعت کے بارے میں، مہمان نوازی کے بارے میں۔ مذہب، معاش، جغرافیہ، ادب، تفریحات، اخلاقی اقدار اور روایات ان بندھنوں کا کام دیتے ہیں جن سے ایک خطے کے اندر رہنے والے قبائل اور شعور ایک قوم کا روپ لیتے ہیں۔ یہیں سے قومی تشخص جنم لیتا ہے۔ یہیں سے اس کی حفاظت کے لیے اتحاد و استحکام کے سوتے پھوٹتے ہیں اور ثقافتی شناخت ایک اہم عنصر بن جاتی ہے۔

تاریخ کی وجہ سے اور وقت کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے تہذیب اور ثقافت کے مظاہر کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ ہڑپا اور موہن جوداڑو میں تاریخ ہے۔ حالانکہ ان میں تہذیب کی سانس پوشیدہ ہے۔ ڈاکٹر ممتاز حسن نے فن تعمیر کی مثال دیتے ہوئے موہن جوداڑو اور کوٹ ڈیجی کو تہذیب کے غیر معمولی آثار میں شمار کیا ہے۔ ان کے بعد بھیر نامی ٹیلہ ہے جو قدیم ہخامنشی دور (قبل مسیح) کے ایرانی باشندوں کی آبادی تھی۔ سیرٹوپ، جو یونانیوں کی بستی تھی اور سیر سکھ جو وسطی ایشیا سے آنے والے قدیم کشن باشندوں کا شہر تھا ان مقامات پر یونانی طرز کی کئی عمارتیں، بودھوں کی خانقاہیں اور زرتشتی عبادت گاہ بھی تھی۔ ٹیکسلا کی یادگاروں میں پارتھیا نامی قدیم (شمالی، مشرقی، ایرانی) علاقے کا رنگ بھی نمایاں ہے اور قدیم یونانی علاقے 'ڈورس' اثر بھی۔ اس علاقے سے تعلق رکھنے والے لوگ پارتھیا والوں سے پہلے آئے تھے۔ ٹیکسلا کے دور کے بعد فن تعمیر کی ترقی کے اور بھی کئی مرحلے آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم مسلمانوں کے دور میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ اسلام میں دین اور دنیا الگ اکائیاں نہیں ہیں بلکہ دونوں ایک وحدت ہیں۔ ایک ہی صداقت کے دو پہلو ہیں۔ اس زاویے سے اسلامی ثقافت میں علم، حکمت کی جستجو، عقل اور تجربے اور سائنسی انداز فکر سے شعور ذات کی تکمیل کا سامان فراہم ہونا شامل ہے۔ دراصل قوموں کی حیات ثقافت سے وابستہ ہوتی ہے۔ قومیں ثقافت کی زندگی کا باعث بنتی ہیں مگر ثقافت کی ترویج قوموں کے عروج کا باعث بنتی ہے۔ جس ثقافت پر مسلمان ناز کرتے ہیں وہ خلافت راشدہ کے بعد پیدا ہوئی، رسول اللہؐ کے زمانے میں جو سانچے بنے تھے بعد میں ان میں تبدیلیاں ہوتی گئیں۔

ان سب کے باوجود ثقافت اور تہذیب کی حتمی تعریف اور تفہیم ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر رہ گئی۔

اردو کے نقادوں اور دانشوروں سے بات آگے بڑھائیں تو ڈاکٹر وزیر آغا نے دونوں کے فرق پر غور کیا ہے کہ کلچر اور تہذیب میں وہی فرق ہے جو بیج کے مغز اور اس کے چھلکے میں ہوتا ہے۔

اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کلچر گاڑھی خوشبو کا وہ حلقہ ہے جس کے مرکز میں کوئی پھول ہمیشہ موجود ہوتا ہے مگر جب ہوا چلنے پر یہی گاڑھی خوشبو رقیق سی ہو کر چاروں طرف پھیل جاتی ہے تو تہذیب کہلاتی ہے۔ یہ تمثیل اس بات کا اعلان ہے کہ کلچر مغز ہونے کے باعث تخلیق کا منبع ہے۔ دوسرے لفظوں میں معاشرے کا تخلیقی رخ اس کا کلچر ہے اور یہی تخلیقی رخ معاشرے کی ساری توانائی اور نکھار کا ضامن ہے جب کہ تہذیب کی حیثیت اس محافظ کی سی ہے جو چھلکے کا زرہ بکتر پہن کر مغز کی حفاظت کرتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے وضاحت سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے کہ عربی زبان میں لفظ تہذیب کے لغوی معنی درخت کو تراشنا، کاٹنا اور اس کی اصلاح کرنا ہیں۔ فارسی زبان میں اس کے معنی ہیں آراستن و پیراستن۔ پاک و درست اصلاح نمودن۔ یہ لفظ مجازی معنی میں شائستگی کے استعمال ہوتا ہے جس میں خوش اخلاقی، مزاج کی نرمی اور اطوار کردار و گفتار کی شائستگی بھی شامل ہے۔ انسان جس طور پر اپنی معاشرت اور اپنے اخلاق کا اظہار کرتا ہے وہ اس کی تہذیب ہے، اردو زبان میں یہ لفظ ان ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ثقافت کے معنی علوم وفنون و ادبیات پر قدرت و مہارت ہے۔ گویا یہ لفظ ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے جن کا واسطہ ذہن سے ہے۔ جرمن ماہر عمرانیات بارتھ نے لفظ کلچر کو ٹیکنولوجی کے معنی میں استعمال کیا جس کا مطلب تھا آلات اور مشینوں کے ذریعے انسان کا فطرت کو تسخیر کرنے کا عمل۔ اور لفظ سویلزیشن کے معنی تھے معاشرے کا انسانی جبلتوں میں رد و بدل اور تغیر و تبدل کرنے کا عمل۔ امریکی ماہر عمرانیات نے ان معنی کو الٹ دیا اور تہذیب کو کلچر کے معنی میں اور کلچر کو تہذیب کے معنی میں استعمال کیا۔ رومنوں کے زمانے میں اور پھر اٹھارہویں صدی تک سویلزیشن کا لفظ شہروں کی تہذیب کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اسپنگلر نے لفظ سویلزیشن کو مخصوص معنی میں استعمال کیا۔ اسپنگلر، سویلیزیشن کو کسی کلچر کی وہ زوال پذیر، منجمد اور غیر تخلیقی منزل کہتا ہے جب اس کا ارتقا اور قوت نمو رک جاتی ہے۔ اسپنگلر کے نزدیک سویلزیشن کا کلچر سے وہی تعلق ہے جو عقل و ذہن کا روح سے ہے۔ سویلزیشن کسی کلچر کی آخری منزل ہے جس میں وہ منجمد ہو کر مردہ ہونے لگتا ہے۔ ٹوئن بی نے اسپنگلر کے نقطۂ نظر کو رد کر کے مغرب کی تہذیب کو نیا حوصلہ دیا۔ میتھیو آرنلڈ، کروشیر، فلپ بیگی، ایلیٹ اور وہائٹ وغیرہ نے اپنے اپنے نقطۂ نظر میں معنی اور رویہ کے فرق کو ملحوظ رکھا ہے۔

جرمن ماہر عمرانیات بارتھ نے لفظ کلچر کو ٹیکنولوجی کے معنی میں استعمال کیا جس کا مطلب تھا آلات اور مشینوں کے ذریعے انسان کا فطرت کو تسخیر کرنے کا عمل۔ اور لفظ سویلزیشن کے معنی تھے معاشرے کا انسانی جبلتوں میں رد و بدل اور تغیر و تبدل کرنے کا عمل۔ امریکی ماہر عمرانیات نے ان معنی کو الٹ دیا اور تہذیب کو کلچر کے معنی میں اور کلچر کو تہذیب کے معنی میں استعمال کیا۔

سجاد نقوی نے کلچر اور تہذیب کو واضح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جس طرح اصل اور بہروپ میں حقیقت اصلی اور بہروپ مل جاتی ہے اسی طرح تہذیب بھی کلچر کا بہروپ ہے۔ بہروپ میں چکاچوند ہوتی ہے اور ظاہر بین اس سراب کو ہی حقیقت سمجھ بیٹھتے ہیں۔

تہذیب کے لفظ کے ساتھ درآمد برآمد کا تصور وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ ملکوں کے مابین فاصلے کے سمٹ جانے کی وجہ سے یہ جنس دنیا کے کونے کونے میں اپنے وجود کا احساس دلاتی نظر آتی ہے۔ اس طرح اب اس کی حیثیت بین الاقوامی ہے۔ اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے، آداب خورد و نوش، گفتگو کا پرتکلف انداز، فیشن، عریانی اور فحاشی اس کے نمایاں خد و خال ہیں۔ اسی تہذیب کو کلچر کے نام سے فنون لطیفہ اور خاص طور پر ادب میں پیش کیا گیا ہے۔ اور یہی صورت حال فلموں اور تفریحی پروگراموں کی ہے۔ کیا ان میں ہمارا کلچر پیش ہوتا ہے یا یہی بین الاقوامی تہذیب ہے؟

کلچر اور تہذیب کے فرق پر مزید غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ آج اکیسویں صدی میں ثقافت کی محافظ تہذیب نہیں ہے بلکہ تہذیب دور حاضر کی حقیقت ہے۔ دونوں کے معاملات و مسائل میں انتشار ہے۔ ایسا نظام فکر اور انداز حیات کے ٹکراؤ کی وجہ سے ہے۔ سیاسی، تاریخی اور جغرافیائی تبدیلیاں کلچر اور ثقافت کو متاثر کرتی ہیں، تہذیب کو نہیں۔ ہاں کلچرل رویے روشنی کے مینار تھے اور مستقبل میں بھی رہیں گے!

■

Dr. Manazir Ashiq Harganvi "Kohsaar"
Bhikanpur-3, Bhagalpur- 812001 (Bihar)

ہیر رانجھا

کیفی اعظمی

ہندوستان کو اپنی فلم 'نیچا نگر' سے پہلا بین الاقوامی ایوارڈ دلانے والے فلم ساز ہدایت کار و اداکار چیتن آنند کی 'ہیررانجھا' اب تک کی پہلی اور واحد فلم ہے جس کے تمام مکالمے منظوم تھے۔ ہندوستانی سنیما کے آغاز میں تھیٹریکل ڈراموں پر مبنی کچھ فلموں کے بعض حصے منظوم ضرور رکھے گئے، لیکن پوری فلم منظوم بنانے کا یہ پہلا تجربہ تھا جسے اردو کے مایہ ناز شاعر کیفی اعظمی نے کامیابی سے ہم کنار کیا۔ فلم کے منظرنامے کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں تھیٹر کا انداز اپنا کر ہر مکالمے کو مکمل مصرعوں میں نہیں لکھا گیا بلکہ جگہ جگہ ان مصرعوں کو توڑ کر حقیقی مکالمہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی کہیں تو ایک سے زائد کرداروں کے کئی مکالمے مل کر ایک مصرعہ بنتے ہیں اور کہیں ایک سے زائد مصرعوں سے ایک مکالمہ تشکیل دیا گیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ 'نیچانگر' بھی اردو کے مشہور فکشن نگار حیات اللہ انصاری کی کہانی پر مبنی تھی جس کا منظرنامہ خواجہ احمد عباس نے لکھا تھا اور 'ہیر رانجھا' کا منفرد تجربہ بھی اردو کے ہی حصے میں آیا۔ یہ منظوم منظرنامہ 'قومی اردو کونسل' نے شائع کیا ہے۔ (ادارہ)

بیک گراونڈ نیلا آسمان۔ اس پر دھواں چھایا ہوا ہے۔
میوزک ہے

راوی — دوستو! تم نے سنا ہوگا کبھی جھنگ کا نام
ایک مدت سے جہاں بہتا ہے دریائے چناب
وہیں بے دردوں نے اس طرح سے دو دل توڑے
یاد میں جس کی تڑپتا ہے ابھی تک پنجاب
درد پنجاب کے سینے سے چرالایا ہوں
چند ٹکڑے دلِ وارث کے اٹھالایا ہوں
درد کو کیسے سجایا ہے یہ جی جانتا ہے
جشن غم کیسے منایا ہے یہ جی جانتا ہے
کتنا خون اپنا جلایا ہے یہ جی جانتا ہے
آگ میری نہ سہی اس کا دھواں میرا ہے
ہیر۔ رانجھا کی کہانی ہے بیاں میرا ہے

(کیمرہ نیچے بنے دیوں پر آتا ہے، دیے کی لو سارے اسکرین پر پھیل جاتی ہے۔ ٹائٹل شروع ہوتے ہیں۔ ایک پیڑ کے پاس کھڑا رانجھا بانسری بجا رہا ہے۔ چاروں طرف دیکھتا ہے۔ پھر آگے بڑھ کر نکل جاتا ہے۔ پنگھٹ پر ایک لڑکی رسی تھامے کھڑی ہے۔ ہیر سہیلیوں کے ساتھ پنگھٹ پر۔ کوئی پانی کھینچ رہی ہے کوئی گھڑا مانجھ رہی ہے۔ لڑکی گھڑے میں پانی انڈیل رہی ہے۔ دوسری کو چھیڑ رہی ہے۔ رانجھا بانسری بجاتا ہوا پنگھٹ پہ جاتا ہے۔ لڑکیاں ٹھٹک کر دیکھنے لگتی ہیں۔)

ایک لڑکی — سن رہی ہے ہیری!
ایک اور لڑکی — ہٹ موئی تو ہی سن!
دوسری — ہائے مر جاؤں میں۔ کتنی پیاری ہے دھن!

تیسری — یہ حمیدہ تو پاگل ہے!
دوسری — چپ کر دئی...
ایک اور — دیکھ وہ آ گیا...
لڑکی — ہائے میں مر گئی
(رانجھا بانسری لیے لڑکیوں کی طرف دیکھ رہا ہے)
رانجھا — اومکھنوں...
(حمیدہ شرما کر منہ پھیرتی ہے۔)
رانجھا — اوہیریوں۔
(ایک لڑکی منہ موڑ کر کھڑی ہوئی ہے۔ رانجھا بانسری لیے کھڑا ہے)
رانجھا — اے سوہنیو...
(لڑکی سر جھکاتی ہے۔ رانجھا لڑکی کی طرف دیکھ کر کہتا ہے)
رانجھا — اے پیریوں
(لڑکی گردن اونچی کر کے اکڑتی ہے۔)
رانجھا — ملائی دِیے ڈونیو۔ اس جوانی کی خیرات دے
(لڑکیاں پنگھٹ پر۔ رانجھا کی طرف مڑ کر ایک کہتی ہے)
ایک — کیسا غنڈہ ہے
دوسری — اک ہاتھ دے۔ دیکھ ہم سے نہ کر مستیاں
مر گئیں کیا تیری بھابیاں۔
ایک دو بھی نہیں آٹھ ہیں، تب ہی تو اس کے یہ ٹھاٹ ہیں۔
تیسری — لالچی...
رانجھا — بس تیرے روپ کا
لڑکی — باولا...
رانجھا — حسن کی دھوپ کا
لڑکی — دیر ہوتی ہے جانے دے گھر
رانجھا — ہائے بل کھا نہ جائے کمر
لڑکی — دور
(لڑکی رانجھا کا کپڑا پکڑے سامنے کھڑی ہے)
لڑکی — بس دور رہ... تیرا ناس
رانجھا — مٹکا دے دے بجھا لوں میں پیاس
لڑکی — لے بجھا
پیاس کیا ڈوب مر، آج لیتی ہوں تیری خبر
رانجھا — ہاہاہا۔
(لڑکیوں کے بیچ میں رانجھا نظر آتا ہے۔ لڑکی گھڑا اٹھا کر چلنے لگتی ہے۔ رانجھا راستہ روکتا ہے۔ لڑکی مٹکا چھوڑ کر جاتی ہے۔ لڑکی بھابھی سے شکایت کر رہی ہے۔ بھابھی چلا کر سب کو اکٹھا کر لیتی ہے۔)

آواز — وے گئی۔
رانجھا — اس سے تو کم نہیں
لڑکی — آج اس نے حد کر دی ڈھٹائی کی
بھابھی — بڑی، منجھلی، چھوٹی، دئی نکی، سگن، کھیراں ادھر آؤ سنو رانجھا کی باتیں
(ایک عورت حقہ گڑگڑاتی اٹھتی ہے اور باہر جاتی ہے۔ ایک اور عورت ہاتھ میں کچی چپاتی لیے آتی ہے۔ دوسری کنڈے تھوپتی آتی ہے۔ ایک عورت حمیدا کے ساتھ کھڑی ہے۔ دوسری پاس آتی ہے اور گھیر لیتی ہے۔)
عورت 1 — کی۔ کی۔ ک۔ ک۔
حمیدا — کیسے بتاؤں
عورت 1 — کیا کہا اس نے؟
حمیدا — یہ تل تم دیکھتی ہو؟
عورت 1 — دیکھتی ہوں
حمیدا — چھو لیا اس نے۔
عورت 2 — تیرا دل چھو لیا...
تو چودھراین بن گئی کب سے، مجھے سب پوچھنے دے۔
عورت 1 — پوچھ... کیوں لڑتی ہے سب سے
عورت 2 — میری جوتی لڑے
عورت 1 — کل ہی خصم کی جوتی کھائی تھی
عورت 2 — اکڑتی کیوں ہے تو
عورت 1 — میکے سے تو ننگے پاؤں آئی تھی
عورت 3 — پڑے پیروں کی تم پہ مار؟ جھگڑا اپنا رہنے دو
عورت 1 — مزے کی بات کہنے آئی تھی یہ
عورت 3 — اس کو کہنے دو
عورت — کیا رانجھا نے تیرے ساتھ جو کچھ، سب سنا دے تو، تیرا تل ہی چھوا یا اور کچھ... ہم کو بتا دے تو
حمیدا — بہت کچھ۔ میرا پلو بھی۔
سب — اور؟
حمیدا — مری نازک کلائی بھی
سب — کلائی بھی؟
حمیدا — مروڑی بھی دبائی بھی، دُکھائی بھی
عورت 1 — چٹورا چاہتا ہے کیا؟
حمیدا — بری نیت سے آتا ہے۔
عورت 2 — بڑا بے شرم ہے۔
حمیدا — چھوڑ چھوڑ تو چھوڑ
(بھابھی اور حمیدا زمین پر پڑی الجھ رہی ہیں۔ عورتیں چھڑاتی ہیں۔ حمیدا دروازے سے نکل کر بھاگ جاتی ہے۔ عورتیں ایک ایک کر کے بکھرتی ہیں۔ بھابھی دروازے تک جا کر دیکھتی ہے۔)

بھابھی — زبان اس کی سڑے...
ایک — کیوں یہ تو سارا گاؤں کہتا ہے۔ دعائیں دو خصم کو سن کے جو خاموش رہتا ہے
بھابھی — زباں میری نہ کھلواؤ، یہ سب تم نے اڑائی ہے پھپھولے دل کے پھوڑے ہیں، جلن دل کی مٹائی ہے۔
عورت — ہائے ہائے... مٹکنا دیکھتی ہے؟
دوسری — کیوں نہ مٹکے گی جوانی ہے
تیسری — پھٹے منہ۔
سب — اوں ہوں
عورت — کہیں چوٹی کی ساری مہربانی ہے
(رانجھا دروازے سے آتا ہے۔ سبھی عورتیں رانجھا کو دیکھتی ہیں۔ وہ کان پر ہاتھ رکھے بھابھی کی طرف دیکھتا ہے۔ بھابھی پاس آتی ہے)۔
ایک عورت — (ہنسی)
دوسری عورت — وہ مشٹنڈا
بھابھی — ابھی آ کے خبر لیں گے تیرے بھائی، کنویں پر کیوں گیا تھا؟
رانجھا — کنویں پر پیاسے جاتے ہیں
(وہ سبھی بھابھیوں کے بیچ کھڑا ہوتا ہے۔)
بھابھی — کنواری لڑکیوں کو چھیڑتے ہیں گدگداتے ہیں
رانجھا — تو کیا بوڑھیوں کو چھیڑوں۔
تیسری — ہوں... پوچھنا یہ اپنے بھائی سے۔
چوتھی — نکھٹو، تجھ کو کیا مل جائے گا اس جگ ہنسائی سے۔
پانچویں — نہ کچھ کرنا نہ دھرنا، مفت کی کھا کھا کے پھولا ہے۔
چھٹی — جوانی کا نشہ ہے، مست ہے انجام بھولا ہے۔
ساتویں — کھے کھے کھے۔ (ہنستی ہے)
رانجھا — کھے کھے کھے۔
(سبھی بھائی آنگن میں کھڑے ہیں۔ ایک کہتا ہے۔)
ایک — اوئے پُتر، جوانی ایک دن ہم پہ بھی آئی تھی
کسی سے پوچھ لے اُس وقت بھی محنت کی کھائی تھی۔
(ایک بھائی کندھے پر ہل اٹھائے)
بھائی — ہم اپنے ہل اٹھاتے ہیں تو تُو بنسی اٹھاتا ہے
اُدھر ہم کھیت میں جاتے ہیں تو میلے میں جاتا ہے
(بھابھیوں میں گھرا ہوا رانجھا)
رانجھا — مجھے بھی بولنے دو گے...
(ایک بھائی لکڑی کے سہارے کھڑا ہے)۔

بھائی تو کیا بولے گا دیوانے! ہمارے گھر میں
پیدا ہو گیا تو کیسے ... کیا جانے
رانجھا۔ اُس کا ساتھی بھاگتا ہوا کہتا ہے۔ مڑ کر
واپس جانے لگتا ہے

ساتھی رانجھے۔

(رانجھا بھابھیوں کے بیچ سے بھاگتا جاتا ہے۔ بھائی کی آواز سن کر رکتا ہے۔)

بھائی اب کہاں؟

(بھائی و بھابھیاں سامنے آتی ہیں)

بھائی کہاں جاتا ہے تو، بیٹھ گھر میں ...

(رانجھا بھابھی کے پاس)

بھائی ہم سے گھبراتا ہے تو؟

(رانجھا ہاتھ تھامے بھابھی کو گھوماتا ہے۔)

رانجھا تم سے گھبرا کر کہاں جاؤں گا میں
ایسی بھابھی پھر کہاں پاؤں گا میں

بھائی چل موئے

رانجھا وہ گاؤں

(بھائی رانجھا کی طرف دیکھ کر بولتا ہے)۔

بھائی تلسی پور۔

(رانجھا بھائی کی طرف مڑتا ہے)

رانجھا وہاں پر ... ایک میرا دوست رہتا ہے۔
وہاں سے جارہی ہے جھنگ کو آج اس کی بارات
مجھ کو جانا ہی پڑے گا اس کے ساتھ۔

(بھائی اور بھابھیاں حیران ہو کر دیکھتے ہیں)۔

بھائی جھنگ۔ پاگل۔ جھنگ تو بھی جائے گا
یاد رکھ زندہ نہ واپس آئے گا
جھنگ سے اپنا پرانا بیر ہے
باز آجا تو اسی میں خیر ہے

(رانجھا بنسی لیے ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے۔ پھر جاتا ہے)

رانجھا میرے سب دشمن یہیں بیری یہیں
باقی سب اپنے ہیں میں جاؤں کہیں

(بھائی و بھابھیاں دیکھتی رہ جاتی ہیں)

بھابھی تم نہ روکو۔ یہ اگر جاتا ہے جائے۔
کون جانے ہیر کو یہ بیاہ لائے

○

ہیر دیکھ رہی ہے۔
سرخ شادی کے کپڑوں میں لڑکی بھاگی آتی ہے۔

لڑکی بارات آئی

(ہیر آواز پر چونکتی ہے۔ خوشی سے دیکھتی ہے۔ پھر سہیلی کے گلے سے لپٹ جاتی ہے۔ لڑکیاں بھاگ کر آتی ہیں۔ بارات آرہی ہے۔ شہنائیاں بج رہی ہیں۔ لوگ ناچتے گاتے آتے ہیں۔ عورتیں بارات دیکھنے میں مست ہیں۔ ہنس رہی ہیں۔ بارات باجے گاجے کے ساتھ آرہی ہے۔ سبھی ناچ رہے ہیں۔ رانجھا دیوانوں کی طرح ناچ رہا ہے۔)

آدمی جو موٹی تیری نانی ہے، سنا ہے دیوانی ہے

(سڑک پر کھڑے آدمی و عورتیں جوش میں آکر ناچنے لگتے ہیں)

آدمی اٹھا کے پھر بھی لے جائیں گے

(رانجھا اور اس کے ساتھی ناچ رہے ہیں۔ لوگوں میں سے ایک جوڑا آگے آکر ناچتا ہے۔)

سب کہ بڑی مستانی ہے

(دالان میں کھڑے آدمی و عورتیں ناچنے لگتے ہیں)

عورتیں جو ماما تیرا آجائے گا
وہ سب سمجھا جائے گا

(دالان میں عورتیں ناچنے لگتی ہیں)

عورتیں جو اُس نے بات تری سن لی تو کچا کھا جائے گا

دالان میں دوسرا آدمی عورتوں کے جھنڈ میں ناچنے لگتا ہے کیمرا ناچتے ہوئے آدمی پر جاتا ہے)

عورتیں تو کچا کھا جائے گا

(باراتی ناچ رہے ہیں۔ رانجھا بھی ناچ رہا ہے۔ ہیر بھاگتی ہوئی دروازے سے آکر بارات دیکھنے لوگوں کے بیچ میں آتی ہے۔ رانجھا، آدمی و عورتیں ناچ رہے ہیں۔ دو لڑکیاں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ناچ رہی ہیں۔ دوسری ناچتی آتی ہے۔ نکل جاتی ہے۔ لڑکیاں ناچ رہی ہیں۔)

آدمی تجھی سے نینا جوڑیں گے، تجھے نہ ہم چھوڑیں گے
بلایا جب ہے بگیا میں تو کلیاں توڑیں گے۔

عورتیں جو کچی کلی توڑے گا دیوانے سر پھوڑے گا
تو کانا، باپ ترا اندھا تو نینا کیا جوڑے گا

(دو آدمی آکر مشعلیں اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ رانجھا و آدمی ناچ میں مست ہیں ہیر ناچتے ہوئے رانجھے کے سامنے آجاتی ہے۔ چاروں طرف مشعلیں جل رہی ہیں۔ رانجھا ناچتے ہوئے ہیر کو دیکھتا ہے اور ایک ٹک دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ہیر رانجھے کی طرف دیکھ رہی ہے۔ لوگ ناچتے آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ وہ دونوں بھی نکل جاتی ہیں۔ ہیر لڑکیوں کے ساتھ ناچ رہی ہے۔ دو آدمی آتے ہیں۔ دیوار کے سہارے مشعلیں لگا کر جاتے ہیں۔ رانجھا لوگوں میں دیکھ رہا ہے وہ ناچنے میں مست ہے۔)

آدمی جلا دو چاہے ہم کو جی مگر یوں نہ روٹھو جی
نشانی اک تو ملے بلیے ہمیں دل دے دو جی
ہمیں دل دے دو جی

(ہیر عورتوں کے ساتھ ناچ رہی ہے)

عورتیں جو لے کے دل جائے گا نہ جانے کب آئے گا
کہ تیری چال یہ کہتی ہے مجھے ترسائے گا
مجھے ترسائے گا

(مرد و عورتیں ناچ رہے ہیں۔ رانجھا دیوار کے سہارے اکیلا کھڑا ہے)

آدمی کبھی نہ تڑپائیں گے، تجھے نہ ترسائیں گے
سہیلی تیری لے کے چلئے گوریئے تجھے بھی لے جائیں گے۔

(سورج نکل رہا ہے۔ باپ عورتوں کے بیچ سے بیٹی کو لے

کر چلتا ہے۔ بیٹی ہیر کے پاس جا کر گلے ملتی ہے۔ ہیر کھوئی سی ہے۔ رانجھا لوگوں کے ساتھ کھڑا ہیر کو دیکھ رہا ہے۔ ہیر اور لڑکیاں۔ وہ ایک ٹک رانجھے کو دیکھ رہی ہیں۔ باراتی۔ ڈولی اٹھا کر چل دیتے ہیں۔ رانجھا پیچھے کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ اس کے ساتھی رانجھا کو کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ ہیر جاتے ہوئے رانجھے کو دیکھ رہی ہے۔ رانجھا سنسان راستے پر اداس بیٹھتا ہے۔)

راوی — مل کے تنہائی کا احساس اس نے دونا کر دیا
دل کیا آباد کچھ ایسے کہ سونا کر دیا

○

(جنگل میں لڑکیاں اور ہیر آنکھ مچولی کھیل رہی ہے)

ایک لڑکی — لُک چھپ جانا مکئی کا دانہ
راجے دو بیٹی آئی جے۔
(لڑکی پیڑ کے پاس چھپی کھڑی ہے۔)

لڑکی — آئی جے۔
(ہیر پیڑ کے پیچھے)

آواز — آئی جے

(ایک لڑکی کی آنکھ پر پٹی بندھی ہے۔ دوسری اسے دھکیل کر آگے پیچھے گھماتی ہے۔ وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی ایک طرف نکل جاتی ہے۔ ایک ہاتھ لڑکی کے چہرے پر جاتا ہے۔ لڑکی ہٹ جاتی ہے۔ پٹی بندھی لڑکی دوسری لڑکی کے پاس جاتی ہے۔ لڑکی الگ ہٹتی ہے۔ وہ آگے بڑھتی ہے۔ لڑکی بیٹھتی ہے۔ پٹی بندھی لڑکی آتی ہے۔ نکل جاتی ہے۔ پٹی والی لڑکی ایک لڑکی کو پکڑنے والی تھی کہ وہ پیچھے ہو لیتی ہے۔ وہ پکڑ نہیں پاتی اور آگے بڑھ جاتی ہے۔ پٹی والی لڑکی دوسری لڑکی کو چھونے ہی والی تھی کہ وہ اپنا چہرہ ہٹا لیتی ہے۔ پٹی والی لڑکی دوسری کو چھونے والی تھی وہ ہٹتی ہے۔ دوسری لڑکیاں آ کر پھر جاتی ہیں۔ وہ ان کے پیچھے بھاگتی ہے۔ ایک لڑکی مسکراتی ہے۔ پٹی والی لڑکی چاروں طرف کھڑی لڑکیوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لڑکی ہنس رہی ہے۔ چند لڑکیاں پٹی والی لڑکی کے سامنے سے نکل جاتی ہیں۔ وہ آہٹ پا کر چاروں کی طرف گھومتی ہے۔ پٹی والی لڑکی چپکے سے پٹی ہٹا کر دیکھتی ہے۔ لڑکی واپس آنکھوں پر پٹی چڑھا رہی ہے۔ ہیر ایک سہیلی کے ساتھ پٹی والی لڑکی کے آگے آگے چل رہی ہے۔ پٹی والی بھاگ کر آتی ہے اور ہیر کو پکڑتی ہے۔ ہیر آنکھوں پہ پٹی باندھے لڑکیوں کو پکڑنے کے لیے جاتی ہے۔ ایک کنارے پر رانجھا بیٹھا ہے۔ ہیر اس کے پاس سے گزرتی ہے۔)

لڑکی — لُک چھپ جانا مکئی کا دانہ
(ایک لڑکی ہنس رہی ہے)

لڑکی — راجا کی بیٹی
(لڑکی پیڑ کے پیچھے سے مسکرا رہی ہے)

آواز — آئی جے

(ہیر پٹی باندھے لڑکیوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لڑکیاں اسے چھیڑ کر بھاگتی ہیں۔ وہ ان کے پیچھے بھاگتی ہے۔ ہیر پٹی باندھے۔ ایک لڑکی مسکراتی ہے۔ ہیر آہٹ پا کر چاروں طرف گھومتی ہے۔ لڑکی سر پر ہاتھ رکھ کر ہنستی ہے۔ لڑکیاں چاروں طرف سے ہیر کو چھیڑ کر بھاگتی ہیں۔ ہیر آہستہ سے اُٹھتی ہے۔ لڑکی ہنس رہی ہے۔ ہیر آہستہ سے لڑکی کے پاس سے اُٹھتی ہے۔ چاروں طرف سے لڑکیاں آ کر گھیرتی ہیں۔ چھیڑ کر بھاگتی ہیں۔ ہیر پیچھے پیچھے بھاگتی نکل جاتی ہے۔ رانجھا پیڑ کے تنے کے پاس بیٹھا ہے۔ پیچھے سے ہیر آتی ہے۔ رانجھا دیکھتا ہے۔ ہیر کا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ پھر چلا جاتا ہے۔ لڑکیاں یہ دیکھ کر بھاگتی ہیں۔ رانجھا کو ہیر آگے آ کر چھوتی ہے۔ پھر پٹی کھول کر دیکھتی ہے اور دیکھتی رہ جاتی ہے۔ ہیر کو ہوش آتا ہے۔ وہ پیڑ کے پاس چل دیتی ہے۔ رانجھا پلو پکڑتا ہے۔ ہیر جاتی ہے۔ دوپٹہ رانجھے کے ہاتھ میں رہ جاتا ہے۔ ہیر ہٹ کر کھڑی ہوتی ہے۔ ایک لڑکی رانجھا کے پاس آ کر دوپٹہ لے کر چلنے لگتی ہے۔ رانجھا دوپٹہ لے کر ہیر کے پاس جاتا ہے)۔

رانجھا — کون ہے وہ؟
لڑکی — کون؟ وہ؟
رانجھا — ہاں ہاں۔ وہی
لڑکی — گاؤں کے چودھری جی کی دِھی
رانجھا — اور نام؟
لڑکی — ہیر ہے اس کا نام
رانجھا — ہائے کیا نام ہے
لڑکی — کوئی کام؟
رانجھا — صرف ملنے کا ارمان ہے
لڑکی — ہائے تو کتنا نادان ہے
رانجھا — ایک بار
لڑکی — نا بھئی
رانجھا — ایک بار
لڑکی — پہلے منھ دھو کے آ
رانجھا — میں نثار
لڑکی — چوکھٹا خاص اچھا نہیں
ہیر — کون ہے؟
(لڑکی ہیر کے پاس آتی ہے)
لڑکی — یہ تو پوچھا نہیں
لڑکی — کون ہو اُس سے میں کیا کہوں
رانجھا — کہہ دو میں خاصا برباد ہوں
لڑکی — خاصا برباد
(رانجھا منھ گھماتا ہے۔ ہیر کے پاس لڑکی آتی ہے۔ پھر واپس رانجھا کے پاس جاتی ہے۔)
ہیر — کیوں مگر؟
لڑکی — کیا پتہ پوچھ لو...
ہیر — سن ادھر... وہ کہاں کا ہے یہ پوچھ آ۔
لڑکی — تو کہاں کا ہے یہ تو بتا۔
رانجھا — بس یہ سمجھو یہیں رہ گیا۔
لڑکی — اب کہیں کا نہیں رہ گیا۔
(رانجھا منھ چھپا کر نکل جاتا ہے۔ ہیر کھڑی ہے۔ لڑکی آتی ہے۔ پھر واپس رانجھا کے پاس جاتی ہے۔ پھر ہیر کے پاس آتی ہے۔)
ہیر — نام بھی پوچھ لے باولی
لڑکی — ہائے ربا کہاں پھنس گئی
رانجھا — رانجھا مرا نام ہے
ہیر — سن لیا... پوچھ کیا کام ہے
لڑکی — کام کیا، تم پہ قربان ہے۔ باتیں کرنے کا ارمان ہے
ہیر — کیسے ممکن ہے یہ؟
لڑکی — رات کو
ہیر — رات کو؟ چھوڑ اس بات کو
لڑکی — چھوڑ دوں
ہیر — سوچنے دے مجھے۔ اس کو کہنا ہے کیا پوچھ لے
(لڑکی رانجھا کے پاس آتی ہے)
لڑکی — تجھ کو کہنا ہے
رانجھا — کیا کہوں
لڑکی — اُس نے بھیجا ہے سب پوچھ لوں
(رانجھا لڑکی کی طرف پیٹھ کر کے کہتا ہے)
رانجھا — اُس سے کہنا کہ تم میرا ایک خواب ہو
جو چمکتا ہے دل میں وہ مہتاب ہو
اس سے کہنا کہ گیہوں کے کھیتوں کا رنگ
تلملاتی ہوئی تتلیوں کی امنگ
اس سے کہنا کہ جھرنوں کا چنچل شباب
گھاٹ کی تازگی آبروئے چناب
اس سے کہنا کہ جھولوں کی انگڑائیاں
اور اڑتے دوپٹوں کی شہنائیاں
اس سے کہنا کہ مکّا کے کھیتوں کی آگ
لڑکھڑاتی جوانی مچلتا شباب
اس سے کہنا کہ دلہن کی کاجل کی پیاس
پہلے بوسے کی گرم اور ٹھنڈی مٹھاس

اتنی رنگینیوں کو جو یکجا کیا
ہیر قدرت نے تب تجھ کو پیدا کیا
(لڑکی دانتوں میں دوپٹہ دبائے سن رہی ہے۔
وہ ہیر کے پاس آتی ہے)

لڑکی   کیسے یہ سب سناؤں گی میں
کچھ نہ کچھ بھول جاؤں گی میں

ہیر   کیا کہا: سمجھی

لڑکی   سب کچھ میں سمجھی نہیں
ایسا کہتا تھا ایسی ہو ویسی نہیں

ہیر   اور کچھ

لڑکی   ہاں بہت کچھ۔ بتاتی ہوں میں۔ ایسا کہتا تھا۔
اونہوں ... بھول جاتی ہوں میں۔ ایسا کہتا تھا۔ تم۔
(ہیر کا چہرہ)

ہیر   میرا ایک خواب ہو۔
لڑکی اور ہیر دونوں)

لڑکی   وہ نہیں تم... کوئی اور مہتاب ہو
اچھی اچھی کہیں اس نے باتیں مگر

ہیر   یاد کر۔ یاد کر ٹھیک سے یاد کر
کیا کہا بات کیا کیا ہوئی۔

لڑکی   ہاں بتاتا تھا تو کیسے پیدا ہوئی
(رانجھا کھڑا ہے)

رانجھا   لائے گا میرے دل کی تڑپ کوئی کہاں سے...
سننا ہے... (ہیر سن رہی ہے)

رانجھا   میرا حال سنو میری زباں سے
(رانجھا مڑ کر ہیر سے کہتا ہے)۔

رانجھا   بارات میں ہلکی سی جھلک اپنی دکھا کے
چھوڑا مجھے اس حسن کا دیوانہ بنا کے
دوری نہ ہوئی دل کو کسی طرح گوارا
چھوڑ آیا ہمیشہ کے لیے تخت ہزارا
(ہیر مڑ کر رانجھا کو دیکھتی ہے۔ پھر چلی جاتی ہے۔)

ہیر   تم تخت ہزارے سے

رانجھا   سنا ہے یہ فسانہ۔ جھنگ اور ہزارے میں ہے
اک بیر پرانا ہے۔
(ہیر جا رہی ہے۔ رانجھا آکر کھڑا ہوتا ہے۔)

ہیر   خطرہ ہے یہاں جان کا

رانجھا   کھیلوں گا میں جاں سے

ہیر   للہ... چلے جاؤ۔

رانجھا   کہاں جاؤں یہاں سے؟
(رانجھا کا چہرہ)

رانجھا   میں راہ تمھاری یہیں دیکھوں گا...

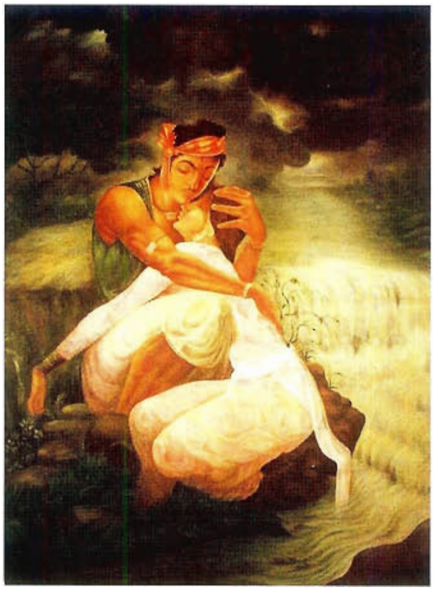

ہیر   کہاں تک؟

رانجھا   جب تک ہے چناب، اس میں روانی ہے جہاں تک
(ہیر مڑ کر دیکھتی ہے۔ پھر دھیرے سے چل دیتی ہے۔)
(ہیر اور سہیلی بھاگ کر اپنی ماں کے پاس آتی ہے اور کان میں کچھ کہتی ہے۔ پھر دونوں گھر کے اندر چلی جاتی ہیں)

راوی   ہیر رانجھا کبھی نزدیک نہ رہنے پائے
جھوٹ سے دونوں نے کام اپنا نکالا دیکھو
جانے کیا باپ سے، کیا ماں سے کہا بیٹی نے
(رانجھا بھینسوں کو ہنکا کر لے جاتا ہے)

آواز   رکھ لیا کس کو بزرگوں نے گوالا دیکھو
(اللہ رکھی خراٹا بھر کر سو رہی ہے۔ چونک کر اٹھتی ہے)

آواز   اللہ رکھی تیرا بیڑا غرق
(ماں ہاتھ میں کھانا لیے آ رہی ہے)۔

ماں   اللہ رکھی۔
(اللہ رکھی آتی ہے۔ ماں روٹی دیتی ہے)

ماں   لے گوالے کو یہ روٹی دے کے آ
(اللہ رکھی لے کر آتی ہے)

اللہ رکھی   صدقے گئی۔ تم نے یہ کیسا گوالا رکھ لیا ہے؟

ماں   کیا ہوا:
(اللہ رکھی کھانا لیے آ رہی ہے۔ پیچھے سے ہیر اور اس کی سہیلی آتی ہے۔ سہیلی چلاتی ہے اللہ رکھی کھانا دے کر لوٹ جاتی ہے۔ سہیلی اور ہیر کھانے کو لے کر چلتی ہیں)۔

سہیلی   باجی کہاں اس دھوپ میں تو کدھر جائے گی

اللہ رکھی   پھر کیا کروں
(ہیر اور سہیلی اللہ رکھی کے پاس آتی ہے)

سہیلی   روٹی تو یہ دے آئے گی

اللہ رکھی   بی بی اللہ خوش رکھے۔ یہ لو کا کی تم کہاں چل پڑی

ہیر   بی بی بیچاری کیا اکیلی جائے گی

اللہ رکھی   سمجھو۔
(ہیر اور بی بی کھانا لیے کھیتوں میں جا رہی ہیں۔ ہیر اور بی بی کھانا لیے رانجھے کے جھونپڑے پر آتی ہیں۔ جنگل میں ہیر اور بی بی ڈری کھڑی ہیں۔ چاروں طرف دیکھ کر ہیر جھونپڑی کی طرف جاتی ہے۔ ہیر دروازہ ٹھوکتی ہے۔ پھر نیچے اتر کر بی بی سے مل کر گھر کے کونے میں چھپ جاتی ہے۔ پیچھے سے رانجھا ہنستا ہوا آتا ہے)۔

رانجھا   اندر آؤ دیکھو میرے گھر کی شان۔
(ہیر اور بی بی رانجھا کے ساتھ کھانا لیے گھر میں آتی ہیں)

ہیر   اچھا گھر ہے۔

رانجھا   گھر سے اچھا مہمان۔

بی بی   میری مت ماری گئی

آواز   یہ سوہنی اس کی بہن ہے۔ پھر سکھی نوکرانی

ہیر   گائے اس کی

رانجھا   حد ہو گئی۔ سوہنی ہے گائے تک اس گاؤں کی
اب مقدر سے نہیں کچھ بھی گلہ
میں گوالا بن گیا اچھا ہوا
(ہیر روٹیاں کھول رہی ہے)

رانجھا   رہنے دو (ہیر سر اٹھاتی ہے)

ہیر   کیوں؟

رانجھا   اب جو آ جاتی ہو پاس
بھوک مر جاتی ہے جاگ اٹھتی ہے پیاس
(ہیر لسّی کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے)۔

ہیر   پیاس تو لسّی پیو لسّی بھی ہے
(رانجھا ہنستا ہے)

رانجھا   دیکھ سکتی کاش اپنا حسن میری آنکھ سے
تو نے سب پایا ہے عاشق کی نظر پائی نہیں
جب سے دیکھا تجھ کو دنیا کی طرف دیکھا نہیں
جب سے چاہا تجھ کو اپنی یاد بھی آئی نہیں
(ہیر کھوئی سی بیٹھی ہے)

□

ماخذ: منظر نامہ (ہیر رانجھا)، مصنف: کیفی اعظمی، اشاعت: ستمبر 2003، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مالک اشتر نوگانوی

اداکاری میں کیریئر

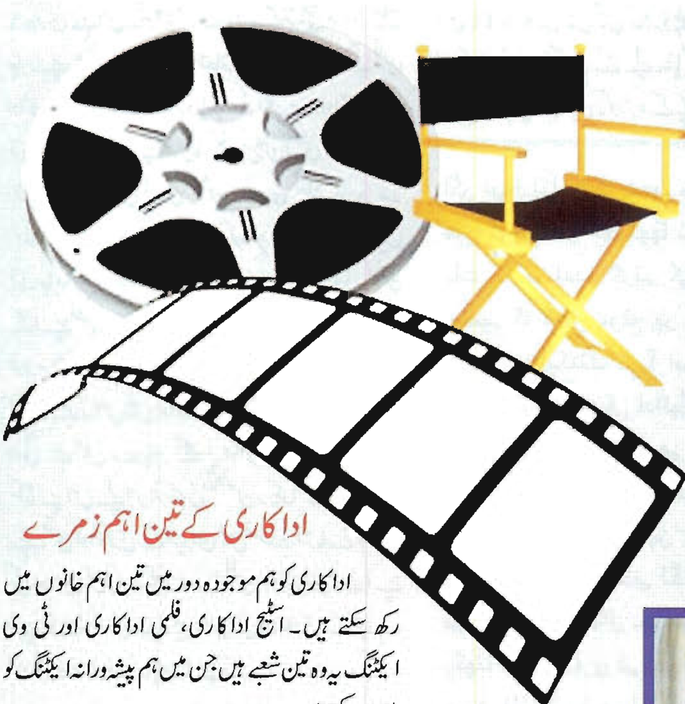

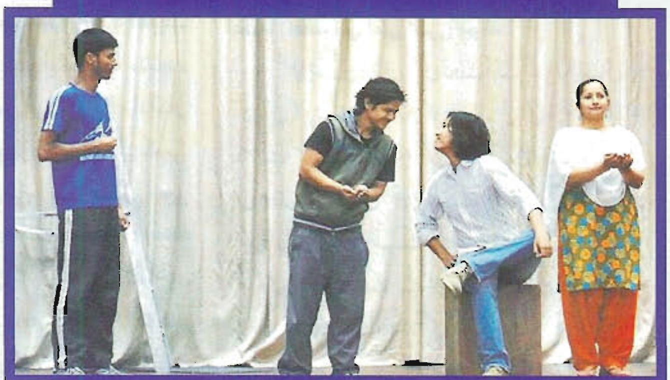

اداکاری ہمیشہ سے ایک مقبول عام ہنر ہے۔ ہمارے آس پاس ایسے بہت سارے لوگ مل جاتے ہیں جو اداکاری کے فن کا مظاہرہ کر کے سامنے والے کو متاثر کردینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اداکاری حالانکہ ایک ایسا ہنر ہے جسے سیکھنا یا سکھانا بہت مشکل ہے لیکن اس ہنر کو نکھارنے کے لیے بہر حال تربیتی پروگرام چلائے جاسکتے ہیں۔ ملک میں جیسے جیسے فلم انڈسٹری کا دائرہ وسیع ہوا ہے اور ساتھ ہی ساتھ نئے نئے چینل آنے کے سبب روز نئے قسط وار ڈرامے چھوٹے پردے پر نظر آرہے ہیں ایسے میں اداکاری کا ہنر جاننے والوں کی مانگ بڑھ جانا لازمی ہے۔ چونکہ نوجوان لڑکے لڑکیوں میں ایکٹنگ کو بطور پیشہ اپنانے کی چاہت میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے اس لیے اداکاری کی ٹریننگ سے متعلقہ کورسز بھی شروع کیے جارہے ہیں۔ اداکاری کا ہنر کس قدر مشکل ہے اس کا اندازہ مشہور فلم اداکار رگھویر یادو کی اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''اداکاری ایک ایسا پیشہ ہے جس میں آپ کو ہر چیز جاننے کی ضرورت ہوتی ہے''۔

اگر آپ اداکاری کے شعبے میں جانا چاہتے ہیں تو آپ کو ایک اچھا ناظر بن کر اس بات کا مشاہدہ کرنے کی عادت ہونی چاہیے کہ فلاں موقع پر فلاں اداکار نے کس طرح ایکٹنگ کی؟ اس کے چہرے کے تاثرات، ڈائیلاگ کی ادائیگی اور اداکاری کا لیول کیا تھا؟ یاد رہے کہ اداکاری کے لیول سے مراد وہ حد ہے جس سے کم ہونے پر اداکاری 'نوسکھیا پن' اور زیادہ ہونے پر 'اوور ایکٹنگ' لگنے لگتی ہے۔ اداکاری کے عمل میں اعتدال سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اداکاری کے لیے ایک اچھا مشاہد ہونا پہلی شرط ہے اس لیے کہ ایک اداکار کو سماج کے مختلف چہروں میں سے کسی کی بھی ایکٹنگ کرنی پڑسکتی ہے اس لیے اسے علم ہونا چاہیے کہ کس کا کن حالات میں کیا مخصوص انداز اور حرکات وسکنات ہوتی ہیں؟۔ دیگر شعبوں کی طرح اس شعبے پر بھی یہ بات نافذ ہوتی ہے کہ اگر آپ میں واقعی اداکاری کے لیے جنون کی حد تک شوق ہوگا تب ہی آپ اس کے ساتھ انصاف کر پائیں گے۔ محض گلیمر کے اثر میں آکر اداکار بننے کی خواہش ایک کامیاب اداکار کبھی نہیں بنا سکتی۔

اداکاری کے تین اہم زمرے

اداکاری کو ہم موجودہ دور میں تین اہم خانوں میں رکھ سکتے ہیں۔ اسٹیج اداکاری، فلمی اداکاری اور ٹی وی ایکٹنگ یہ وہ تین شعبے ہیں جن میں ہم پیشہ ورانہ ایکٹنگ کو بانٹ سکتے ہیں۔

اول-اسٹیج اداکاری (تھیٹر):

اسٹیج اداکاری دراصل وہ روایتی انداز ہے جس میں تھیٹر میں اداکار کسی ڈرامے کو سیدھے سامعین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس زمرے کی اداکاری اپنے آپ میں کافی مشکل ہوتی ہے۔ اداکار کے پاس چونکہ یہاں 'ری ٹیک' جیسا کوئی موقع نہیں ہوتا اس لیے غلطی کرنے کی گنجائش یہاں نہیں ہوتی۔ اس تعلق سے اداکار کا حافظہ بھی اہمیت کا حامل ہوجاتا ہے اس لیے کہ اسے بار بار اسکرپٹ پڑھ کر ڈائیلاگ پڑھنے کا موقع نہیں ہوتا اور اسے تمام ڈائیلاگ حفظ ہونے لازمی ہوتے ہیں۔ چونکہ تھیٹر کا ساؤنڈ سسٹم سنیما کے مقابلے کم آواز کا ہوتا ہے اس لیے عموماً اداکاروں سے امید کی جاتی ہے کہ وہ بلند آواز میں اپنے ڈائیلاگ بولیں گے لہٰذا بلند آواز میں بولنے کی پریکٹس اسٹیج اداکاری کا اہم حصہ ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ایک ہی اداکار پورے ڈرامے کو پیش کرتا ہے جسے 'مونولاگ' کہا جاتا ہے۔ مونولاگ آرٹسٹ کا کام اور زیادہ دشوار ہوتا ہے اس لیے کہ اسے پورے ڈرامے کا ایک ایک ڈائیلاگ، اس کی ادائیگی کا وقت اور انداز ادائیگی کو مکمل طور پر ذہن میں رکھنا ہوتا ہے۔ اسٹیج پر کام کرنے والے اداکار اب دھیرے دھیرے فلم اور ٹی وی کی طرف رجوع کرنے لگے ہیں۔

دوم-فلمی اداکاری (سنیما):

فلمی اداکاری کی چاہت چونکہ سیلاب کی رفتار سے

بڑھ رہی ہے اس لیے تیزی سے اس کے تربیتی مراکز کھلتے جا رہے ہیں۔ سنیما سے متعلقہ اداروں میں اب فلمی اداکاری کی تربیت پر زور دیا جانے لگا ہے۔ اداکاری کی تربیت دینے کے لیے فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا پونہ اور ماس کمیونی کیشن ریسرچ سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اداکاری کے علیحدہ کورسز چلائے ہوئے ہیں جبکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے تو ایم اے ان ماس کمیونی کیشن کے اپنے مشہور زمانہ کورس میں بھی تھیٹر کو ایک مضمون کے طور پر شامل کر رکھا ہے۔ فلمی اداکاری اسٹیج سے اس لیے علیحدہ ہے کہ اس میں اداکاری کے لیے مخصوص فریم کی حد ہوتی ہے جس سے باہر نکلنے پر اداکاری کا عمل غارت ہو سکتا ہے اس لیے اس فریم کی 'لکشمن ریکھا' کا خیال لازمی ہے۔ فلمی اداکاری کے میدان میں قسمت آزمانے والوں کی بھاری بھیڑ کو دیکھتے ہوئے فلمی اداکاروں نے اپنے اپنے نجی سینٹر کھول دیے ہیں جن میں اداکاری کے نشیب و فراز سے متعارف کرایا جاتا ہے۔

سوچھوٹے پردے کی اداکاری (ٹی وی):

چھوٹے پردے کے وسیع ہوتے جا رہے دائرے کو دیکھتے ہوئے قسط وار ڈراموں میں کام کرنے کے لیے اداکاروں کی مانگ میں اضافہ ہوا ہے۔ چونکہ چھوٹے پردے کے لیے بننے والے ڈرامے کم بجٹ میں بنائے جاتے ہیں اس لیے ان میں بہت زیادہ ایکشن کے بجائے ڈائیلاگ اور باڈی لینگویج سے کام چلایا جاتا ہے۔ چھوٹے پردے پر کام کرنے کے شوقین لوگوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان کی ڈائیلاگ ڈیلیوری اور چہرے کے تاثرات اتنے موثر ہوں کہ اس سے ناظر متاثر ہو سکے۔ چھوٹے پردے کے لیے پروگرام بنانے والے کئی مشہور ڈائریکٹر یا تو اداکاری کی تربیت کے لیے اپنے سینٹر کھول چکے ہیں یا کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

تربیتی ادارے

اداکاری کی تربیت دینے والے ادارے عموماً اس کے لیے پی جی ڈپلوما سطح کا پروگرام چلاتے ہیں جس کے لیے کم از کم تعلیمی لیاقت گریجویشن ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں کچھ اہم تربیتی ادارے درج ذیل ہیں۔

نیشنل اسکول آف ڈرامہ (این ایس ڈی) دھلی:

نیشنل اسکول آف ڈرامہ جیسے عالمی شہرت یافتہ ادارے امید کرتے ہیں کہ امیدوار اپنی مادری زبان پر عبور رکھتا ہو ساتھ ہی اسے ہندی یا انگریزی میں سے کسی ایک زبان کا علم ہو۔ نیشنل اسکول آف ڈرامہ (این ایس ڈی) کا اداکاری میں تین سالہ ڈپلوما کورس مشہور ہے۔ اس کورس کو ان لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے جو اداکاری کو اپنا پیشہ بنانا چاہتے ہیں۔ کورس کے پہلے سال میں اداکاری کا تعارف دیا جاتا ہے ساتھ ہی تھیٹر کی تاریخ اور تھیٹر تکنیک وڈیزائن کی تعلیم دی جاتی ہے۔ دوسرے اور تیسرے سال انھیں موضوعات میں اعلیٰ سطحی تربیت دی جاتی ہے۔ این ایس ڈی اپنے طلبہ کے لیے بڑے بڑے اداکاروں کو بطور مہمان پروفیسر مدعو کرتا رہتا ہے۔ اس کورس کے لیے 20 سے 30 سال کی عمر کے مرد وخواتین درخواست دے سکتے ہیں، درج فہرست اور درج قبائل ذاتوں کے امیدواروں کے لیے عمر کی حد میں پانچ برس کی چھوٹ مل جاتی ہے۔ کل سیٹوں کا ایک حصہ ایس سی، ایس ٹی اور او بی سی امیدواروں کے لیے مختص ہے۔ (زیادہ جانکاری کے لیے nsd.gov.in پر لاگ آن کیا جا سکتا ہے)

> اگر آپ اداکاری کے شعبے میں جانا چاھتے هیں تو آپ کو ایک اچھا ناظر بن کر اس بات کا مشاهده کرنے کی عادت هونی چاهیے که فلاں موقع پر فلاں اداکار نے کس طرح ایکٹنگ کی؟ اس کے چهرے کے تاثرات، ڈائیلاگ کی ادائیگی اور اداکاری کا لیول کیا تھا؟ یاد رهے که اداکاری کے لیول سے مراد وه حد هے جس سے کم هونے پر اداکاری 'نو سکھیا پن' اور زیاده هونے پر 'اوور ایکٹنگ' لگنے لگتی هے۔ اداکاری کے عمل میں اعتدال سب سے زیاده اهمیت رکھتا هے۔ اداکاری کے لیے ایک اچھا مشاهده هونا پهلی شرط هے اس لیے که ایک اداکار کو سماج کے مختلف چهروں میں سے کسی کی بھی ایکٹنگ کرنی پڑ سکتی هے

بھارتیندو ناٹیہ اکیڈمی لکھنؤ:

بھارتیندو ناٹیہ اکیڈمی لکھنؤ اتر پردیش حکومت کے شعبہ ثقافت کے مالی تعاون سے چلنے والا ایک خود مختار ادارہ ہے۔ اس اکیڈمی کی جانب سے دو سالہ کورس چلایا جاتا ہے جس میں طلبہ کو ناٹک سے متعلقہ تمام اہم موضوعات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کورس میں داخلہ کے لیے گریجویٹ ہونا لازمی ہے۔ داخلہ امتحان میں کامیاب طلبہ کو کورس میں شمولیت ملتی ہے۔ اکیڈمی اپنے ان طلبہ کو جدید ترسیلی آلات سے بھی متعارف کراتی ہے تاکہ وہ زمانے کے ساتھ چل سکیں۔

فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا (ایف ٹی آئی آئی) پونہ:

فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا (ایف ٹی آئی آئی) پونہ میں اداکاری کا دو سالہ پی جی ڈپلوما کرایا جاتا ہے جس کے لیے گریجویشن کم از کم تعلیمی لیاقت ہے۔ اس کورس اپنی خاص مقبولیت ہے اور بڑی تعداد میں امیدوار اس میں داخلہ کے لیے درخواستیں دیتے ہیں۔ (تفصیلی معلومات کے لیے ایف ٹی آئی آئی کی ویب سائٹ ftiiindia.com دیکھی جا سکتی ہے)

ایم سی آر سی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دھلی:

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماس کمیونی کیشن ریسرچ سینٹر میں اس سال سے اداکاری کا ایک سالہ پی جی ڈپلوما کورس شروع کیا گیا ہے۔ اس کورس کے لیے کم از کم تعلیمی لیاقت گریجویشن ہے۔ اس کورس میں داخلہ کا عمل

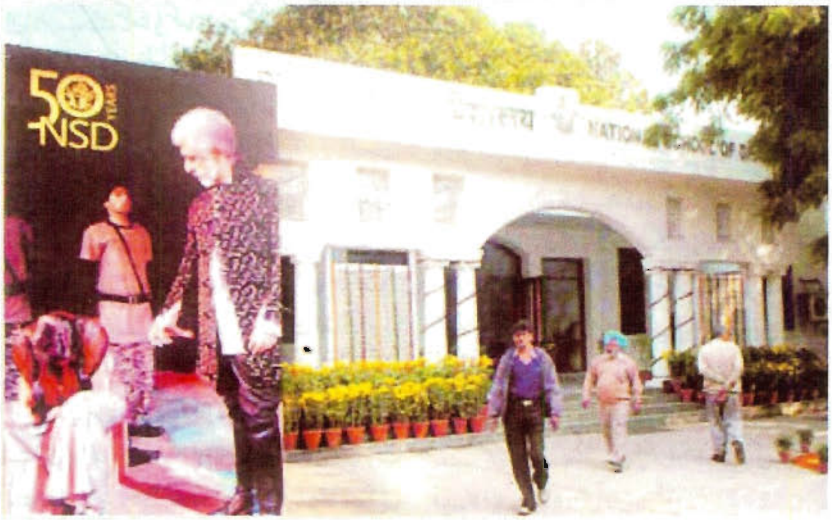

ایک تحریری امتحان اور انٹرویو پر مبنی ہے۔ تحریری امتحان میں کامیاب طلبہ کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا۔ یہ کورس فل ٹائم ہے۔(مزید تفصیلات ajkmcrc.org یا jmi.ac.in سے حاصل کی جاسکتی ہے)

رابندرا بھارتی یونیورسٹی کلکتہ:

رابندرا بھارتی یونیورسٹی کلکتہ کی فیکلٹی آف فائن آرٹس کے تحت ڈرامہ اور ڈانس میں انڈر گریجویٹ سے لے کر پی ایچ ڈی سطح تک کی تعلیم کا نظم کیا گیا ہے۔ انٹر میڈیٹ کے بعد بی اے آنرس ان ڈرامہ کے تین سالہ کورس کے ساتھ ساتھ دوسال کا بی اے اسپیشل آنرس ان ڈرامہ کورس بھی یونیورسٹی چلاتی ہے، جس کے لیے کم از کم تعلیمی لیاقت گریجویشن ہے۔ ایم اے ان ڈرامہ اور اسی شعبے میں ڈاکٹریٹ کی تعلیم کا بھی انتظام یونیورسٹی میں ہے۔(اس سلسلے میں تفصیلات کے لیے یونیورسٹی کی ویب سائٹ rbu.ac.in پر لاگ آن کیا جاسکتا ہے)

حیدرآباد یونیورسٹی حیدرآباد:

حیدرآباد یونیورسٹی کے ایس این اسکول آف آرٹس اینڈ کمیونی کیشن کے تھیٹر آرٹ کے شعبے میں بھی تھیٹر سے متعلقہ تعلیم وتربیت کا انتظام ہے۔ یونیورسٹی نے اپنے نصاب تعلیم میں تھیٹر سے متعلق تمام اہم پہلوؤں کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں تین سالہ دورانیہ پر مشتمل تھیٹر آرٹس کا کورس خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔(تفصیلات کے لیے یونیورسٹی کی ویب سائٹ uohyd.ac.in پر جایا جاسکتا ہے)

راجستھان یونیورسٹی جے پور:

راجستھان یونیورسٹی جے پور کے زیر اہتمام بھی ڈرامہ سے متعلق کچھ اہم کورسز چلائے جاتے ہیں۔ ایم اے ان ڈرامیٹکس اور پی جی ڈپلوما ان ڈرامیٹکس دو قابل ذکر اہم کورس ہیں۔ پی جی ڈپلوما ان ڈرامیٹکس اس شعبے کے نوواردوں کے لیے ایک اہم کورس ہے۔ اس کورس میں داخلہ کے لیے کم از کم تعلیمی لیاقت گریجویشن ہے۔ اس کورس میں داخلہ امتحان دو اہم مراحل پر مبنی ہے، پہلا مرحلہ ایک تحریری امتحان ہے، جس میں کم از کم چالیس فیصد نمبرات حاصل کرنے والے امیدواروں کو ایک آڈیشن میں بلایا جاتا ہے اور وہاں سے انتخابی عمل مکمل کیا جاتا ہے۔ اس کورس کی پانچ سیٹیں خواتین کے لیے ریزرو ہیں۔ (تفصیلی معلومات یونیورسٹی کی ویب سائٹ uniraj.ac.in پر دستیاب ہے)

ان کے علاوہ کئی نجی کالج بھی اداکاری کی تربیت کے کورسز چلاتے ہیں۔ حالانکہ ان نجی اداروں میں بھاری فیس وصولی جاتی ہے لیکن بڑے اسٹاروں کے چہروں سے متاثر ہوکر کثیر تعداد میں اداکاری کے شوقین لڑکے لڑکیاں ان اداروں کی طرف رخ کرتے ہیں۔ ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ سرکاری اداروں میں تھیٹر کی تعلیم کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اس میں نہ صرف اداکاری کا پریکٹیکل شامل نصاب ہوتا ہے بلکہ اس سے متعلقہ عالمی ادب اور اداکاری کے جملہ اسرار و رموز سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جبکہ دوسری جانب نجی اداروں میں محض فلمی اداکاری کی ٹریننگ تک ہی معاملہ محدود رہتا ہے ان مراکز میں عموماً تھیٹر یا اداکاری کی تاریخ، اس کے ارتقائی سفر کے اہم مراحل اور عالمی ادب میں اداکاری و تھیٹر کا نظریہ جیسے مضمون شامل نصاب نہیں ہوتے۔

اداکاری میں آمدنی:

اداکاری کے شعبے میں جگہ بنانے کے لیے جتنی زیادہ محنت لگن اور جد وجہد درکار ہوتی ہے اتنا ہی زیادہ پیسہ اور گلیمر بھی اس شعبہ میں ہے۔ ایک اچھے اداکار کو شروع سے ہی اچھا معاوضہ ملنے لگتا ہے اور جیسے جیسے اس کا فن مقبول عام ہوتا جاتا ہے اس کی آمدنی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ ہندی فلم انڈسٹری میں تو خیر اداکاروں کی بھاری آمدنی ہے ہی ساتھ ہی علاقائی سنیما انڈسٹری میں کام کرنے والوں کو بھی ان کے کام کی اچھی فیس مل جاتی ہے۔ اس شعبے میں کوئی بندھی ٹکی قیمتیں طے نہیں ہیں کہ شروع میں اتنی رقم ملے گی اور بعد میں اتنی لیکن یہ طے ہے کہ آمدنی اچھی ہی ہوتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسٹیج اور تھیٹر کے لیے اداکاری کرنے والوں کی آمدنی فلمی یا ٹی وی اداکاروں کے مقابلے بہت کم ہوتی ہے لیکن اسٹیج یا تھیٹر میں کام کرنے والے اداکاروں کو اس آمدنی سے زیادہ سروکار اپنے فن کے تئیں ہوتا ہے۔

تو اگر آپ کو ایکٹنگ کا واقعی شوق ہے اور آپ کو لگتا ہے کہ آپ اسی پیشہ کے لیے بنے ہیں تو قدم بڑھائیے ایک شاندار مستقبل آپ کا منتظر ہے۔ یاد رکھیے کہ اس شعبے میں جتنی چمک دمک اور پیسہ ہے اتنی ہی کڑی محنت اس شعبے میں قدم جمانے کے لیے درکار ہوتی ہے لہٰذا آپ کو جد وجہد کے لیے تیار ہوکر اس میدان میں قدم رکھنا ہوگا تبھی آپ یہاں اپنے لیے جگہ بنا سکیں گے۔

□

Malike Ashter, H-3, MCD Chest Clinic & Hospital, Nehru Nager, New Delhi 110065

چمپک درخت

مصنف : سمتیند رناڈک   مترجم: محمد ہادی رہبر

کچھ دن پہلے میرے خواب میں ایک چمپک درخت نے آ کر کہا، 'میرے بارے میں ایک کہانی لکھو۔ میں نے سوچا، یہ کون سا چمپک درخت ہے؟ سوربا، میں ہمارے گھر کے پیچھے ایک چمپک درخت تھا۔ اس کے پاس لانٹانا[1] کے چھوٹے چھوٹے پودے لگے ہوئے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی جس کی عمر دس برس کی تھی، شام کو گھر کے پیچھے چمپک کے پاس کھڑا پھولوں کو توڑ رہا تھا۔ شام گہرانے لگی تھی۔ ماں اس وقت برتن مانجھ رہی تھی۔ تبھی ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ ماں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ایک باگھ میرے چھوٹے بھائی کے اوپر سے چھلانگ مار کر نکل گیا۔ ڈرتے ڈرتے وہ بیٹے کو اندر کھینچ لائی۔ باگھ نے کوئی حملہ نہیں کیا، وہ بس چھلانگ لگا کر چلا گیا۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات تھی۔ سوربا کے چمپک کے چاروں طرف جیسے اس حیرانگی نے مجھے گھیر لیا۔

ایک چمپک ساگر کے یہاں بھی ہے۔ بیس برس پہلے، جب میں جوان تھا، تب اس پیڑ کے نیچے کپڑے دھونے کے پتھر پر اپنی سہیلی موہنی کے ساتھ بیٹھ کر اشٹمی کے چاند کو دیکھا کرتا تھا۔

اور بھی کئی گاؤں کے چمپک کو یاد کیا۔ اس گھر میں آنے سے پہلے، کرایے کے گھر کے آنگن میں بھی ایک چمپک تھا۔ اس کے نیچے پتھر کی بینچ پر کبھی کبھی بیٹھتا تھا۔ جب اس گھر کو چھوڑنے کا وقت آیا، اس سے پچھلی رات کو میں نے چمپک کے نیچے بیٹھ کر اس کے ساتھ باتیں کی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا، وہی پیڑ ہوگا، اس کے بارے میں کیا لکھوں؟

اس کے بعد ایک رات پھر خواب دیکھا۔ وہی پیڑ پھر دکھائی دیا اور اس نے کہا، 'تم 'بسون گڑھی'، میں تھے نا، میں وہیں کے پرانے گھر کا پیڑ ہوں۔'

'کچھ مہینے پہلے خواب میں آنے والے کیا تمھیں تھے؟'

'ہاں!'

'تم نے کہا تھا، تمھارے بارے میں کہانی لکھوں، تمھیں ایسی خواہش کیوں ہوئی؟'

'دیکھو افسانہ نگار! تم نے تو اپنے بارے میں بھی کہانیاں لکھی ہیں، کیوں؟' اس پیڑ نے وہی سوال دہرایا۔

'میں مر جاؤں تو دنیا مجھے یاد کرے، اسی امید میں جو بیکار کوشش کرتا ہوں، وہی میری کہانیاں ہوتی ہیں۔'

'اسی طرح میرے بارے میں بھی بیکار کوشش کرو!' چمپک نے کہا۔

'میں پہلے ہی تمھارے بارے میں ایک، دو کہانیاں، نظمیں لکھ چکا ہوں۔'

'ہاں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، ایک کہانی اور لکھو۔ کہانی میں مرکزی کردار میرا ہو، اور اگر تم ایسا لکھ سکو تو میرے بارے میں تمھیں اپنے جذبوں کا اظہار بھی کرنا چاہیے۔ شاید تمھارے دل میں کچھ میرے لیے بھی پیار بھرے جذبات ہوں، اس کا پتہ دوسروں کو بھی چلنا چاہیے۔ جذباتی پیار کے اظہار سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ ہے نا؟

اسی لیے تو ہم ادب پڑھتے ہیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ مجھے نہیں مرنا چاہیے؟ البتہ اگر میں مر جاؤں تو تم اپنی سنجیونی علم کا تجربہ کرو!' چمپک نے کہا۔

چمپک تم مرنے سے پہلے بھوت کی طرح ستا رہے ہو۔ تمھیں زندگی سے آزادی چاہیے، ہے نا؟ اچھی بات ہے میں تمھیں ایک شفاف مجسمے کی شکل میں کاٹ کر کھڑا کرتا ہوں۔ اگر مجسمہ شفاف ہوا تو تم پھر سے جنم نہیں لے سکو گے۔ لیکن تمھاری ڈالیوں میں وہی کوؤں کے گھونسلے ہونگے....وہی بندروں کی ہنسی ہوگی....تمھاری ڈالیاں بجلی کے تاروں کو چھوتی رہیں گی....بجلی محکمہ والے ان ڈالیوں کو کاٹتے رہیں گے۔ کیوں؟ تمھیں تو کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔' میں نے کہا۔

'تم ادبی افکار کی باتیں مت کیا کرو۔ ادب الگ ہے اور ادبی فکر الگ۔ اور تخلیق الگ۔ تخلیق خود بخود ادبی افکار میں بدل جاتی ہے۔' چمپک نے کہا۔

میری نیند حرام ہوگئی۔ یہ سوچ کر کہ مجھے اب تھوڑا آرام کرنا چاہیے، میں نے کہا، 'ٹھیک ہے، میں کہانی لکھوں گا۔' اور میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

چمپک کی کہانی کچھ اس طرح کی ہے، اس میں سال میں دو مرتبہ پھول کھلتے تھے۔ پھولوں کو توڑ کر دے دیجیے، ہم اتنے پیسے دے دیں گے ... یہ کہتے ہوئے کوئی نہ کوئی آتا رہتا تھا۔ پاس پڑوس کے لڑکے پھول توڑنے کے چکر میں رہتے تھے۔ پھول بیچنے والے آ کر کہتے، روز ہمیں پھول توڑنے دیں؛ ہم آپ کو پھولوں کے پیسے دیں گے۔ ایک دن میرا بہنوئی چمپک پر چڑھ گیا۔ اس کی ڈالی ٹوٹ گئی۔ وہ نیچے گرنے ہی والا تھا، مگر دوسری ڈالی کا

1 ایک طرح کا کانٹے دار پودا، جس میں چھوٹے چھوٹے پھول بھی کھلتے ہیں۔

سہارا پاکر کسی طرح بچ گیا۔

سامنے کے گھر اور آس پاس کے گھروں میں آنے والوں کی کاریں چمپک کے سایے میں کھڑی ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی کاروں کو ایسے کھڑا کیا جاتا کہ ہمیں اپنے گھر میں جانے میں بھی دقت ہوتی تھی۔ بڑے چمپک کا سایہ آدھا راستہ ڈھک لیتا تھا۔ مجھے تو کئی بار کار والوں کے ساتھ جھگڑا کرنا پڑتا تھا۔ فقیر لوگ آکر اس کے سائے میں کھانا کھاتے تھے۔ گھر کے احاطے کے اندر، آنگن کے دائیں طرف چمپک کے سائے میں ایک چندن کا پودا جنم لے کر پورا پیڑ بن رہا تھا۔ چمپک سے کچھ ہی دور پانی کا ایک حوض تھا۔ پیڑ کے پتے اس میں گر کر سڑ جاتے تھے۔ مجھے ہی اس حوض کو کبھی کبھی صاف کرنا پڑتا تھا، اس لیے میں اوب جاتا تھا۔ پیڑ کی جڑیں اجگر کی طرح موٹی ہوکر زمین پر بھی دکھائی دینے لگی تھیں۔ جڑیں وہاں سے ہوکر گھر کے باہر دالان میں لگی سیمنٹ کی پرتوں کو اکھاڑ رہی تھیں۔ پانی کے حوض میں دراریں آگئیں تھیں۔ دائیں طرف کے پڑوسی کہتے 'ہمارا احاطہ برباد ہو رہا ہے، چمپک کو کاٹ ڈالیے'۔

سردی کے شروع ہونے تک گھر کی دیواروں پر کمبل کے کیڑے چڑھ کر سفید دیواروں کو سیاہ کرنے لگتے۔ کمبل کے کیڑوں کی وجہ سے سونا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ آنگن میں پتیاں اور پھولوں کی پنکھڑیاں گرنے سے آنگن گندہ دکھائی دیتا تھا۔ آخر کتنی بار جھاڑو لگایا جائے! چمپک کی ڈالیوں میں کوے گھر بسا کر کاؤں کاؤں کر رہے تھے۔ جب بندر ان کے گھونسلوں کو کھینچ پھینکتے تو اس وقت ان کی چیخ بڑی عجیب لگتی۔ کوؤں کی پھیلائی ہوئی گندگی، ان کے ٹوٹے ہوئے پر، اور ہڈیوں کے ٹکڑے، جنھیں وہ کہیں اور سے لے آتے اور وہیں پر ڈال جاتے تھے، ان ہڈیوں کو کھاتی تھیں بڑی بڑی چیونٹیاں......ایک طرح سے چمپک اپنے وجود کا احساس کھل کر کراتا تھا۔ چیونٹیوں کا ادھم مچا رہتا تھا۔ چمپک پر دیمکوں نے الگ سے حملہ کر رکھا تھا۔ یہ سب دیکھ کر اداسی سی چھانے لگتی تھی۔

اتنا لکھنے کے بعد میں ذہنی طور پر تھکان محسوس کرنے لگا۔ کہانی کو وہیں کا وہیں چھوڑ کر دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے نکل پڑا، رات بارہ بجے گھر پہنچا اور بغیر کھانا کھائے ہی سو گیا۔ نیند گہری آگئی تھی۔ اس دن دیر رات ایک اور خواب دیکھا، پھر وہی چمپک.... 'تیری کہانی پڑھی'، کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ دیکھیں چمپک اور کیا کہتا ہے، لیکن اس نے اور کچھ نہیں کہا۔

'کیسی ہے کہانی؟' میں نے پوچھا۔

'تم نے کہا ہے کہ مجھ سے بڑی تکلیف اور پریشانی تمھیں ہوتی ہے۔'

'کہانی ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔'

'مکمل ہونا بڑی بات نہیں ہے۔ تمھارا جو ڈھنگ ہے وہی دیکھنے کی بات ہے۔ تمھاری حمایت میری موت سے ہے یا پھر میری زندگی سے۔ تمھارے جیسے لوگوں کی تعداد ہی زیادہ ہے، اس لیے سارے پیڑ برباد ہو رہے ہیں۔' چمپک نے مزمتی لہجے میں کہا۔

'کہانی ابھی بھی مکمل نہیں ہوئی،' میں نے پھر کہا۔

'مجھے معلوم ہے کہ تم کیسے مکمل کرو گے۔ تم کہانی ختم نہیں کرو گے، الٹا مجھے ہی ختم کر دو گے۔ آدمی پیڑوں سے، جانوروں سے، زمین سے، آسمان سے اور ہوا سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، مگر ان کا وجود اسے برداشت نہیں۔ آدمی کو یہ سمجھ نہیں ہے کہ ہم سب کو ایک دوسرے کے جان کی قدر کرنی چاہیے۔ کیا تم اپنی بیوی کو ایسے ہی دیکھتے ہو، جیسے تم مجھے دیکھ رہے ہو؟' چمپک نے مجھ پر حملہ کیا۔

اپنی بیوی کے بارے میں تو میرا رویہ...؟ یہ سچ ہے۔ میں نے سوچا، چمپک سے یہ بات کہنی نہیں چاہیے۔ مجھ کو جیسے سوئی چبھو کر درد دینے کی اس کی کوشش کامیاب ہوگئی۔

'کہانی کو ڈھنگ سے پھر شروع کروں گا،' میں نے کہا۔

'میں سمجھ رہا تھا کہ تم اکیلے ہی مجھ سے پیار کرنے والے ہو، مگر میری سمجھ غلط نکلی۔ کچھ بھی کرلو،' کہتے ہوئے چمپک نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

مجھے پھر نیند ٹھیک سے نہیں آئی۔ ڈر تھا کہ رات کہیں پھر چمپک خواب میں نہ آجائے.....لیکن اس رات چمپک نے میری نیند خراب نہیں کی۔

یہ چمپک کیا ہے؟ کیسا چمپک؟ اس کے پیلے پیلے پھولوں کو توڑنے کے لیے میں نے ایک 'انکوڑا' خرید لیا تھا۔ پھول توڑ توڑ کر آس پاس کے گھر کے لوگوں کو دے دیتا تھا۔ اپنی چھوٹی بہن کی شادی میں آئی سبھی عورتوں کو میں نے پھول دیے۔ مندر میں جب لوگ پوجا کرنے جاتے تو چمپک مالا لے جاتے۔ گھر میں ستیہ نارائن کی پوجا کے لیے، گنیش تیوہار پر اور روزانہ روایتی پوجا ارچنا کے لیے بھی چمپک پھول ہی استعمال کیا جاتا۔ ہمارے آنگن اور گھر بھر میں چمپک کی خوشبو پھیلی رہتی تھی۔ خوشی کی میرے لیے ایک بات اور تھی۔ مجھے لگتا کہ چمپک میں کلیاں ہی کلیاں ہیں۔ ایک بار کلی کو توڑ کر اس کے اوپر کی خول کو دھیرے سے الگ کر کے دیکھا تو پتہ چلا وہ کلی نہیں، بلکہ کونپل ہے جو پتے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جیسا خول کلی کو ملتا ہے، ویسا ہی خول پتے کو بھی، چمپک کا یہ انوکھا پن پہلی بار میں نے دیکھا تھا۔ مجھے بڑی خوشی

ہوئی تھی۔ چمپک کے کچے پھلوں کے گچھوں کو دیکھ میں اور بھی خوش ہوتا۔

گرمی کے دنوں میں ہم چمپک کے سایے میں کرسی ڈال کر بیٹھتے تھے۔ جب میں کوہساری علاقے 'مالیناڈو' گیا تھا، تب ایک کوہساری 'سیتال' پودے کو لا کر اس پیڑ پر اگانے کی کوشش کی۔ لیکن بندر اس پودے کو توڑ پھینکتے تھے۔ میں بار بار اس پودے کو چمپک کی ڈالی میں رکھنے کی کوشش کرتا، مگر سب بیکار۔ تب میں اس کوہساری پودے کی جڑوں کو پھیلا کر اس کے چاروں طرف ڈور باندھ کر، ان جڑوں کے اوپر اینٹ رکھتا تا کہ وہ اندر جا کر جڑ بنیں اور پھول کھلیں۔ مگر بندر اسے بھی توڑ کر برباد کر دیتے تھے۔

مجھے لگتا تھا وہ پیڑ مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کی ڈالیاں جب ہلتی تھیں تو لگتا تھا کہ وہ مجھے پکار رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ ایسا بھی لگا کہ جب میں اس کے پاس جاتا ہوں تو اسے خوشی ہوتی ہے۔ میں بھی اس سے باتیں کرتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میری باتیں اس کی سمجھ میں آ رہی ہیں۔

کبھی، کبھی مجھے اکتاہٹ ہوتی، پھر بھی چمپک کے ذریعے سے جن لوگوں سے میں واقف ہوا تھا، وہ ہماری خوشی کی وجہ بن گئے۔ ویسے دیکھا جائے تو کون ہمیشہ دوسروں کو خوش رکھ سکتا ہے؟

میں نے سنا ہے کہ جس گھر میں چمپک نہیں ہے، اس گھر میں بھی کمبل کے کیڑے رہتے ہیں۔ کمبل کا کیڑا تکلیف دیتا ہے تو اس کے لیے چمپک کا کیا قصور؟ دھوکے باز لوگ بھروسہ دلا کر ہی دھوکہ دیتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے؟ بھلائی یا برائی تو ان کے عمل پر منحصر ہے؟ لیکن چمپک کی زندگی تو بھلائی کرنے والوں میں ہی تھی۔ وہ پانی کی خواہش تبھی کرتا تھا، جب وہ چھوٹا پودا تھا۔ اس کے بعد اسے آدمی کے ذریعے دیے جانے والے پانی کی پرواہ نہیں تھی۔ بھگوان کا دیا ہوا پانی، زمینی سوتوں، ہوا میں ملتا اِنگلامس، سورج کی کرنیں ... صرف ان پر زندہ رہنے والا چمپک سال میں دو مرتبہ پھولوں کا رتھ بن کر آنکھوں کو لبھاتا، اپنی خوشبو بکھیرتا، جسم کو گرمی کی تپش سے دور کرنے والا سایہ بنتا اور ہلکی بارش میں چھاتا بھی بن جاتا تھا۔ اس کی اس بھلائی کو میں نے فراموش نہیں کیا۔ چمپک نے ہم سے کچھ بھی نہیں چاہا۔ سال بھر پھول دیے۔ سایہ دیا۔ جب اکتاہٹ میں مبتلا ہوتا تو تسلی بھی دیتا تھا۔

کہانی میں نے یہیں پر ختم کر دی تو اس رات پھر خواب میں وہی چمپک دکھائی پڑا۔

'میں نے تمھاری کہانی پڑھی۔ تم نے غیر جانب دار رہنے کی کوشش کی ہے۔ تم نے جذبوں سے کام نہیں لیا، مگر.... چمپک درمیان میں ہی رکا۔

'مگر؟ کیا؟' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

'کل مجھے کاٹ دیا گیا'

میں مبہوت ہو گیا۔ مجھے کچھ نہیں سوجھا۔ وہ مر گیا، ایک اپنائیت کے احساس نے مجھے کچوٹ لیا۔

'تمھیں کہانی میں یہ تو کہنا تھا کہ مجھے کاٹنا نہیں چاہیے۔'

'ہاں مجھے ایسا کہنا چاہیے تھا۔ مگر نئے گھر میں نقل مکانی کی جلد بازی، ساس کی بیماری، بیٹی کی شادی کی مصروفیت اور کالج میں پڑھانے کی فرائض وغیرہ میں، میں اپنی ہی دنیا میں ڈوب گیا تھا۔ لیکن میرے کہنے پر بھی وہ کہاں مانتے!' میں نے اپنے دفاع میں کہا۔

'بذاتِ خود اپنی حمایت مت کرو۔ مجھے ہمدردی نہیں چاہیے، افسوس کی بھی ضرورت نہیں۔ رحم دلی بھی نہیں چاہیے۔ لیکن دوسرے حیوانات کے تئیں اگر پیار ہو تو اس کا اظہار تمھیں کرنا ہی چاہیے۔' چمپک نے کہا۔

'میں کیا کر سکتا تھا؟'

'مجھ سے کیا پوچھتے ہو، اپنی خود کی عقل کا استعمال کرنا چاہیے تمھیں۔ بمبئی میں جب ایک پیڑ کو کاٹنے کی کوشش کی گئی، تب اس علاقے کے سارے لوگوں نے اس کی مخالفت کی اور اس پیڑ کو اکھاڑ کر دوسری جگہ گاڑا گیا؟' چمپک کچھ جذباتی ہو گیا۔

'مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ تحریک شروع کروں اور تمھیں بچاؤں۔ میں بااثر آدمی نہیں ہوں، دولت مند نہیں ہوں، نیتا بھی نہیں ہوں۔' میں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

'ہاں تم دولت مند نہیں ہو، مگر تم میں اتنی طاقت تھی کہ اس گھر میں آئے لوگوں سے یہ بات تو کہہ ہی سکتے تھے۔ لیکن ایسی ایک چھوٹی سی کوشش بھی تم نے نہیں کی۔ جانے دو۔ تمھیں کوسنے سے کیا فائدہ؟ میں بھی تمھاری ہی طرح ہوں۔ اگر میں وہ پیڑ ہوتا، جس کے نیچے بدھ یا شنکراچاریہ نے بیٹھ کر تپسیا کیا ہوتا، یا پھر میں گاندھی جی کا لگایا ہوا پیڑ ہوتا تو مجھے بھی لوگ بچاتے۔' کہتے کہتے پیڑ چپ ہو گیا۔

'میں بہت دکھی ہوں...... مجھے تم سے کتنا لگاؤ تھا، اب بھی کتنا پیار ہے، یہ بات اب سمجھ میں آئی ہے...... تم مرے نہیں ہو، میرے اندر پھول کھلا رہے ہو، سایہ دے رہے ہو۔'

چمپک خواب سے غائب ہو گیا۔ اس دن سے اسے میں نے پھر کبھی خواب میں نہیں دیکھا۔

□

Mohammad Hadi Rahbar,265, Sabarmati Hostel, JNU, New Delhi - 110067

زینت سلطانہ

آنکھ، کان، ناک اور گلے کی بیماریاں

ناک، کان اور گلے کی شکایات عام طور پر لوگوں میں یکساں ہوتی ہیں۔ زیادہ تر بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جن سے تکلیف یا درد کم ہوتا ہے، جیسے وائرل انفیکشن (Viral Infection)، جس سے گلے میں سانس اور کھانے کی نلی متاثر ہوتی ہے۔ البتہ زیادہ تکلیف یا پریشانی اس وقت ہوسکتی ہے جب کہ مرض کی درست تشخیص نہ کی جاسکے کیونکہ ناک، کان اور گلے کے اندرونی اعضا کافی گہرائی میں پیوست ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کان کا پردہ، گلے کے غدود، حلقوم کا نچلا حصہ، وائس باکس (Voice Box) اور یہاں تک کہ ناک کا اندرونی حصہ (جو خود بھی 7 سے 9 سینٹی میٹر طویل ہوتا ہے) وغیرہ۔ جن کے بارے میں مریض کو پورا علم نہیں ہوتا اور وہ مرض کی سنگینی کو نہیں سمجھ پاتے۔ سائینس کے پیچیدہ ڈھانچے کی جانچ کوئی ماہر ڈاکٹر ہی کرسکتا ہے جس کے بعد مرض کی درست تشخیص ممکن ہوسکتی ہے، جو کامیاب علاج کی کلید ہے۔

بہت سی ایسی پریشانیاں اور امراض، جن کی ماضی میں تشخیص نہیں ہوپاتی تھی، اب حالیہ برسوں میں جدید طبی تکنیک میں فروغ کی وجہ سے، اب آسانی سے تشخیص کی جاسکتی ہے۔ آج کل سی ٹی اسکین (CT Scan)، ایم آر آئی (MRI) اور اسی طرح کئی دیگر طریقے مستعمل ہیں جن کے ذریعے مرض کی درست تشخیص کی جاسکتی ہے اور اس کے ساتھ ان امراض کا کامیاب علاج بھی ممکن ہے۔

بدقسمتی سے اب بھی کچھ امراض، خاص طور پر کینسر وغیرہ کی تشخیص مرض کے آغاز میں ہی نہیں ہوپاتی جس کی وجہ یہ ہے کہ ان امراض کی علامات بہت مبہم ہوتی ہیں جب کہ ای این ٹی (ناک کان گلا) کے اندرونی اعضا کے بارے میں عام ڈاکٹروں کو زیادہ معلومات نہیں ہوتیں۔

کان میں تکلیف کی عام علامتیں (Symptoms):

- کان میں درد
- کان بہنا
- کھجلی
- کان کا میل
- سماعت میں کمی یا بہراپن
- کانوں میں گھنٹیاں سی بجنا یا سنسنی ہونا
- بھاری پن، چکر آنا وغیرہ۔

کان میں درد میل کی زیادتی سے یا کان کی نلی میں انفیکشن وغیرہ کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ دراصل کان کی صفائی کا ایک قدرتی عمل ہے جس میں ایک رقیق اور چکنا مادہ کان کی نالی سے باہر آتا ہے جو کان کے پردے پر دھول وغیرہ کو صاف کرتا رہتا ہے اور گاڑھا ہوکر کان کا میل ویکس (Wax) کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ البتہ اس کا ضرورت سے زیادہ یا ضرورت سے کم اخراج پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔

البتہ کان میں زیادہ عرصے تک انفیکشن کے علاج کے لیے ماہر ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کان کے وسط میں موجود رطوبت گاڑھی ہوکر جمنے لگتی ہے جس سے سماعت پر اثر پڑسکتا ہے۔ ایسی صورت میں ایک (Ventilation Tube) ٹیوب یا (Grommet) کو کان کے پردے کے دوسری جانب رکھا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعے رکی ہوئی رطوبت باہر نکل سکے۔ یہ ٹیوب کئی ماہ تک بھی لگی رہتی ہے۔ لیکن ایسے وقت میں جب کہ یہ ٹیوب کان میں لگائی گئی ہو، کان میں پانی نہیں جانا چاہیے اور اس کے لیے خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔

کان میں درد کی ایک اور وجہ، جو زیادہ عام نہیں ہے، کان کے وسط میں طویل عرصے تک انفیکشن ہوتا ہے جس کی وجہ سے کان کے خلیے (Mastoid Air Cells) متاثر ہوتے ہیں۔ اس انفیکشن کو Cholesteatoma کہا جاتا ہے۔ اگر یہ پھیلتا رہے تو اس سے دماغ کی ہڈی بھی متاثر ہوسکتی ہے۔ یہ ایک

مہلک بیماری ہے جس کا علاج سرجری (Surgery) کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

آلۂ سماعت (Hearing Aid): آلۂ سماعت ایک ایسی چھوٹی سی مشین ہوتی ہے جو آواز کو تیز کرکے مریض کے کان میں پہنچاتا ہے۔ یہ آلہ ان مریضوں کے لیے مفید ہوتا ہے جن کی سماعت کم ہوجاتی ہے اور عام آواز کو سننے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ اس مشین میں تین اہم حصے ہوتے ہیں جن میں مائکروفون (Micro Phone)، لاؤڈ اسپیکر (Loud Speaker) اور بیٹری (Battery) شامل ہوتی ہیں۔ یہ آلہ سماعت کئی قسموں میں دستیاب ہے۔ اگرچہ یہ آلہ معمولی یا معتدل طور پر سماعت سے محروم افراد کے لیے کارآمد ہے لیکن ان میں اب بھی کچھ خامیاں پائی جاتی ہیں۔

کوچلیئر امپلانٹ (Cochlear Implant) (کان کے اندر پیوند کاری): کوچلیئر امپلانٹ ایک ایسا آلۂ سماعت ہے جو ایسے مریضوں کے لگایا جاتا ہے جو عام آلۂ سماعت کی مدد سے بھی سننے سے محروم رہتے ہیں۔ یہ ایک الیکٹرونک مشین ہوتی ہے جو کان کے اندرونی خراب اعضا سے گزر کر براہِ راست صوتی لہریں اعصاب تک پہنچاتی ہے۔ یہ آلہ سرجری کے ذریعہ کان کے اندر نصب کیا جاتا ہے۔

احتیاطی تدابیر (Preventive Mersupes): ہمارے حواس خمسہ میں کان بہت نازک ہوتے ہیں اور مندرجہ احتیاطی تدابیر اختیار کرکے ہم سماعت کی محرومی سے کافی حد تک بچ سکتے ہیں۔

- بچوں کو درست اوقات میں ٹیکہ لگوانے سے انفیکشن سے بچا جاسکتا ہے جس کی وجہ سے سماعت متاثر ہوسکتی ہے۔
- نزلے زکام کا فوری علاج۔
- ایسے کھیلوں میں، جن میں چوٹ لگنے کا خطرہ ہو، ہیلمیٹ کا استعمال۔ کار چلاتے وقت سیٹ بیلٹ کا استعمال، جس سے سر یا کان پر چوٹ لگنے کا احتمال نہ رہے۔
- اگر نزلہ زکام ہو تو احتیاط کے ساتھ ناک سنکنا۔
- اگر نزلہ زکام ہو یا الرجی ہو تو ہوائی سفر ملتوی کرنا بہتر ہے۔
- اسکائی ڈائیونگ (Sky Diving) یا اسکوبا ڈائیونگ (Scuba Diving) کے دوران ہوا کا دباؤ فوری طور پر تبدیل ہوتا ہے جس سے کان متاثر ہوسکتا ہے۔
- ڈاکٹر کی صلاح کے بغیر کان میں کوئی دوا نہ ڈالیں۔
- زیادہ شور کی جگہوں سے پرہیز کریں۔ تیز آواز سے موسیقی سننا، یا کان میں آلہ لگا کر تیز موسیقی وغیرہ سے کان کی سماعت پر اثر پڑتا ہے۔
- پانی میں لیڈ کی زیادہ ملاوٹ کانوں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔

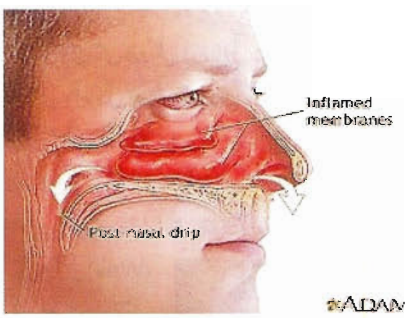

ناک اور سائی نس کی عام بیماریاں (Sinus): کبھی کبھی ناک سے سانس لینے میں دشواری محسوس ہوتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ہماری ناک بند ہے یا ناک کا ایک نتھنا بند ہے۔ ایسا نزلے کی وجہ سے بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ناک ہیں تکلیف یا سانس لینے میں دشواری کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں۔

ناک کی ہڈی ٹیڑھی ہونا (DNS): ناک کے اندرونی حصے میں درمیان میں ایک پردہ سا ہوتا ہے جو ہمارے ناک کے دونوں نتھنوں کو الگ الگ کرتا ہے اور اس طرح ناک کے ذریعے لی جانے والی سانس کی ہوا یکساں طور پر دونوں نتھنوں سے اندر حاصل ہوتی ہے لیکن اگر اندرونی حصے میں ناک کا پردہ کسی چوٹ یا آپریشن وغیرہ کی وجہ سے ٹیڑھا ہوگیا ہے تو سانس لینے میں دشواری محسوس ہوگی۔ ایسی صورت میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناک کا ایک نتھنا بند ہے۔ اس مرض کے لیے ناک کا معمولی آپریشن کیا جاتا ہے۔

ناک بہنا (Virus Bacteria): عام طور پر ناک کے اندرونی حصے میں باہری جلد کے متاثر ہونے سے ناک بہنے لگتی ہے جو کسی بیکٹیریا یا وائرس سے متاثر ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے آس پاس کسی دوا، کیمیکل، رنگ و روغن یا دھول وغیرہ کی وجہ سے بھی ناک کی اندرونی جلد متاثر ہوسکتی ہے۔

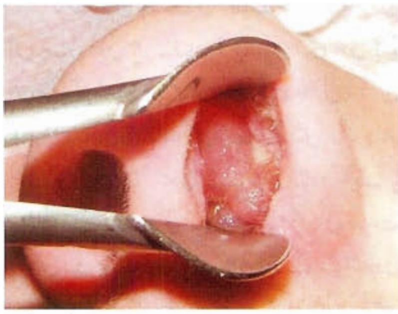

ناک میں بدگوشت (Poly Ps): ناک کے اندرونی حصے میں گوشت کے بڑھنے یا بدگوشت کی وجہ سے بھی سانس لینے میں دشواری محسوس ہوتی ہے۔ دراصل ناک کے اندرونی حصے کی جلد مسلسل نزلے وغیرہ سے کچھ موٹی ہوجاتی ہے جس سے سانس کی نالی میں ہوا کا راستہ تنگ ہوجاتا ہے۔ کبھی کبھی اندرونی حصے میں کسی پھنسی یا ورم آنے سے بھی ناک بند ہونے لگتی ہے۔

سائناسائی ٹس (Sinusitis): عام طور پر سائناسائی ٹس اور نزلے یا الرجی میں اختلاف کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ بہت عرصے تک نزلے کی شکایت کے باوجود ڈاکٹر سے رجوع نہیں کرتے اور خود ہی دوا لیتے رہتے ہیں۔ حالانکہ نزلے یا الرجی (Allergy) کے برعکس سائیناسائی ٹس کے لیے، مناسب تشخیص کے ساتھ اینٹی بائیوٹک (Antibiotic) وغیرہ کے ساتھ مناسب علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔

سائیناسائی ٹس کی علامات:

- سر درد، عام طور پر ماتھے میں درد کی شکایت
- آنکھوں کے گرد یا دانتوں کے اوپری حصے میں درد

• ناک کا بند ہونا
• زرد یا سبزی مائل بلغم اور ناک کا آنا۔
• ہلکا ہلکا بخار یا سانس میں بدبو وغیرہ۔

اگر سائی نس انفیکشن تین ماہ یا اس سے زیادہ تک جاری رہے تو اس کا علاج دشوار ہوسکتا ہے۔ عام طور پر Antibiotics کے ذریعے اس کا مناسب علاج کیا جاسکتا ہے۔ اس کا علاج (Fess) فیس سرجری سے لیا جاتا ہے۔

الرجی: کسی بھی شخص کو آنکھ، کان اور ناک کی الرجی ہوسکتی ہے۔ دراصل کسی خاص چیز سے جیسے دھول خوشبو یا کسی دوا سے، غیر معمولی ردعمل یا بہت حساس ہونے کو الرجی کہا جاسکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک شخص کو جس چیز سے الرجی ہے، دوسرے کو بھی ہو۔

الرجی کی علامات:

آنکھوں کی الرجی: آنکھیں لال ہوجانا، کھجلی، ورم یا پانی بہنا۔

ناک کی الرجی: ناک میں خارش، کھجلی، پانی بہنا وغیرہ۔

کان کی الرجی: کان میں کھجلی۔

احتیاطی تدابیر:

- الرجی والی چیزوں سے دور رہیں۔
- دھول والی جگہوں پر نہ جائیں۔
- گھاس وغیرہ پر چلتے ہوئے ناک پر کپڑا رکھیں۔
- گھر کے اندر پیڑ پودے نہ لگائیں۔
- سگریٹ نوشی نہ کریں۔
- الرجی والی خوردنی اشیا سے پرہیز کریں۔

نکسیر پھوٹنا (Epistaxis):

ناک سے اچانک خون آنے سے عام طور پر مریض بری طرح گھبرا جاتے ہیں۔ یہ بیماری اکثر بچوں اور بالغوں میں پائی جاتی ہے۔ عموماً خون کا اخراج ناک کے اندرونی حصے میں واقع پردے سے ہوتا ہے۔ نکسیر پھوٹنے

کی صورت میں مریض کو لٹا دینا چاہیے اور مریض کا سر تھوڑا پیچھے کی جانب جھکا ہونا چاہیے۔ بہتر یہ ہے کہ فوری طور پر ناک کو انگلیوں سے دبا کر چار پانچ منٹ تک بند رکھیں۔ ناک اور ماتھے پر ٹھنڈے پانی میں بھیگا ہوا کپڑا رکھنا بھی ایسی صورت میں مفید ہوتا ہے۔

احتیاطی تدابیر (Air Condition): ناک کا اندرونی حصہ مرطوب رکھیں۔ خشک موسم اور ایئر کنڈیشن کی وجہ سے ناک کے اندر کی رطوبت (Pet Roleum Jelly) خشک ہوجاتی ہے جس سے ناک کے اندر کی جلد پھٹنے لگتی ہے:

• ناک کے اندر ہلکی سی پٹرولیم جیلی لگانے سے ناک میں رطوبت قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔
• پانی اور دیگر مشروبات کا کثرت سے استعمال کریں۔
• بچوں کے ناخن بڑھنے نہ دیں۔
• ناک میں انگلی نہ ڈالیں۔
• سگریٹ نوشی نہ کریں۔

گلے کی شکایات: گلے میں ٹونسل (Tonsil) (غدود) اور ایڈی نوائیڈز (Adenoids) بڑھنے کی شکایت عام ہوتی ہے۔ دراصل یہ دونوں ایک طرح کے غدود ہوتے ہیں جو ہمارے گلے میں پیدا ہونے والے جراثیم کو فتح کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ ٹونسل اور ایڈی نوائیڈز کا انفیکشن منہ میں عام طور پر جراثیم کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ٹونسل کا انفیکشن ٹونسیلائٹس (Towsillitis) کہلاتا ہے جس میں مریض کے گلے میں درد اور دکھن کی شکایت ہوتی ہے اور کوئی بھی چیز نگلنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے بخار اور سانس میں بدبو کی شکایت ہوسکتی ہے۔ اگر سال میں تین یا چار مرتبہ اس طرح کی تکلیف ہو تو اسے آپریشن (Operation) کے ذریعے نکال دیا جاتا ہے۔

ایڈی نوائیڈز بھی ایک طرح کے غدود ہوتے ہیں جو ہماری ناک کی پشت پر ہوتے ہیں۔ یہ غدود بھی ٹونسل کی طرح جراثیم اور بیماریوں سے لڑنے میں مدد کرتے ہیں۔

بچوں میں ٹونسل اور ایڈی نوائیڈز بڑھنے کی علامات:

• بچہ آسانی سے کھانا نہیں کھا سکتا۔
• نرم اور چھوٹے چھوٹے نوالے ہی کھاتا ہے۔
• کھانا کھانے میں نگلنے میں تکلیف ہوتی ہے۔
• منہ کے ذریعے سانس لیتا ہے۔
• سوتے میں سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔
• بچے کی صحت پر اثر پڑتا ہے اور لمبائی پوری طرح نہیں بڑھتی۔
• بچے کی پڑھائی پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔

ٹونسل اور ایڈی نوائیڈز کا Antibiotics سے علاج کیا جاسکتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر سرجری کے ذریعے ان غدود کو نکالا بھی جاسکتا ہے۔

احتیاطی تدابیر (Preventive Measure):

- رقیق خوراک کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔
- شہد کے ساتھ گرم چائے کا استعمال کریں۔
- نیم گرم پانی سے غرارے کریں۔

◘

Dr. Zeenat Sultana L-16 G/F, Masjid Khalilullah (Near Transformer) Batla House, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

راشد جمال فاروقی

زہریلی سبزیوں سے نجات

مغربی روش اختیار کر کے ہم اپنی زندگی کو روز بروز مشکل تر بناتے جارہے ہیں۔ آج کاشت کاری بھی ایک منافع بخش کاروبار میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ بڑھتی آبادی کا پیٹ بھرنے کے لیے پیداوار میں اضافہ ضروری ہے لہٰذا کیمیاوی کھادوں کا اندھا دھند استعمال اور جراثیم کُش زہریلی ادویات پر انحصار بڑھتا ہی جارہا ہے۔ یہ کیمیاوی کھادیں اور زہریلی دوائیں مٹی، پانی اور ہوا کو کثیف بنا رہی ہیں۔ پیراتھیا اور ایلڈرن کا استعمال کھیتوں کو زہرناک بنا چکا ہے۔ ہماری مقدس ندیاں جو کبھی صاف وشفاف ہوتی تھیں اب ڈی ڈی ٹی اور بی ایس جی کے زہر سے تڑپ رہی ہیں۔ ندیاں صنعتی کثافت کا بوجھ بھی ڈھونے پر مجبور ہیں اور آخرکار دم توڑتی جارہی ہیں۔ پانی کی قلت سے پوری انسانیت دوچار ہے۔ پانی کی اس قلت کی ایک وجہ یہ کیمیاوی کھادیں بھی ہیں جو ہماری روایتی کھادوں کے مقابلے دس گنا زیادہ پانی خرچ کراتی ہیں۔

ہوا پانی اور مٹی کی اس کثافت کا شکار ہر شخص ہے چاہے وہ سبزی خور ہو یا گوشت خور، آج تقریباً ہر ہندوستانی روزمرہ کے کھانے میں 0.27 ملی گرام ڈی ڈی ٹی کھانے پر مجبور ہے۔ آہستہ آہستہ ہم کینسر اور دیگر موذی امراض کے اندھے غار میں سماتے چلے جارہے ہیں۔ سبزیوں پر خوش کن رنگ و روغن کا کالا کاروبار بھی عام ہے۔ سرخ ٹماٹر، چمکتے بیگن، لیلیٰ کی انگلیوں جیسی مخروطی بھنڈی اور غذائیت سے بھرپور پرول سب مصنوعی رنگ میں نہا کر بھاری قیمت ادا کرنے کے بعد ہمارے دسترخوان پر بیماریاں پروس رہے ہیں۔ تو پھر اس مصیبت سے بچنے کا کوئی حل؟

اگر آپ کے پاس تھوڑی زمین ہے جسے کچن گارڈن بنایا جاسکے تو اس کا استعمال کیجیے۔ اپنی ضرورت کی سبزیاں خود اگایے آپ کے وقت کا اچھا مصرف نکل آئے گا۔ گھر کی زینت بڑھے گی۔ آکسیجن مفت میں دستیاب ہوگی۔ گھر ٹھنڈا رہے گا۔ صحت بخش تازہ سبزیاں کم قیمت پر گھر میں میسر ہوں گی۔ گھر کا آرگینک (Organic) کوڑا کرکٹ، سبزیوں، پھلوں کے چھلکے وغیرہ کا صحیح استعمال ان کیاریوں میں کھاد کے طور پر کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم فلیٹ میں رہتے ہیں اور کیاریاں آپ کی دسترس سے دور ہیں تو یہی کام آپ گملوں میں کرسکتے ہیں۔ یقین جانیے گھر بہشت کا نمونہ بن جائے گا آپ کو ایک دلچسپ ہابی ہاتھ لگے گی اور تندرستی جیسی نعمت آپ کی مٹھی میں ہوگی۔

اس ضمن میں عرض ہے کہ ایک بار کے بعد آپ اپنی بوئی ہوئی سبزیوں سے ہی صحت مند بیج تیار کریں اور ہر بار بازار نہ دوڑیں۔ آخر تندرست بیج ہی تو تندرست پودوں کو جنم دیں گے۔ تو آیئے! بیج تیار کرنے کے طریقے جان لیتے ہیں۔

(1) ٹماٹر: اپنے بغیچے کے سب سے تندرست پودے کے دو چار ٹماٹروں کو منتخب کرلیں اور انھیں شاخوں پر خوب پکنے دیں۔

خوب پک جانے پر ان ٹماٹروں کو شاخ سے الگ کرلیں۔ انھیں کاٹ کر اسٹیل کی چھلنی میں پانی ڈالتے ہوئے ہلکے ہاتھ سے ملیں۔ کافی گودا نیچے نکل جائے گا۔ کچھ دیر یونہی چھوڑ دیں اس کے بعد ان بیجوں اور بچے ہوئے گودے کو کاغذ پر پھیلا دیں۔ بیجوں کو 1 سینٹی میٹر کی دوری پر پھیلائیں اور سائے میں سوکھنے دیں۔ سوکھ جانے

پر سنبھال کر رکھ لیں اگلے سال پودھ تیار کرنے کے لیے اس کاغذ کو یوں ہی گملے یا کیاری میں 5 ملی میٹر کی تہہ میں دبادیں۔ مٹی میں نمی رہنی چاہیے۔ بیج پھوٹ آئیں گے اور کاغذ گل جائے گا۔

(2) **پالک**: جن پودوں میں دیر تک پتیاں آتی رہیں ان میں سے تندرست پودوں کو بیج کے لیے چھوڑ دیں۔ جن پودوں میں پہلے ہی سے بیج والی ڈنٹھل آگئی ہو ان سے بیج نہ لیں۔ پک جانے پر ڈنٹھل توڑ لیں۔ سکھائیں اور بیج کو الگ کرلیں۔

(3) **گاجر**: صحت مند پودے کو پھول آنے کے لیے چھوڑ دیں۔ بیج والے حصے کو تیار ہونے پر کاٹ کر سائے میں سکھالیں اور ہاتھوں سے رگڑ کر الگ کرلیں۔

(4) **پیاز**: منتخب پیاز کی گانٹھوں کو بیج کے لیے چھوڑیں۔ بیج والی پھلی جب خوب پک جائے تو اسے توڑ کر دھوپ میں سکھائیں اور بیجوں کو ہلکے ہلکے ہاتھوں سے الگ کرلیں۔

(5) **پھول گوبھی**: بغیچہ میں دو چار پھولوں کو بیج کے لیے چھوڑ دیں جب یہ پھول پوری طرح پک جائیں تو پھول گوبھی کے بیچ کا حصہ نکال دیں جس سے کناروں سے پھولوں کے ڈنٹھل نکلنے لگیں گے۔ اگر کوئی اِلّی دکھائی دے تو اسے نکال دیں۔ بیج کی پھلی پک جانے پر کاٹ لیں۔ دھوپ میں پھلی کو سکھائیں اور بیج الگ کرلیں۔

(6) **بند گوبھی**: بیج حاصل کرنے کے لیے آپ نے جو پودا چھوڑا ہے اسے خوب پکنے دیں۔ پک جانے پر اوپری سطح پر چیرا لگادیں جس سے ڈنٹھل باہر آجائے گا۔ اِلّی نظر آئے تو ہٹادیں۔ بیج کی پھلی پک جانے پر کاٹ لیں اور دھوپ میں سکھا کر بیج الگ کرلیں۔

(7) **مٹریا سیم**: تندرست پودوں کی تندرست پھلیوں کو خوب پک جانے دیں۔ پھر توڑ کر دھوپ میں سکھالیں اور بیج الگ کرلیں۔

(8) **بینگن**: بغیچے کے صحت مند پھل کو بیج کے لیے تیار ہونے دیں۔ پھر بینگن کا باہری حصہ (چھلکا) نکال

> ہوا پانی اور مٹی کی اس کثافت کا شکار ہر شخص ہے چاہے وہ سبزی خور ہو یا گوشت خور، آج تقریباً ہر ہندوستانی روزمرہ کے کھانے میں 0.27 ملی گرام ڈی ڈی ٹی کھانے پر مجبور ہے۔ آہستہ آہستہ ہم کینسر اور دیگر موذی امراض کے اندھے غار میں سماتے چلے جارہے ہیں۔

دیں اندر کے حصے کو گول گول ٹکڑوں میں کاٹیں، ان ٹکڑوں کو رات بھر پانی میں ڈبو کر رکھیں جب تک کہ بیج گودے سے الگ نہ ہوجائے۔ بیج الگ ہونے پر صاف پانی میں ڈالیں۔ اوپر تیرتے ہوئے بیج پھینک دیں اور بچے ہوئے بیجوں کو سائے میں سکھالیں۔

(9) **بھنڈی**: منتخب پھلیوں کو پوری طرح پک جانے دیں پھر شاخ سے توڑ کر دھوپ میں سکھالیں۔ جب پھلی سوکھ جائے تو اس سے بیج نکالیں۔

(10) **مرچ**: منتخب مرچوں کو شاخ پر پک جانے دیں اور پھر توڑ کر دھوپ میں سکھالیں اور سنبھال کر رکھ لیں۔ سوکھی مرچ کو توڑ کر بیج حاصل کیے جاسکیں گے۔

(11) **مولی اور شلجم**: پک جانے پر تندرست اور سیدھی جڑوں کو اکھاڑ لیں۔ پتیوں کو تقریباً 4 سینٹی میٹر لمبائی پر کاٹ لیں پھر مولی کی جڑ کو آدھا کاٹ لیں پھر اوپری پتی والے حصہ کو اچھی طرح مٹی میں دبادیں۔ کچھ دنوں میں اس میں کئی پتیاں نکل آئیں گی۔ پتیوں کے پک جانے پر بیچ سے ڈنٹھل نکل آئے گا۔ بیج تیار ہونے پر پھلیوں کو توڑ کر سکھالیں اور بیجوں کو الگ کرلیں۔

(12) **میتھی**: میتھی کی پتیاں دو بار سبزی کے لیے استعمال کرکے منتخب پودے کو پھول اور بیج آنے کے لیے چھوڑ دیں۔ جب پھلی پک کر بھورے رنگ کی ہوجائے تو پودا کاٹ کر دھوپ میں سکھالیں اور بیج الگ کرلیں۔

(13) **خربوزہ، تربوز، کدو، لوکی اور توری**: منتخب پھل کو بیل پر ہی پوری طرح پک جانے دیں، پھل پک جانے پر اسے توڑ لیں اور کاٹ کر بیج اور گودا نکال لیں۔ ہلکے ہاتھ سے بیج اور گودا مسلیں اور ایک دو دن پانی میں رکھ دیں۔ چلتے پانی میں دھولیں گودے سے بیج الگ ہوجائیں گے۔ اب ان بیجوں کو سکھالیں۔

اس طرح ذرا سی محنت سے آپ کو خوش ذائقہ، تازہ، غذائی اجزا سے بھرپور سستی اور آرگینک (Organic) سبزی ملتی رہے گی۔ یاد رکھیے بازار کی مہنگی، زہریلی اور باسی سبزیوں کی جگہ جب آپ اپنی محنت سے تیار سبزیاں کھائیں گے تو آپ اپنی صحت کو بہتر ہوتا ہوا خود بھی محسوس کریں گے اور دوسرے بھی۔

◘

Rashid Jamal FarooquiC-1452, IDPL
Town Ship, Vir Bhadar (Rishikesh)
Dehradun - 249202 (Uttarakhand)

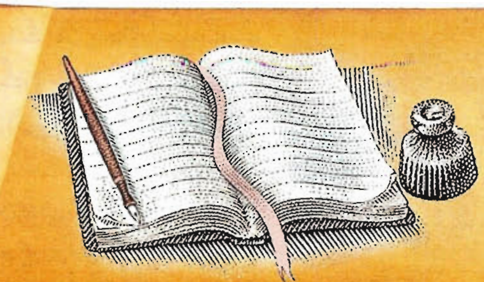

تبصرہ وتعارف

تاریخ نثر اردو: نمونۂ منثورات

مولف: احسن مارہروی، مرتب: رحیل صدیقی

صفحات: 496، قیمت: 130

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: کوثر مظہری، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو ادب میں شاعری کے نمونے اور کلیات آسانی سے دستیاب ہوجاتے ہیں جب کہ نثری نمونے کا فقدان نظر آتا ہے۔ قارئین کی دل چسپی شاعری میں ہمیشہ سے زیادہ رہی ہے۔ قومی کونسل نے حال میں احسن مارہروی کی تالیف کردہ کتاب 'نمونۂ منثورات' شائع کی ہے جسے رحیل صدیقی نے مرتب کی ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ 1398 سے عصر حاضر (1930) تک کے نثری نمونے دیے گئے ہیں۔ احسن مارہروی نے 28 صفحات پر مشتمل مقدمہ تحریر کیا ہے۔ ایسے کام کے لیے یہ مقدمہ مختصر معلوم ہوتا ہے لیکن انھوں نے دو تین یا چار پانچ نمونوں کے بعد 'تبصرہ کیفیت' کے عنوان سے نثری نمونوں کا خوبصورت تجزیہ بھی پیش کیا ہے جو دقت طلب کام تھا۔ شروع میں نمونۂ منثورات، حصہ اول کے ذیل میں انھوں نے لکھا ہے:

(حصہ اوّل) میں تاریخی حالات مفید کے سوا اردو نثر کے مذہبی، اخلاقی، طبی، سیاسی، قانونی، دفتری، مکتوبی، تقریری، اشتہاری، غرض وہ تمام نمونے جو ایک علمی اور زندہ زبان کو وقیع بناسکتے ہیں۔ 801ھ/ 1398 سے عصر حاضر تک اصلی تصنیفات وتحریرات سے نقل کیے گئے ہیں، جن کے مطالعے سے ایک معمولی طالب علم بھی اپنی مادری زبان کی تدریجی ترقی کو بہ خوبی وبہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔'' (ص xxxvii)

کتاب چوں کہ 1930 میں شائع ہوئی تھی اس لیے عصر حاضر سے 1928، 1929 تک کا خیال آتا ہے لیکن اس کتاب میں جو آخری سے پہلے نمبر شمار 43 میں خط درج ہے وہ 12 اگست 1924 ہے لیکن یہ خط دوسرے دور کے تحت جس پر 1901 تا 1930 درج ہے۔ یہ بھی ایک الگ دلچسپ نکتہ ہے کہ جس دور کا باب شروع ہے اس کے اوپر ہی تا 1930 درج ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ کتاب 1930 کے بعد شائع ہو پاتی۔ ایک دو نمونے 1926 تک کے بھی درج ہیں۔ مرتب نے ایک اور دل چسپ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اس کی ترتیب وتدوین بقول مصنف 1924 میں مکمل ہوگئی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو اس میں 1926 کے نثری نمونے کہاں سے آجاتے ہیں۔ احسن مارہروی کا ایک اقتباس پیش کرکے مرتب نے ایسا نتیجہ اخذ کیا ہے جو کہ غلط ہے۔ وہ اقتباس یہ ہے:

''اس کتاب کی تالیف اب سے سات آٹھ برس پہلے شروع ہوئی تھی اور دو تین سال کی لگاتار محنت نے اس قابل کردیا تھا کہ شائع کردی جاتی مگر بعض موانع ایسے حائل ہوئے کہ یہ خیال پورا نہ ہوسکا۔'' (ص: xxxiii)

اگر مؤلف کی بات مان لی جائے تو 1930 سے سات سال پہلے کا مطلب ہے 1923 اور اگر آٹھ سال پہلے کتاب مکمل ہوگئی تھی تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کتاب 1922 میں مکمل ہوگئی تھی۔ دراصل سات آٹھ اور دو تین سال کہنے سے اور بھی غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ رسالہ 'زمانہ' مارچ 1931 صفحہ 200 پر دونوں جلدوں کے سولہ نمونوں کی فہرست شائع ہوئی تھی۔ اس سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ دوسری جلد بھی مکمل ہوچکی تھی لیکن وہ دست برد زمانہ کا شکار ہوگئی۔ مصنف نے اپنے مقدمے میں ایک جگہ لکھا ہے:

''نمونے کا سلسلہ 1338 سے 1929 تک پھیلا ہوا ہے۔ اس التزام سے یہ آسانی معلوم ہوجائے گا کہ ہر دور میں کتنی کتابوں کے نمونے اس مجموعے میں مندرج ہوئے ہیں۔'' (ص: 25)

اگر ایسا ہے تو معلوم نہیں رسالہ 'زمانہ' میں نمونوں کے اشتہار میں ان کی تحدید کے لیے 1930 کیوں درج ہے؟

بہرحال تحقیقی نوعیتوں سے قطع نظر اس کتاب کی افادیت کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ مؤلف کی محنت وکاوش کا اندازہ نمونوں کے تنوع سے ظاہر ہے۔ پھر یہ کہ بہت سے نمونے انھوں نے قلمی نسخوں سے نقل کیے ہیں۔ یہ بھی اہتمام ملتا ہے کہ الفاظ کے قدیم املا کے بریکٹ میں جدید املا بھی لکھا گیا ہے۔ اپنے مقدمے میں انھوں نے محمود شیرانی کے ذریعے 'پنجاب میں اردو' میں اردو کی پیدائش کا مولد ومسکن پنجاب کو قرار دیے جانے کی تردید کی ہے، جو دل چسپی سے خالی نہیں۔

'نمونۂ منثورات' کی اشاعت سے اردو کے اساتذہ اور طلبہ دونوں مستفیض ومستفید ہوسکیں گے۔ ایک ساتھ ایک ہی کتاب میں مختلف اقسام کے نثری نمونوں سے اگر کوئی تنقیدی تجزیہ یا نثری ارتقا کی صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہے تو اُسے بڑی آسانی ہوگی۔ رحیل صدیقی مرتب کتاب ہذا مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس جانب توجہ کی اور قومی کونسل بھی شکریے کی مستحق ہے کہ اس قیمتی ورثے کی دوبارہ اشاعت کی طرف دھیان دیا۔

عیارالشعرا

مصنف: خوب چند ذکا

صفحات: 805 قیمت: -/200 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عزیز احمد خان، جی 50، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی 110025

شعرائے اردو کے تذکروں کی اہمیت اور افادیت مسلّم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تذکروں کے متعلق ہمارے ناقدین کی آرا افراط وتفریط کی شکار ہیں۔ اس سے قطع نظر اگر غیر جانب داری سے تذکروں کا جائزہ لیا جائے تو انھیں جدید اردو تنقید کی بنیاد اور ماخذ قرار دینے میں کوئی قباحت نہیں ہوگی اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ بہت سے غیر معروف اور علاقائی سطح کے بعض اہم شعرا سے متعلق معلومات کا واحد ذریعہ یہی تذکرے ہیں۔ اس کے علاوہ ان تذکروں کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اردو نثر کے ارتقا میں ان کا اہم رول رہا

ہے۔ نیز ان تذکروں کی بدولت اردوادب میں سوانحی، تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی شعور پیدا ہوا۔ پھر اگر یہ تذکرے کوئی بہت بڑا کارنامہ نہ قرار دیے جائیں تو کم از کم اس بنا پر بھی انھیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ہمارا قدیم ادبی ورثہ ہیں۔ یہ دلچسپ اتفاق ہے کہ اردو شعرا کے اولین اور بیشتر اہم تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے بعد میں اردو زبان میں کئی اہم تذکرے لکھے گئے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جوشہرت فارسی تذکروں مثلاً نکات الشعرا، عیارالشعرا، گلشن بے خار وغیرہ کے حصے میں آئی اردو کے تذکرے کم ہی اتنے مشہور ہوئے۔ ہمارے اولین تذکرہ نگار اردو میں تذکرہ نگاری کی داغ بیل ڈال رہے تھے تو شعرائے فارسی کے تذکرے ان کے پیش نظر تھے۔ اس لیے فارسی تذکرہ نگاری کے محاسن و معائب بھی اردو میں منتقل ہوئے اور شعرائے اردو کے تذکروں کی تالیف کے ساتھ تذکرہ نگاری اور اس کے فن پر بحث شروع ہوگئی۔

زیر تبصرہ تذکرہ عیارالشعرا از خوب چند ذکا اردو شعرا سے متعلق چند اہم تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی ضخامت ایک ہزار صفحات کے قریب ہے جس میں تقریباً ایک ہزار شعرا کے حالات وکلام فراہم کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی خوب چند ذکا نے اپنے تذکرے کو زیادہ مکمل اور جامع شکل میں پیش کرنے کی سعی کی ہے جس کے لیے انھوں نے تذکروں سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ شعرا سے براہ راست ان کے حالات زندگی اور کلام حاصل کرنے کی کوشش کی، اور اس طرح اس تذکرے کے ذریعے پہلی مرتبہ ایسے شعرا کو بھی منظر عام پر آنے کا موقع ملا جسے دوسرے تذکرہ نگار نظرانداز کرچکے تھے۔ اس تذکرے میں غیر مسلم شعرا کی تعداد بھی دوسرے تذکروں سے زیادہ ہے اور بقول حنیف احمد نقوی ''اس اعتبار سے عیارالشعرا اردو زبان وادب کے جمہوری کردار کی وضاحت کے نقطۂ نظر سے دوہری اہمیت کا حامل ہے۔'' اس تذکرے کے ذریعے کئی ایسے شعرا کو زندگی مل گئی جن کے کارنامے آج ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یا تو ان کے کلام مدون ہی نہ ہوسکے یا پھر محفوظ نہ رہ سکے۔ اس تذکرے کے متعلق دوسرے تذکرہ نگاروں اور ناقدین نے جو رائیں قائم کی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عیارالشعرا ایک اوسط درجے کا تذکرہ ہے۔ اگرچہ اس کا معیار تذکروں میں بہت بلند نہیں تاہم اس کی اس خوبی کا اعتراف کم وبیش تمام لوگوں نے کیا ہے کہ خوب چند ذکا ایک مبسوط تذکرہ مرتب کرنا چاہتے تھے جس میں زیادہ سے زیادہ شعرا کے حالات وکلام یکجا کردیے جائیں گویا وہ ایک طرح سے اردو شعرا کی انسائیکلوپیڈیا ترتیب دینا چاہتے تھے۔ اور اسی مقصد کو پیش نظر رکھنے کے باعث اس میں بعض خامیاں راہ پاگئی ہیں مثلاً بعض اہم شعرا کے حالات بھی بہت مختصر ہیں کہیں کہیں تکرار بھی پائی جاتی ہے۔

عیارالشعرا جیسے ضخیم تذکرے میں اس نوع کی خامیوں کا راہ پاجانا باعث حیرت نہیں۔

اس تذکرے کے مرتبین سید محمد طارق اور سید نورالحسن نقوی جیسے معروف ناقد ومحقق ہیں۔ مرتبین نے کم وبیش پچاس صفحات کے مقدمے میں اس تذکرے کی خوبیوں اور خامیوں پر تفصیل سے بحث کی ہے جس سے تذکرے کی اہمیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی تدوین کے دوران مرتبین کے پیش نظر عیارالشعرا کے جو دو نسخے رہے ہیں ان میں سے ایک نسخہ انجمن ترقی اردو ہند کی لائبریری کی ملکیت اور دوسرا نسخہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانے کی۔ ان دونوں نسخوں سے متعلق اہم معلومات بھی درج کی گئی ہیں۔ اس طرح مرتبین نے اس تذکرہ کو نہایت ذمے داری سے مرتب کیا ہے اور اسی اہتمام سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اسے شائع کیا ہے۔ عمدہ کاغذ اور صاف ستھری طباعت کے ساتھ نہایت ارزاں قیمت پر فراہم کرکے کونسل نے ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ کونسل کی اس پیشکش کی علمی وادبی حلقوں میں پذیرائی یقینی ہے۔

راجہ رام موہن رائے

مصنف: سچند رلال گھوش، مرتبہ: انعام الحق

صفحات: 112، قیمت: 16 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: احمد علی، 211 لوہت ہاسٹل،

جے این یو، نئی دہلی 110067

زیر تبصرہ کتاب ''راجہ رام موہن رائے'' سچند رلال گھوش کی تصنیف ہے۔ انعام الحق نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں جدید ہندوستان کے ایک عظیم رہنما راجہ رام موہن رائے کی سوانح حیات اور ان کے روشن کارناموں کو مختصر اور جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ راجہ رام موہن رائے ہندوستان کی ایک نابغہ روزگار اور کثیر الجہات شخصیت تھی۔ وہ ایک عظیم سماجی مصلح، جدید ہندوستان کے معمار ہونے کے ساتھ ساتھ مصنف، معلم، مترجم، صحافی، مفکر اور دانشور تھے۔ وہ ترقی پسند، روشن خیال، وسیع الفکر اور بالغ النظر انسان تھے۔ بلا کے ذہین اور انتہائی تجربہ کار شخص تھے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جہالت واوہام پرستی میں غرق ہندو سماج کی اصلاح پر زور دیا۔ انھیں جہالت وتنگ نظری اور دقیانوسیت کی وادیوں سے نکال کر ترقی، روشن خیالی اور علم ودانش کی طرف متوجہ کیا۔ ان کی شخصیت کا ایک تابناک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے روشن خیالات وافکار سے کام لے کر ہندوستانی عوام میں اعتماد وخودداری کی لہر پیدا کی۔ پُرانے سماجی نصاب کو رد کرکے نئے سماجی نصاب کو مرتب کیا۔ عورتوں کی آزادی وبرابری اور مساوات کا نعرہ بلند کیا۔ سماجی بے انصافی، بُرے رسم ورواج، جیسے ستی کی رسم، چھوا چھوت کی رسم اور دوسرے بُرے رسوم اور بُرے طور طریقوں کے خلاف جدوجہد کی۔ جدید تعلیم اور جدید خیالات سے لوگوں کو آشنا کیا۔ سماج کی اصلاح کے لیے برہموسماج کی بنیاد ڈالی۔ اس تحریک کا اہم مقصد عوام کو جدید تعلیم اور جدید فکر وخیالات سے آراستہ وپیراستہ کرنا اور عوام میں بیداری کی لہر پیدا کرنا تھا۔ راجہ رام موہن رائے کی اس تحریک نے ہندوستانی سماج میں زبردست ہلچل پیدا کی۔ اس تحریک سے آگے چل کر بیشتر جدید تحریکوں نے جنم لیا۔ نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے لیے بھی برہموسماج کی تحریک نے بنیاد فراہم کی۔ برہموسماج کی تحریک نے ہندوستانی عوام میں ایسے تصورات وخیالات کو جنم دیا اور ایسے افکار ونظریات کو عام کیا جن سے جدید ہندوستان کی تعمیر وتشکیل میں مدد ملی۔ اسی لیے راجہ رام موہن رائے کو جدید ہندوستان کا معمار کہا جاتا ہے۔ اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف رقم طراز ہیں:

''رابندرناتھ ٹیگور نے کہا ہے کہ راجہ رام موہن رائے سے جدید زمانے کا آغاز ہوا۔ وہ اُس زمانے میں پیدا ہوئے جب کہ ہمارا ملک اپنی اندرونی صداقت کا رشتہ کھو چکا تھا اور ماحول کی ذلّت آمیز غلامی میں پامال کردینے والے بے وجہ بار سے تنگ آکر ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اُس وقت ہم نے زوال پذیر روایات پر مبنی سماجی رواج، سیاسیات اور مذہب وفن کے حلقے میں غیر فطری عادات کو اختیار کرکے اپنی انسانیت کو بروئے کار لانا ترک کردیا تھا۔ ہندوستان کی پستی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں راجہ رام موہن رائے تاریخ ہند کے آسمان پر درخشاں ستارے کی طرح نمودار ہوئے۔ وہ اس صدی کے بہت بڑے رہنما تھے جنھوں نے اُن بھاری رُکاوٹوں کو دور کیا جو ہر قدم پر ہماری ترقی میں مزاحم تھیں اور ہمیں انسانیت کے عالمگیر تعاون کے موجودہ دور سے روشناس کیا۔ راجہ رام موہن رائے عالم انسانیت میں اپنے زمانے کے تنہا ایسے شخص تھے، جنھوں نے جدید زمانے کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کیا۔ انھوں نے قومی زندگی کے ہر ماحول کو اعلی

بصیرت اور دانائی بخشی۔''

یہ امر مسلّمہ ہے کہ راجہ رام موہن رائے نے ہندوستانی سماج کے لیے وسیع تر سماجی اصلاح کا فریضہ انجام دیا۔ ان کی اصلاحی کوششوں کے نتیجے میں ہندوستانی سماج جہالت، توہم پرستی، تنگ نظری، کٹر پسندی، دقیانوسیت کے بھنور سے نکل کر روشن خیالی، وسعت نظری، مساوات و ہم آہنگی، انسانیت و بھائی چارگی اور ترقی و خوشحالی کی طرف گامزن ہوا۔ آج ہندوستانی سماج جس ترقی و خوش حالی کی طرف گامزن ہے، اس کے ایک اہم بنیاد گذار راجہ رام موہن رائے تھے۔ ان کے روشن افکار و نظریات اور ترقی پسند خیالات آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ ان کے ہمہ گیر افکار و نظریات سے استفادہ کر کے ہم آج بھی سماج کے انجماد و انحطاط اور تنزّلی کو دور کر سکتے ہیں۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر سچندر لال گھوش نے راجہ رام موہن رائے کی عبقری شخصیت اور ان کے عظیم کارناموں پر مشتمل یہ کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب 112 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں راجہ رام موہن رائے کے سوانح اور کارناموں پر اختصار سے مگر جامع اور معروضی انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ راجہ رام موہن رائے کی شخصیت کے اہم پہلوؤں اور ان کے اہم کارناموں ہی کو بیان کیا گیا ہے جو ہمارے اسکول کے بچّوں کے لیے بے حد مفید ہے۔ اسکولی نصاب کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی یہ کتاب بلاشبہ کارآمد اور مفید ہے۔ اس کتاب کو انعام الحق نے مرتب کیا ہے۔ انھوں نے کتاب کی ترتیب و تدوین میں انہماک و ذمہ داری اور خوش اسلوبی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے خوب صورت اور سہل بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ کتاب اسکولی بچّوں اور نوجوانوں کے لیے بے حد کارآمد اور مفید ہے۔

تپش نامۂ تمنا

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

صفحات: 358، قیمت: 194

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر وسیم بیگم E-141، اسٹریٹ نمبر 21، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی 25

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تصنیف 'تپش نامہ تمنا' حال ہی میں منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس میں تنقیدی و تحقیقی 21 مضامین شامل ہیں۔ یہ کتاب اپنے عنوان کی طرح دلچسپ اور موثر ہے۔ ان میں خاص اردو زبان و لسانیات (2006)، فکشن شعریات: تشکیل و تنقید (2009) دیکھنا تقریر کی لذت (2010) کاغذ آتش زدہ (2011) ہیں۔

پروفیسر نارنگ کی ہندوستانی مشترکہ تہذیب پر گہری نظر ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے جو بھی تحقیق کی ہے وہ ہر اعتبار سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ وہ اپنی تصنیف میں معروضات سے کام نہیں لیتے۔ بلکہ مستند حوالوں سے اپنی بات کو پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے تحقیقی کارنامے اردو ادب میں تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں بھی چند نایاب نگینے ایسے چھپے ہوئے ہیں جو تحقیقی اعتبار سے قابلِ داد ہیں۔ ان میں سب سے اہم مضمون 'عہد اورنگ زیب کی اردو نثر کے تین نمونے: اردو زبان (ہندسانی) کی پہلی گرامر ہے، اس میں مصنف نے 'ہندستانی' یعنی اردو زبان کی پہلی گرامرؔ سے بحث کی ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اردو کی پہلی گرامر فضل علی فضلی کی کربل کتھا سے کم از کم پینتیس سال پہلے لکھی جا چکی تھی۔ بقول پروفیسر نارنگ:

''... سترہویں صدی کے اواخر کے یہ نثر پارے اردو کے نثری نمونے ہیں اور اب تک دستیاب شدہ نثری کی نمونوں میں سے ترجموں کے سب سے قدیم یعنی اولین نمونے ہیں۔ اب تک کی تحقیقات کے مطابق فضل علی فضلی کی کربل کتھا (زمانۂ تصنیف 33-1732) کو شمالی ہند میں اردو کی پہلی مستند نثری تصنیف تسلیم کیا گیا ہے۔ اسے اتفاق ہی کہا جائے گا کہ کربل کتھا (دہ مجلس) بھی نوعیت کے اعتبار سے مذہبی کتاب ہے ملا واعظ حسین کاشفی کی روضۃ الشہدا کا ترجمہ اور یہ نثری نمونے بھی مذہبی دعاؤں کا آزاد ترجمہ ہیں، فضلی کا آزاد ترجمہ فارسی سے ہے۔ کیٹیلیئر کا ترجمہ ڈچ زبان سے ہے۔'' (ص 31)

اپنے ایک دیگر مضمون میں مصنف نے قوالی کے متعلق اہم تحقیقی معلومات فراہم کی ہیں قوالی کی تاریخ کیا ہے؟ یہ ہندستان میں کب اور کہاں سے آئی؟ اور پھر آہستہ آہستہ اس نے کس طرح اسلامی اور ہندستانی رنگ اختیار کیا۔ 'قوالی کا چلن اور اردو غزل: ہند اسلامی تہذیبی ارتباط کا مرقع' میں پروفیسر نارنگ نے اس امر کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

''مسلمانوں کی آمد ہند کے بعد رفتہ رفتہ جو مشترک تہذیب وجود میں آئی، اس کا اظہار تصوف کے وجودی فلسفے اور بھکتی تحریک میں ہوا۔ بایں ہمہ ہندو مسلم ذہن کا جو امتزاج مذہبی سطح پر پوری طرح نہیں ہوسکا تھا، وہ موسیقی اور فنونِ لطیفہ میں پوری طرح سامنے آیا۔'' (ص 53)

امیر خسرو موسیقی کے دلدادہ تھے۔ آہستہ آہستہ اردو شعرا نے موسیقی میں دلچسپی لینی شروع کی۔ کلاسیکی شعرا کی غزلوں میں موسیقی کی جھنکار کو صاف سنا جاسکتا ہے۔ اس طرح غزل اور قوالی کا دائرہ آہستہ آہستہ وسیع ہوا۔ مصنف نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ ''قوالی جس کا آغاز عہدِ وسطیٰ میں خانقاہوں کی مذہبی روحانی موسیقی کے طور پر ہوا تھا آج برصغیر کی عام سیکولر موسیقی Pop Culture کا ایک حصہ بن چکی ہے جس کے بغیر موجودہ منظر نامے کا تصور کیا ہی نہیں جاسکتا۔'' (ص 65)

اس کتاب کے دوسرے حصے کے مضامین میں پروفیسر نارنگ نے بہت سی اہم شخصیات، ان کی ادبی زندگی نیز ان کے علم و فن پر اپنے قابلِ قدر خیالات کا اظہار کیا ہے۔

انقلابی شاعر جوش کے فکر و فن پر اپنی رائے کا اظہار کیا، شجاع خاور کی شاعری کی ایسی خصوصیات پر اپنی توجہ مرکوز کی، جو ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ اشفاق حسین کی شاعری کا تجزیہ اسلوبیاتی، تہذیبی اور سماجی سطح پر اس طرح کیا ہے کہ ان کی پوری شخصیت کھل کر قاری کے سامنے آگئی ہے۔ پروفیسر نارنگ لکھتے ہیں:

''خوشی کی بات ہے کہ اشفاق حسین کی شاعری دل کے آنگن میں درد کا مہتاب بھی رکھتی ہے۔ اس کا جگنو اور دکھ کی ٹیس بھی۔ اس میں سوز و ساز و جستجو و آرزو کی حساب فہمی کا حوصلہ ہے اور جو کسوٹی اشفاق حسین نے شاعری کے لیے وضع کی ہے خود ان کا کلام اس پر پورا اترنے کی بشارت کا امکان رکھتا ہے۔'' (ص 213)

تیسرے حصے میں تین انٹرویو ہیں جو وقتاً فوقتاً پروفیسر نارنگ سے نوائے وقت (لاہور) چہار سو (راولپنڈی) اذکار (بنگلور) نے لیے ہیں۔ مصنف کی یہ گفتگو اردو ادب کے قاری کے لیے نئی اور روشن راہیں بھی ہموار کرتی ہے۔

دلی میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیے جانے پر نارنگ صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار ایک انٹرویو (چہار سو) میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

''کچھ فائدہ تو ہوگا ہی۔ اردو دہلی سے کبھی غائب نہیں ہوئی۔ دہلی قدیم کے ایک

بڑے حصے میں اردو برابر بولی جاتی رہی ہے۔ اردو کو دوسری زبان کہنا مجھ کو اچھا نہیں لگتا۔ جو کل بیگم تھی وہ آج باندی ہوگئی ... خدا کرے کہ دہلی کے اسکولوں میں اور ابتدائی تعلیم میں اردو پوری طرح رائج ہو جائے یہ کام ہو گیا تو باقی دروازے اردو زبان اپنے آپ کھول لے گی۔'' (254)

آخری حصے میں غبارِ کارواں کے عنوان سے نیم ہندستانی تحریریں پیش کی گئی ہیں۔ یہ تینوں تحریریں تحقیقی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ مصنف کا مضمون 'جامعہ ملیہ اسلامیہ، حنیف کیفی اور میں' کو پڑھ لیجیے۔ آج سے تقریباً تیس پینتیس برس پہلے کا جیتا جاگتا جامعہ کا نمونہ آپ کے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ ان کی تحریر کی یہی وہ خوبی ہے جس میں قاری مکمل طور پر ڈوب کر کچھ پالینے کی چاہ رکھتا ہے، اور اسی خصوصیت نے ایک انسان دوست آدمی کو اردو زبان وادب کا ایک بلند پایہ کا نقاد اور محقق بنایا۔

'تپش نامۂ تمنا' اپنے عنوان، مواد، ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے ایک ایسی کتاب ہے جو قاری کے ذہن کی گرہوں کو کھولنے کے ساتھ اس کو نئی روشنی عطا کرتی ہے پروفیسر نارنگ اپنے اس ناقابل فراموش کارنامے کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید ہے اردو شعر وادب کے قاری اس موقر کتاب سے مستفید ہوں گے۔

کتاب شماری

مصنف: پروفیسر مظفر حنفی
صفحات: 424، قیمت: 300 روپے
رابطہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی 110002
مبصر: ممتاز الحق E 227، ابوالفضل انکلیو II، نئی دہلی 25

کسی زبان میں حوالہ جاتی ادب کا سرمایہ کتنا اور کس معیار کا ہے اس سے بھی اس زبان کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یوں تو اردو میں حوالہ جاتی ادب کی کمی کا احساس سبھی کو ہے مگر بدقسمتی سے اس سمت میں ابھی تک جو کام ہوئے ہیں اسے تسلی بخش نہیں کہا جاسکتا اس معاملے میں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے اگر اردو کا مقابلہ کریں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

حوالہ جاتی ادب کی کئی کئی شاخیں ہیں۔ ان میں کتابیات کی بڑی اہمیت ہے کسی علمی و تحقیقی کام کی ابتدا کتابیات سے ہی ہوتی ہے۔ خود کتابیات کی بھی کئی شاخیں ہیں مثلاً ادبیات کی کتابیات، مختلف علوم کی کتابیات، مشاہیر کی کتابیات وغیرہ۔ اسی طرح اگر ہم صرف ادبیات کا ذکر کریں تو اس میں اصناف، شخصیات، ادوار اور تحریکات وغیرہ کی کتابیات تیار کی جاسکتی ہیں مگر بنیادی کام تمام مطبوعات کی کتابیات تیار کرنا ہے اگر ایک بار یہ کام مکمل ہوجائے تو دیگر ذیلی شاخوں کی کتابیات تیار کرنا آسان ہوجائے گی۔

اردو میں سب سے پہلے محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی نے الفہرست کے نام سے کتابیات مرتب کی تھی۔ مولوی عبدالحق نے قاموس الکتب کے نام سے کتابیات ترتیب دی تھی ہندوستان میں آزادی کے بعد اس کام کی باضابطہ ابتدا 1976 میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر مظفر حنفی نے شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں کی۔

کتاب شماری اسی سلسلے کی ایک اہم کتاب ہے جس میں ہندوستان میں 1976 سے 1999 کے درمیان شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست بڑے سلیقے سے ترتیب دی گئی ہے۔ کتاب سولہ فصلوں پر مشتمل ہے پہلی فصل میں 1976 تا 1999 کے دوران شائع کتابوں کا سال بہ سال جائزہ پیش کیا گیا ہے اس کے بعد کی فصلیں مختلف اصناف کے لیے مخصوص ہیں جیسے ادبی تحقیق وتنقید، شاعری، ناول/ داستان، افسانہ/لوک کہانی، انشائیہ/ مضمون/ خاکہ/ انٹرویو، ڈراما، سوانح عمری/ آپ بیتی/شخصی خاکے، سفرنامے/ مکتوبات، زبان، سماجی علوم، تہذیب/ سیاسیات، تعلیم، سائنسی علوم/ طب، مذہبیات، ادب اطفال/ درسیات، صنعت حرفت/متفرقات۔

اس دوران مجموعی طور پر 16772 کتابیں شائع ہوئیں۔ پروفیسر مظفر حنفی نے برسہابرس کی محنت اور لگن سے یہ کتاب کچھ اس خوبی سے تیار کی ہے کہ مذکورہ بالا مدت میں چھپنے والی ہزاروں میں سے کوئی بھی کتاب اصناف، ادوار یا اشخاص کے حوالے سے آسانی کے ساتھ تلاش کی جاسکتی ہے۔ کسی تحقیقی کام کا آغاز کتابیات کی تیاری سے ہوتا ہے۔ اس کے لیے محقق کو کئی لائبریریوں کی خاک چھاننی پڑتی ہے، ہزاروں کتابوں کی فہرستوں اور مصنّفین کی فہرستوں اور لائبریری کے کیٹلاگ سے سر کھپانا پڑتا ہے۔ تب کہیں جاکر متعلقہ موضوع کام آنے والی تصنیفات اور مصنّفین کی فہرست مکمل ہو پاتی ہے اور یہی وہ بنیادی کام ہے جس کی مدد سے تحقیقی کام کی ابتدا ہوتی ہے۔

یوں مختلف پبلشنگ ادارے اپنی کتابوں کی فہرست وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہتے ہیں مگر ان میں کسی ترتیب کا خیال نہیں رکھا جاتا اس لیے ان سے ایک حد تک ہی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ کتاب شماری میں متعلقہ مدت کے دوران شائع تمام کتابیں شامل ہیں یہ دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا البتہ کوشش کی گئی ہے کہ کسی اہم کتاب کا اندراج چھوٹ نہ جائے مجھے یقین ہے کہ کتاب شماری وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی حوالہ جاتی اہمیت میں اضافہ کرتی رہے گی اور آئندہ زمانے میں اردو زبان وادب کے کسی بھی تحقیقی کام میں اس کتاب سے استفادہ کرنا محققین کے لیے ناگزیر ہوگا۔

خواجہ حسن نظامی کی نثر (ثقافتی لائحۂ عمل)

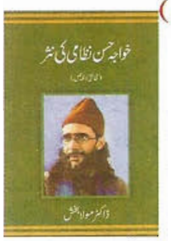

مصنف: ڈاکٹر مولا بخش
صفحات: 224، قیمت: 200 روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: ڈاکٹر شاذیہ عمیر، N-131، تیسری منزل، قادری مسجد لین-5، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی 25

'خواجہ حسن نظامی کی نثر (ثقافتی لائحۂ عمل)' ڈاکٹر مولا بخش کی تیسری کتاب ہے۔ ڈاکٹر مولا بخش نے خواجہ صاحب کی صوفیانہ طرز زندگی اور ایک دنیادار کی حیثیت سے کارزارِ حیات میں جو انھوں نے کردار نبھایا ان دونوں رنگوں کے امتزاج نے ان کی تحریر پر جو اثرات مرتسم کیے اس کے ایک ایک گوشے پر اپنے علمی و تجزیاتی انداز نقد کی ایسی شعاعیں بکھیری ہیں کہ پوری کتاب علم ودانش کی حرارت سے بقعۂ نور ہو اٹھی ہے۔

کتاب کا فلیپ نوجوان ناقد اور شاعر ڈاکٹر کوثر مظہری کی تحریر سے مزین ہے۔

کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں شخصیت و ذہنی تشکیل پر گفتگو کرتے ہوئے خواجہ کا خاندان، پرورش و پرداخت، وضع داری و دوست داری وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرا باب 'متون کا تاریخی وثقافتی محور' ہے جس کے تحت سولہویں صدی کی بھگتی تحریک سے لے کر بیسویں صدی تک کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی تغیرات نے حضرت خواجہ کے ذہن ودل پر جو اثرات مرتسم کیے نیز ان اثرات کے زیر اثر ان کی تحریر رد وقبول کے جن مراحل سے گزری ان تمام امور پر انتہائی صبر وتحمل کے ساتھ بڑے ہی تفصیلی انداز میں گفتگو کی گئی ہے تاکہ آگے چل کر جب نثر خواجہ پر گفتگو کی جائے تو اس کے مدوجزر کو سمجھنے میں قاری کو کسی طرح کی دقت محسوس نہ ہو۔

تیسرا باب 'خواجہ حسن نظامی کی نثر اور تصوف کے مسائل' پر مبنی ہے۔

باب چہارم میں 'خواجہ حسن کی صحافت نگاری' پر روشنی ڈالتے ہوئے اس نکتے کی وضاحت کی گئی ہے کہ وہ دور جب اردو صحافت میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی، محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں جیسی دیو قامت شخصیتیں موجود تھیں خواجہ صاحب نے اردو صحافت کی دنیا میں نہ صرف یہ کہ بڑے وقار کے ساتھ قدم رکھا بلکہ ان کے ہر اخبار کا ایک واضح مقصد بھی نظر آتا ہے۔

باب پنجم روزنامچہ نگاری کے جائزے پر مختص ہے۔ ڈاکٹر مولا بخش لکھتے ہیں:

''جس طرح شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو وہ کچھ نہیں رہ جاتے اسی طرح خواجہ حسن نظامی سے روزنامچوں کو اور روزنامچوں کو خواجہ سے الگ کر کے ہم ان کی مکمل ادبی شناخت کا تصور نہیں کر سکتے۔''

چھٹے باب میں 'سفرنامہ نگاری' سے بحث کرتے ہوئے خواجہ کے افسانوی اسلوب، واقعہ نگاری اور تاریخ نگاری کو مرکز توجہ بنایا ہے۔ نیز اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ خواجہ نے جس طرح فلسطین، حجاز، لبنان، افغانستان وغیرہ کے اسفار کو حیطۂ تحریر میں لا کر زندہ جاوید کر دیا اسی طرح مقامی سطح کے اسفار کو بھی انھوں نے انتہائی ذوق وشوق سے صفحۂ قرطاس میں محفوظ کر لیا جس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ بظاہر چھوٹی چھوٹی اور معمولی دکھائی دینے والی اشیا بھی ان کے نزدیک ویسی ہی پرشکوہ و پرجلال تھیں جیسی کوئی انتہائی اہم وغیر معمولی شے ہوتی ہے۔

ساتواں باب 'خواجہ حسن نظامی کی خاکہ نگاری' پر مبنی ہے، اس میں خواجہ حسن نظامی کی معروضیت اور ہو بہو تصویر بنانے کی سعی پر اظہار خیال کیا گیا ہے نیز خوش طبعی ومزاح کی چاشنی اور تخیلی وافسانوی مرقع کشی کو خواجہ حسن نظامی کی خاکہ نگاری کی ایک اہم خوبی بتایا ہے۔

آٹھواں باب 'خواجہ حسن نظامی اور انشائیے کا فن' ہے۔ مصنف نے بڑا ہی اہم نکتہ پیش کیا ہے کہ ایک صوفی ہونے کی وجہ سے خواجہ صاحب کی نگاہ زیادہ تر متصوفانہ وعارفانہ نکتوں پر ہی مرکوز رہتی ہے لیکن اس کے باوجود جس طرح انھوں نے ان نکتوں کو ادب کے لباس میں پیش کیا ہے نثر میں اس کی مثال انھیں کی ذات تک محدود ہے۔ مزید وہ اشیا جن کے بارے میں ہم ایک بار رک کر سوچنا تک گوارہ نہیں کرتے خواجہ صاحب نے انھیں نہ صرف یہ کہ اپنے مطالعے کا موضوع بنایا بلکہ اس پر باضابطہ مضامین لکھے جیسے جھینگر کا جنازہ، دیا سلائی، مٹی کا تیل، لالٹین وغیرہ مضامین اس کی عمدہ مثال ہے۔

نواں باب 'خواجہ حسن نظامی فکشن اور بیانیہ' میں مصنف نے اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ خواجہ صاحب نے 1857 کے بعد مغل تاجداروں، شہزادوں، شہزادیوں، لواحقین، مقربین اور خود بہادر شاہ ظفر پر کیا گزری، تاریخ کے بجائے اسے فکشن کی نظر سے دیکھا۔

دسواں باب 'خواجہ حسن نظامی کا نثری اسلوب ایک ثقافتی لائحہ عمل' میں خواجہ صاحب نے غنائیت، صنعت اشتقاق، تجنیس صوتی، استعارہ، تشبیہوں، ندائیہ جملے، فجائیہ جملے، ترصیع، تمثیل وغیرہ کے استعمال سے اپنی نثر کو جس طرح منفرد وانوکھا بنایا یہ کارنامہ مصنف کے نزدیک اسلوب کے بجائے اسالیب خلق کرنے کی سعادت ہے جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔

گویا پوری کتاب ایک ایسے خواجہ حسن نظامی سے ہمارا تعارف کراتی ہے جس نے بیان فطرت کے جلال وجمال کا رنگ، معاشرے اور سماج کی عکاسی، مذہب اور تصوف کے ہیولے، زندگی اور اس کی فلسفیانہ تعبیر وتشریح نیز چھوٹی چھوٹی غیر معمولی اشیا کی اہمیت کا اپنے ثقافتی وتہذیبی تناظر کے ساتھ پورے شدومد سے موجود ہے۔ امید ہے ادبی حلقوں میں اس کتاب کی بے حد پذیرائی ہوگی۔

خواب سمندر

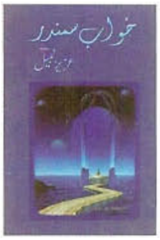

شاعر: عزیز نبیل
صفحات: 208، قیمت: /150 روپے (25 ریال)
ناشر: انجمن محبان اردو ہند، قطر
مبصر: ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف،
علامہ اقبال اسٹریٹ سنبھل، ضلع بھیم نگر، یوپی 244302

یہ بات اب ادبی حلقوں سے بڑھ کر عوامی طور پر بھی شہرت حاصل کر چکی ہے کہ اردو ادب محض ہندو پاک یا برصغیر کی زبان ہی نہیں بلکہ اس کا دائرہ خلیجی ممالک سے ہوتے ہوئے یوروپ وامریکہ تک وسیع ہو چکا ہے۔ اس امر پر مہر صداقت اس وقت پوری طرح ثبت ہو جاتی ہے، جب دوحہ، قطر سے شائع ہونے والی عزیز نبیل کی 'خواب سمندر' جیسی کتابیں منظر عام پر آتی ہیں۔

عزیز نبیل کا اصلی نام عزیز الرحمٰن بلریا گنج ہے۔ وہ بھیونڈی، ہندوستان کے متوطن ہیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ سے حاصل کرنے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے گریجویشن کیا۔ فکر معاش کے سلسلے میں گزشتہ گیارہ برس سے خلیجی ملک قطر میں سکونت پذیر ہیں۔ جہاں پر اقتصادی مسائل حل کرنے کے ساتھ ہی ادبی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں۔ وہ انجمن محبانِ اردو، قطر کے جنرل سکریٹری اور سالانہ مجلّہ 'دستاویز' دوحہ، قطر کے مدیر اعلیٰ ہیں۔

'خواب سمندر' عزیز نبیل کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ جس کا انتساب انھوں نے اپنے والدین کے نام کر کے لائق فرزند ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں عزیز نبیل کے تعلق سے پروفیسر لطف الرحمٰن اور آصف اعظمی کے رشحاتِ قلم دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد عرضِ طلب کے عنوان سے ایک نظم بشکل دعا تحریر کی گئی ہے۔ جس کے بعد غزلیات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان کی تعداد تقریباً نوے ہے۔ اس کتاب میں مختلف عناوین کے تحت پندرہ نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ جن کا مختصر تعارف سطور ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

عزیز نبیل کی شاعری میں بے پناہ حسن اور کشش وجاذبیت ہے۔ ان کے یہاں ادبی بانکپن ہونے کے ساتھ ہی غضب کی حساسیت اور پختہ اعتماد پایا جاتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں۔ اس کے اندر ایک درس، چیلنج اور مضبوط حوصلہ ہے۔ اس سلسلے میں ان کے اس شعر کو ملاحظہ کیجیے:

میں اگر ٹوٹا تو سارا شہر بکھرے گا نبیل
ایسا پتھر ہوں فصیل شہر کا

اسی طرح کا اعتماد ان کے اس شعر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے:

قلم ہے ہاتھ میں کردار بھی میرے بس میں ہے
اگر میں چاہوں کہانی بدل بھی سکتا ہوں

نبیل کے کلام میں ایک قسم کی انفرادیت ہونے کے ساتھ ہی ان کے تخیلات اور جذبات واحساسات میں ایک طرح کی انانیت بھی ہے۔ وہ یہ بات تو تسلیم کرتے ہیں کہ اجتماعیت میں طاقت ہے۔ مگر ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی ساتھ نہ دے اور انسان کو اپنی محنت وصلاحیت پر مکمل اعتماد ہو تو وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اکیلا بھی چل سکتا ہے۔ ہاں مگر اس کے عمل میں مکمل خلوص اور پختہ اعتماد ہونا چاہیے۔ ان کا یہ شعر اس سلسلے میں بطور مثال پیش کیا جاتا ہے:

ہم قافلے سے بچھڑے ہوئے تو ہیں مگر نبیل
اک راستہ الگ سے نکالے ہوئے تو ہیں

شاعری کا محور محبت ہے اور محبت کا تعلق دل سے ہوا کرتا ہے۔ اس تعلق سے بھی ان کی زیرِ تبصرہ کتاب 'خواب سمندر' میں بہت ہی خوبصورت اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جن میں شاعر نے قارئین کے سامنے اپنے دل کے حالات بیان کرتے ہوئے انھیں محبت کے رموز واسرار سے واقف کرانے کی کوشش کی ہے۔ محبت میں دل کی جو کیفیت ہوا کرتی ہے اس کو انھوں نے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ اس شعر میں پیش کیا ہے:

عادتاً سلجھا رہا تھا گتھیاں کل رات میں
دل پریشاں تھا بہت اور مسئلہ کوئی نہ تھا

ان کے یہاں خوبصورت الفاظ کے ساتھ ہی بڑے ہی معنی خیز تشبیہ واستعارات کا استعمال بھی دیکھنے کو ملا کرتا ہے۔ جیسا کہ اس شعر میں راستے کے لیے دل کا استعارہ استعمال کر کے انھوں نے شعر میں جان ڈال دی ہے:

نہ جانے کس کے قدم چومنے کی حسرت میں
تمام راستے دل کی طرح دھڑک رہے تھے

اس مجموعہ کلام میں بہت ہی خوشنما غزلوں کے ساتھ ہی کچھ نظمیں بھی دی گئی ہیں جن میں آخری منظر، آوازِ دوست، سوالوں کا ترکش، قحطِ مناظر، شہر دل، پھر وہی رات، ماں، فلسطین بہت ہی اثر انگیز نظمیں ہیں۔ ان میں شاعر کے تخیلات کی عظمت وندرت کے ساتھ ہی الفاظ کی جادوگری بھی ہے۔ خاص طور پر 'فلسطین' بہت ہی اثر انگیز نظم ہے جس میں انھوں نے فلسطینیوں کی مظلومیت کی عکاسی بڑے ہی پُر درد ورقت آمیز انداز میں کھینچی ہے۔ جو ایک حساس وانصاف پسند دل کو تڑپا دینے کے لیے کافی ہے۔ اس نظم کا یہ بند خاص طور پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

وہ لہو سرزمینِ فلسطیں جسے/ اپنی آغوش میں جذب کرتی رہی
وہ لہو جو نہتے بدن سے بہا/ وہ لہو جو کہ بچوں کے تن سے بہا
وہ لہو ماں کے آنچل پہ جو جم گیا/ وہ لہو جس کے بہنے کا کوئی اثر
نسلِ انسانیت پر ہوا ہی نہیں

کتاب کے آخر میں عزیز نبیل کی شاعری کے حوالے سے مشاہیر ادب کے تاثرات تحریر کیے گئے ہیں، جن سے اس مجموعۂ کلام کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ ان مشاہیر ادب میں پروفیسر مظفر حنفی، پروفیسر شہپر رسول، افتخار امام صدیقی، لیاقت علی عاصم، معراج فیض آبادی، انور جاوید ہاشمی، سہیل ثاقب، نوشاد مومن، صائمہ علی زیدی، خالد خاد خاں ایسے معتبر نام ہیں۔ جنھیں اردو کے بین الاقوامی ادب میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

یہ کتاب معنوی خوبیوں کے ساتھ ہی ظاہری خصوصیات سے بھی لبریز ہے۔ کمپیوٹر کی عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ ہی دیدہ زیب طباعت، قیمتی رنگین کاغذ، پختہ جلد بندی، دلکش ٹائٹل نے کتاب میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس گرانی کے دور میں جبکہ مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے اس کی قیمت /150 روپے (25 ریال) نہایت واجبی ہے۔

کتاب کی جملہ خوبیوں کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی اور ادبی حلقوں سے دادِ تحسین حاصل کرے گی۔

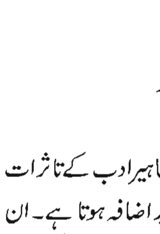

فکر و تحقیق (سعادت حسن منٹو نمبر)

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 382، قیمت: 25 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: پروفیسر ابن کنول، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اگر اردو میں اٹھارہویں اور انیسویں صدیاں شاعری کی تھیں تو بیسویں صدی کو بلاشبہ افسانوی ادب کی صدی کہا جاسکتا ہے، اس صدی میں اردو کے بہترین ناول لکھے گئے اور اسی صدی میں نہ صرف مختصر افسانہ کی ابتدا ہوئی بلکہ افسانے نے وہ مقام حاصل کیا جس نے اُسے عالمی افسانوی ادب کے برابر لا کر کھڑا کر دیا۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں افسانہ نگاروں کی ایک ایسی جماعت ابھر کر سامنے آئی جس نے افسانہ کے اس عہد کو افسانوی تاریخ کا سنہری دور بنا دیا۔ سعادت حسن منٹو جیسا افسانہ نگار اسی دور میں افسانے لکھنا شروع کرتا ہے اور کم وقت میں وہ مقام حاصل کر لیتا ہے جسے پانے کے بعض تخلیق کاروں کو صدیاں لگ جاتی ہیں۔ منٹو نے بہت کم عمر پائی، صرف پینتالیس برس لیکن اِس مختصر عمر میں اُس نے جو سرمایہ ادب کو دیا وہ افسانوی ادب کی تاریخ کا اہم ترین حصہ بن گیا۔ امسال سعادت حسن منٹو کا صد سالہ یوم ولادت منایا جارہا ہے۔ اس موقعے پر منٹو کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے فکر وتحقیق کا ایک ضخیم نمبر شائع کیا۔ یہ نمبر بتیس مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین میں منٹو کی شخصیت اور فن کے تقریباً ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے۔ مضامین لکھنے والوں میں معروف ناقدین بھی ہیں اور تخلیق کار بھی۔

اس شمارے میں پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر صغیر افراہیم اور ڈاکٹر خالد اشرف جیسے فکشن کے ناقدین کے مضامین منٹو فہمی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی مشرف عالم ذوقی، طارق چھتاری، نگار عظیم یا اسلم جمشید پوری جیسے افسانہ نگاروں کے مضامین میں منٹو کی تخلیقی قوت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نمبر کا پہلا مضمون ہی منٹو شناسی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ آج کے عہد میں منٹو کے افسانوں کی معنویت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''منٹو غیر رومانی ہونے کے باوجود ایک باغی تھا، منٹو کی بغاوت کسی سیاسی شعور کا نتیجہ نہیں تھی اور نہ ہی فوری اور ہیجانی بغاوت تھی بلکہ وہ گہرے انسانی شعور کی کوکھ سے پھوٹی تھی، اُس نے بغاوت کو نعرہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چیزوں کو ان کی جدلیت اور حرکت میں دیکھتا تھا اور اس عمل میں وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں تھا۔ اس کا ضمیر ہی اس کی سب سے بڑی عدالت تھی۔''

زیر نظر شمارے میں شامل مضامین میں منٹو کو ہر زاویے سے پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً محمد اسلم پرویز نے مراٹھی میں منٹو کی معنویت تلاش کی ہے، ہمایوں اشرف منٹو کو بحیثیت ظرافت نگار پیش کرتے ہیں۔ سید احمد قادری نے منٹو کی ڈرامہ نگاری پر بحث کی ہے۔ وضاحت حسین رضوی نے منٹو کے ناولٹ کا تجزیہ کیا ہے۔ صالحہ زریں نے منٹو کی خاکہ نگاری پر گفتگو کی ہے، لئیق رضوی نے منٹو کی صحافیانہ صلاحیت پر تبصرہ کیا ہے۔ اطہر مسعود خاں اور سیما صغیر نے منٹو کے منفرد اسلوب کا جائزہ لیا ہے۔ غرضیکہ مختلف حوالوں سے منٹو شناسی کی کوشش کی گئی ہے بلکہ آخر میں پروفیسر شمس الحق عثمانی نے منٹو کی شخصیت اور فن کو منٹو ہی کی تحریروں میں تلاش کر کے ایک اسمبلاژ ترتیب دیا ہے یعنی 'منٹو بقلم خود'— یہ سچ ہے کہ منٹو کو سمجھنے کے لیے منٹو کے مضامین زیادہ معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ''وہ سچ کہتا ہے سچ کے سوا کچھ نہیں کہتا۔''

میں سمجھتا ہوں کہ منٹو صدی کے موقعے پر قومی کونسل کی جانب سے اس نمبر کی شکل میں ایسی خراجِ عقیدت پیش کی گئی ہے جو طلبا اور اساتذہ دونوں کے لیے کارآمد ثابت ہوگی۔ بلاشبہ قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین اور نائب مدیر ڈاکٹر عبدالحیٔ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے منٹو شناسی میں پہل کی ہے۔

■

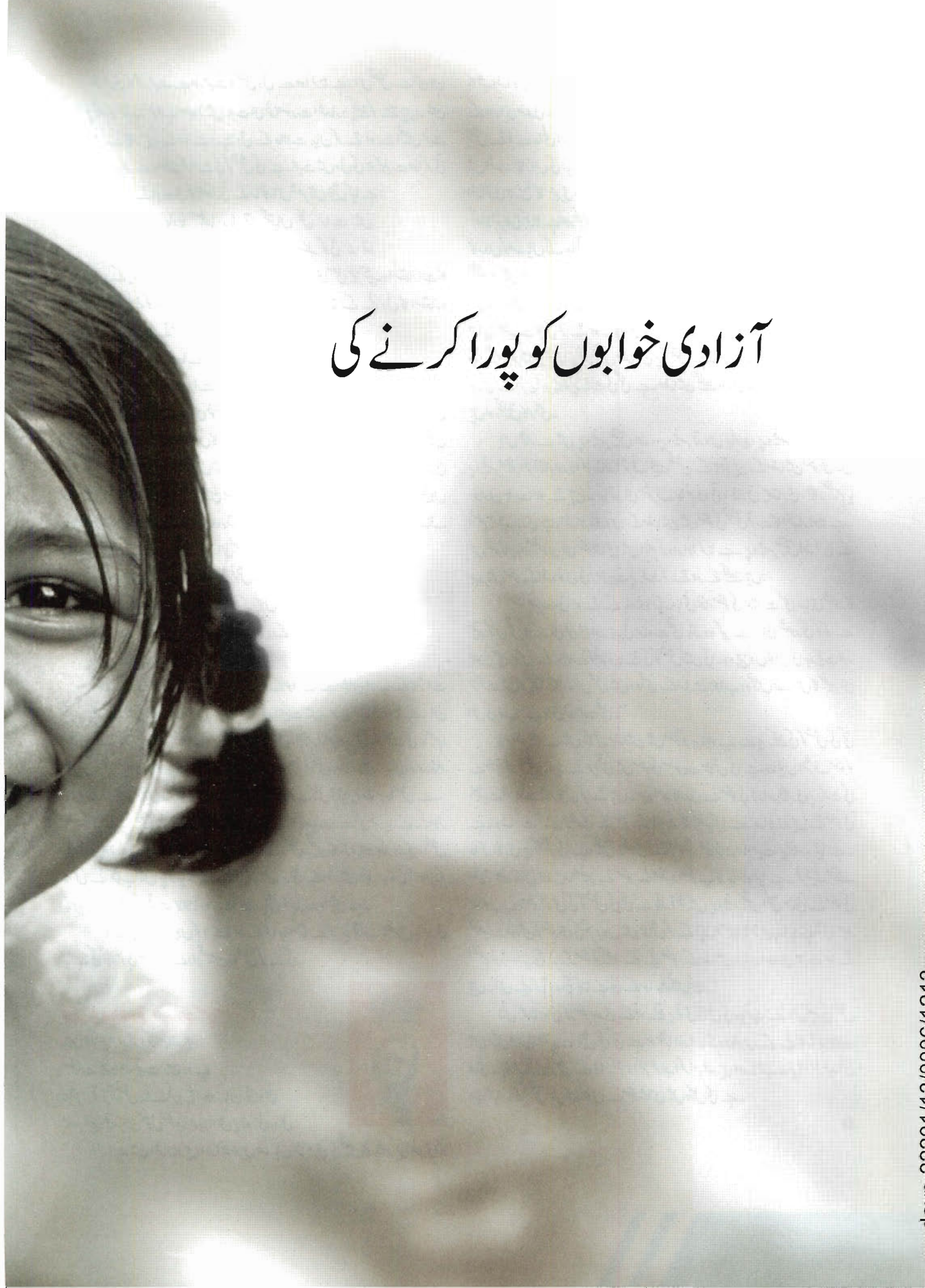
آزادی خوابوں کو پورا کرنے کی

66واں یومِ آزادی

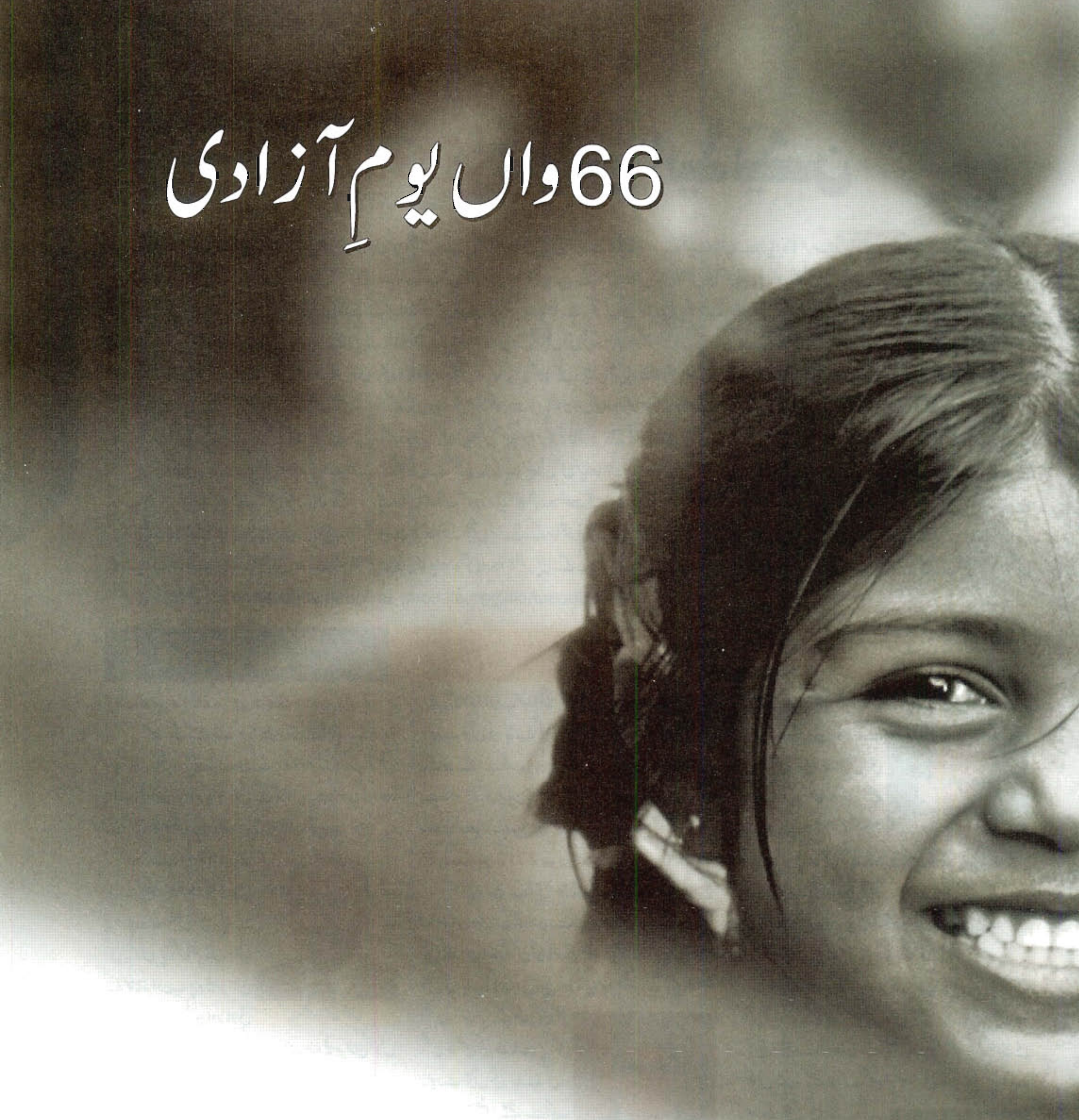

सत्यमेव जयते

وزارت اطلاعات ونشریات

حکومت ہند

اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ای ٹی وی اردو چینل کے پروگرام اردو دنیا کی نشریات کا آغاز ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے۔ پروگرام کے دوران ناظرین کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ جنوری 2011 سے اب تک کل 56 ایپی سوڈ پیش کیے گئے ہیں۔ اس میں کونسل کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ کونسل کے اردو عربی مراکز کی سرگرمیوں کو بھی ملک و بیرون ملک کے اردو ناظرین کے لیے نشر کیا جاتا ہے۔ کونسل کی کتابوں پر تبصرے، اردو کی اہم اور مقتدر شخصیات اور ادبا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی تفصیلی جائزے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان کا پہلا اردو ٹی وی چینل ای ٹی وی اردو گزشتہ دس برسوں سے ٹیلی ویژن نشریات کی خدمات دیتا رہا ہے اور جنوری 2011 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی ادبی وثقافتی سرگرمیاں بھی ٹیلی ویژن نشریات کا اہم حصہ بن گئی ہیں۔ ہفتہ وار اردو دنیا سنیچر کی شام آٹھ بجے اور اتوار کی صبح ساڑھے دس بجے نشر کیا جاتا ہے۔ ملک میں اردو کے تئیں بیداری اور حکومت کی پالیسیوں کو اردو عوام تک پہنچانے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ٹیلی ایڈیشن کا آغاز کیا جس کے مثبت نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ 'اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن' پروگرام کا آغاز ہر ہفتے قومی اردو کونسل سے متعلق خبرنامے سے ہوتا ہے۔ 'اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن' کے ناظرین کی دلچسپی کے لیے ہر ایپی سوڈ میں اردو ادب اور فلموں کے تعلق سے ایک سوال بھی کیا جاتا ہے اور اس کا صحیح جواب دینے والوں کا نام اگلے ایپی سوڈ میں دکھایا جاتا ہے۔ صحیح جواب دینے والے کسی ایک شخص کو قرعے کے ذریعے سال بھر تک 'اردو دنیا' کا شمارہ مفت بھیجا جائے گا۔ اسی طرح 'اردو دنیا' کے ہر ایپی سوڈ میں جہاں اردو زبان و ادب میں گراں قدر خدمات انجام دینے والی کسی ایک اہم شخصیت کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ادبی سفر پر تفصیلی رپورٹ پیش کی جاتی ہے وہیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی اہم کتابوں کا جائزہ بھی اردو ناظرین کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ ناظرین اپنے تاثرات بھیجنے کے لیے ان ای میل آئی ڈیز کا بھی استعمال کرسکتے ہیں: urducouncil@gmail.com, urduduniya@etv.co.in

ستمبر 2012 کی نشریات

1 ستمبر 2012 بروز ہفتہ

ستمبر کے پہلے ہفتے کو رات ساڑھے آٹھ بجے 'اردو دنیا' میں پیش کیے جانے والے پروگرام میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے صوبہ گجرات کے ضلع جام نگر کے دھرول میں امین شریعت ایجوکیشن ٹرسٹ کے زیر اہتمام چلنے والے کمپیوٹر سینٹر کی کارکردگی پر رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس پروگرام میں دہلی کے ممتاز ادیب پروفیسر ابن کنول کے فکر وفن اور ادبی خدمات پر بھی رپورٹ پیش کی جائے۔ پروفیسر ابن کنول کا ادبی سفر چار دہائیوں پر محیط ہے۔

پروفیسر ابن کنول

8 ستمبر 2012 بروز ہفتہ

اس رات کے ایپی سوڈ میں قومی کونسل کے تعاون سے ہماچل پردیش کے ضلع حمیر پور کے کالن جھری میں، چلنے والے سائی یونیورسل کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر کی کارکردگی پر ایک رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس ایپی سوڈ میں دربھنگا بہار کے ممتاز ادیب عبدالمنان طرزی کی فن وشخصیت پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ عبدالمنان طرزی کا نام شاعری کے حوالے سے ملک و بیرون ملک کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ سیرۃ النبی پر ان کا منظوم کام ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

عبدالمنان طرزی

15 ستمبر 2012 بروز ہفتہ

اس رات کے ایپی سوڈ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے ریاست جموں کے گاندھی نگر میں امازون انفارمیشن ٹیکنالوجی سینٹر کی کارکردگی پر رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس ایپی سوڈ میں مہاراشٹر کے تعلیمی ادارہ انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی کی خدمات پر بھی رپورٹ پیش کی جائے گی۔ ڈاکٹر ظہیر قاضی پیشے سے ایک ڈاکٹر ہیں لیکن انھوں نے انجمن اسلام کے ذریعے جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں وہ انتہائی اہم ہیں۔

ڈاکٹر ظہیر قاضی

22 ستمبر 2012 بروز ہفتہ

اس رات کے ایپی سوڈ میں ممبئی کے جوگیشوری میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے فیڈریشن آف سلطانہ آبادی ایچ ایس لمیٹڈ کے زیر اہتمام چلنے والے سلطانہ آباد ویلفیئر کمپیوٹر سینٹر کی کارکردگی پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس ایپی سوڈ میں ہی اورنگ آباد مہاراشٹر کے ممتاز ادیب وشاعر بشر نواز کے فکر وفن پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ بشر نواز کی مختلف موضوعات پر کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

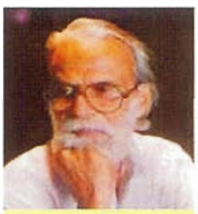

بشر نواز

29 ستمبر 2012 بروز ہفتہ

اس رات کے ایپی سوڈ میں صوبہ اتر پردیش کے ضلع فیض آباد کے شیخ پور جعفر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے فیض عام مسلم ہائر سکنڈری اسکول میں چلنے والے کمپیوٹر سینٹر کی کارکردگی پر ایک رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس ایپی سوڈ میں ہی جموں اینڈ کشمیر کے ممتاز ادیب شہاب عنایت ملک کے فکر و فن اور ادبی خدمات پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک جموں یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

پروفیسر شہاب عنایت ملک

عبدالحی

امریکہ میں اردو کا مستقبل روشن

پروفیسر افروز تاج اور جان کالڈویل سے بات چیت پر مبنی

امریکہ میں اردو کی تدریس سے جڑے ہوئے دو معتبر اساتذہ کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ امریکہ میں اردو زبان و ادب کا مستقبل روشن ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہاں سرکاری سطح پر بھی اردو کے فروغ کی کافی کوششیں ہورہی ہیں۔ امریکہ میں اردو اور ہندی دونوں زبانیں ایک ساتھ پڑھائی جاتی ہیں اور ان زبانوں کو سیکھنے والے زیادہ تر طلبا امریکی نژاد ہوتے ہیں۔ طالب علموں کے لیے اردو زبان سیکھنے کے بعد روزگار کے بھی کافی مواقع ہیں۔ درس و تدریس، کاروبار، سماجی تنظیموں، صحافت اور سرکاری اداروں میں ملازمت مل جاتی ہے۔ یہ تمام حقائق امریکہ کی نارتھ کیرولائنا یونیورسٹی میں اردو کے استاد پروفیسر افروز تاج اور جان کالڈویل سے امریکہ میں اردو کی موجودہ صورت حال پر تفصیلی گفتگو کے دوران سامنے آئے۔ دونوں اساتذہ جن میں موخرالذکر خالص امریکی ہیں ان دنوں ہندوستان کے دورے پر آئے ہوئے ہیں۔

اردو زبان و ادب کی یہ خاصیت رہی ہے کہ اپنے آغاز سے ہی اس نے نئے نئے علاقوں، خطوں میں اپنی جگہ بنائی ہے اور لوگوں نے اسے سرآنکھوں پر بٹھایا ہے اور اس کی شیرینی نے سب کو اپنا دیوانہ بنایا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل سے ہی ہندوستانیوں کی بڑی تعداد نے مغربی ممالک میں اپنے کاروبار اور ملازمتوں کی وجہ سے اپنے قدم جمانا شروع کردیے تھے۔ ہندوستانیوں کے ساتھ ان کی زبان ہندوستانی بھی دوسرے ممالک تک پہنچی اور اُس نے بھی وہاں اپنے اثرات مرتب کیے۔ اردو زبان مشترکہ کلچر و تہذیب کا مظہر ہے۔ شرافت، بھائی چارگی، نفاست، شائستگی و شگفتگی، ندرت اعلیٰ خلاق و اقدار اس تہذیب کا خاصہ ہیں۔ اردو زبان نے اس تہذیب کی پاسداری کرتے ہوئے ان تمام خصوصیات کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ 1947 میں ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد ایسا لگا کہ اردو ختم ہوجائے گی لیکن ایسا ہوا نہیں بلکہ برصغیر کے علاوہ اردو نے نئی بستیوں اور نئے خطوں میں اپنی جگہ بنائی۔ امریکہ، یورپ، افریقہ، چین، جاپان، ڈنمارک جیسے ممالک میں اردو زبان و ادب کی جانب راغب ہونے والوں کی تعداد لگاتار بڑھ رہی ہے۔ ان تمام ممالک میں نہ صرف اردو کی تعلیم دی جاتی ہے بلکہ اردو کے ادبی پروگرام بھی منعقد ہوتے ہیں اور اردو رسائل و جرائد شائع کیے جاتے ہیں۔

اردو زبان لشکری زبان کہلاتی ہے، اس کا اپنا تشخص اور اپنا رسم الخط تو ہے ہی لیکن اس میں دیگر زبانوں کے الفاظ بھی بڑی تعداد میں شامل ہیں۔ عربی فارسی، سنسکرت، ہندی، ترکی، انگریزی، پرتگالی، یونانی، فرانسیسی زبانوں کے الفاظ بھی اردو میں در آئے ہیں۔ اردو کا مزاج آغاز سے ہی رواداری کا رہا ہے جس نے اردو کو اپنا لیا اردو اس کی ہوگئی۔ اردو کا یہ وصف بھی اسے غیر اردو ممالک میں قابل قبول بنا دیتا ہے۔ اردو زبان آج برصغیر کی اہم زبان تو ہے ہی اس کے ساتھ ہی بین الاقوامی رابطے کی زبان بھی بن چکی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پوری دنیا میں چینی اور انگریزی کے بعد اردو زبان کا نمبر آتا ہے۔

پروفیسر افروز تاج نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ اردو زبان و ادب کا فروغ محض مشاعروں و ادبی سرگرمیوں یا سیمیناروں سے نہیں ہونے والا بلکہ اس کے لیے ہمیں اردو کے نئے طالب علم لانے ہوں گے۔ غیر اردو داں حضرات کو اردو سکھانی ہوگی اور انھیں اردو کی جانب راغب کرنا ہوگا۔

امریکہ میں اردو کی درس و تدریس پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر تاج نے کہا کہ امریکہ میں آج سبھی بڑے تعلیمی اداروں میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف موضوعات پر ریسرچ ہورہی ہے اور انڈر گریجویٹ لیول پر بھی اردو تعلیم کے لیے حکومت کافی کوششیں کررہی ہے۔ وہاں اردو کا پورا کورس چار سال کا ہے۔

پروفیسر افروز تاج کے رفیق اور اردو کے استاد جان کالڈویل اردو زبان و ادب کے دلدادہ ہیں اور انھیں اس زبان سے عشق ہے۔ انھیں میوزک سے بہت دلچسپی ہے اور موسیقی سیکھنے کے دوران وہ ہندوستانی موسیقی سے متعارف ہوئے اور بعد میں ہندوستانی زبان سے ایسا لگاؤ ہوا کہ اب یہ زبان ان کا اوڑھنا بچھونا بن گئی ہے۔ وہ غالب کی غزلوں کے تراجم بھی کررہے ہیں۔ ردیف اور قافیہ کی بندش کو برقرار رکھتے ہوئے وہ یہ کارنامہ انجام دینے کی کوشش کررہے ہیں۔ امریکہ میں اردو تعلیم کے آغاز سے متعلق جان کالڈویل نے بتایا کہ امریکہ میں اردو تعلیم کی شروعات 1960 کے قریب ہوئی تھی۔ بعد میں اس میں کافی ترقی ہوتی گئی اور آج واشنگٹن، نارتھ کیرولائنا، برٹش کولمبیا، بارکلے، مشی گن جیسی تمام یونیورسٹیوں میں اردو زبان کی تعلیم دی جارہی ہے۔ پروفیسر افروز تاج سائنس کے طالب علم رہے ہیں بعد میں اردو کی طرف آئے۔ انھوں نے ''اردو میں منظوم ڈراموں کا تنقیدی جائزہ'' کے موضوع پر جے این یو سے پی ایچ ڈی کی۔ انھوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھا۔

افروز تاج کو ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن حکومت امریکہ سے اردو کے فروغ کے لیے دس لاکھ ڈالر کی امداد

بھی مل چکی ہے۔ وہ یونیورسٹی آف ورجینیا، یونیورسٹی آف مشی گن اور نارتھ کیرولائنا اسٹیٹ یونیورسٹی میں ہندی، اردو پڑھاتے رہے ہیں۔ اردو شاعری خصوصاً غزل ان کا اہم موضوع رہا ہے۔ اس کے علاوہ بالی ووڈ سنیما اور اردو صحافت سے متعلق موضوعات بھی پڑھاتے ہیں۔ انھوں نے رامائن اردو میں پڑھائی ہے اور وہاں کے طالب علموں نے اسے بہت پسند بھی کیا ہے۔

جان کالڈویل کا کہنا تھا کہ وہاں اردو پڑھنے والے طالب علم کلاس میں اور کلاس سے باہر چائے کی ٹیبل پر اردو ہندی میں ہی بات کرتے ہیں تاکہ انھیں اردو زبان کی مختلف جہات سے واقفیت ہو سکے اور وہ اس زبان میں بہتر ڈھنگ سے گفتگو کر سکیں۔ افروز تاج نے وہاں صحافت کی صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہاں بڑی تعداد میں اخبار اور رسالے شائع ہو رہے ہیں اور ریڈیو، ٹیلی ویژن کے پروگرام بھی براڈ کاسٹ کیے جاتے ہیں۔ وہاں جادو جیسا ایک الیکٹرانک ڈیوائس عام ہے جس کی مدد سے برصغیر کے بہت سارے اردو ہندی ٹی وی و ریڈیو چینلوں کو سنا جاسکتا ہے۔ تاج کنکشن کے نام سے افروز تاج بھی ایک ٹی وی چینل چلاتے ہیں جس میں وہ اردو زبان و ادب سے متعلق پروگرام پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو غزل، گانے اور مختلف شخصیات کا انٹرویو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اس شو کو جان کالڈویل اور افروز تاج پیش کرتے ہیں اور یہ ہفتے میں دو دن جمعہ اور اتوار کو براڈ کاسٹ کیا جاتا ہے۔

افروز تاج نے امریکہ میں اردو کی ترقی کے اقدامات سے متعلق ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ عالمی اردو ٹرسٹ کی مدد سے ہم وہاں اردو کی ترقی کے لیے کئی اقدامات کر رہے ہیں اور ان کی وجہ سے ہی ہم یہاں ہندوستان میں اسٹڈی ابروڈ پروگرام کے تحت قبل از وقت آئے ہیں۔ ایک سمپوزیم بھی ہم نے عالمی اردو ٹرسٹ کی مدد سے کیا ہے جو کافی کامیاب رہا۔ منٹو صدی کی مناسبت سے ہم نے ایک سیمینار کا بھی انعقاد کرایا ہے۔ بالی ووڈ سنیما پر بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ بالی ووڈ کی فلمیں وہاں کافی مقبول ہے۔ میری بالی ووڈ کی کلاسس حکومت امریکہ سے منظور شدہ ہے اور اس کلاس میں 80 فیصد امریکی نژاد طلبا ہیں۔ دیپا مہتا، میرا نائر وغیرہ کی فلمیں وہاں کافی مقبول ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ پرانی اردو فلموں کو تو امریکی طالب علم بڑے ہی شوق سے دیکھتے ہیں اور بے حد پسند کرتے ہیں۔ برٹش اور بھارتی اشتراک سے بنی فلمیں وہاں کافی اچھا کاروبار کرتی ہیں۔ بالی ووڈ امریکہ میں پوری طرح اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے اور وہاں کی فلموں پر بھی بالی ووڈ کا اثر نمایاں ہے۔ ہندوستانی سنیما بالی ووڈ سے تین گنا زیادہ فلمیں بناتا ہے لیکن کچھ فلموں کو چھوڑ کر باقی فلمیں باکس آفس پر فلاپ ہو جاتی ہیں کیوں کہ ان فلموں کا معیار اتنا بلند نہیں ہوتا کہ وہ ناظرین کی پسند پر پوری اتر سکیں۔

پروفیسر افروز تاج شاعر بھی ہیں 'غموں کی آگ میں' ان کا شعری مجموعہ ہے۔ انھوں نے گفتگو کے دوران اپنے کچھ اشعار بھی سنائے۔

ان کا لکھا ہوا 'نغمہ علی گڑھ' کافی مشہور ہوا اور آج بھی یہ نغمہ علی گڑھ الومنائی ایسوسی ایشن کی تقریبات اور دیگر پروگراموں میں پڑھا جاتا ہے:

اے علی گڑھ، روح سید علم و فن کے گلستاں
ہم ترے ہی پھول ہیں اور تیرے ہی ہم باغباں
چل دیا ہے اس چمن سے اب خزاں کا کارواں
یاں کی تکبیر و اذاں سے کانپتا ہے آسماں
اے علی گڑھ روح سید علم و فن کے گلستاں
زینتِ فن خواب سرسید کی ہے تعبیر تو
ہند کی دیوار پر سب سے حسیں تصویر تو
عرب و افریقہ و ایراں تک کی ہے تنویر تو
ملکیت ہر ملک کی ہر قوم کی جاگیر تو
اے علی گڑھ روح سید علم و فن کے گلستاں

اردو صحافت کی صورت حال پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ امریکہ میں اردو صحافت کی حالت بہت بہتر نہیں ہے کیونکہ یہ مین اسٹریم سے نہیں جڑی ہے۔ اس میں منافع کم ہے۔ وہاں اردو کے وسائل بھی پوری طرح دستیاب نہیں۔ اس لیے اس سمت میں مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کئی تنظیمیں ہیں جو وہاں اردو کے فروغ کی کوشش کر رہی ہیں۔ اردو کے تعلق سے انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے ذریعے کافی سرگرمیاں انجام دی جاتی ہیں۔ اردو مجلس، رائٹرز اسوسی ایشن جیسی تنظیمیں مختلف تقریبات کا انعقاد کرتی ہیں۔

اردو کے پرانے رسالوں پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ شمع، بیسویں صدی، ہما جیسے رسائل نے ایک عام قاری کو اردو زبان سے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر افروز تاج اور جان کالڈویل نے اردو دنیا کے دفتر میں آکر خوشی کا اظہار کیا اور ماہنامہ اردو دنیا جیسے رسالے کو اردو طالب علموں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے تعبیر کیا۔ دونوں حضرات نے اردو دنیا کو ایک عالمی معیار کا جریدہ بتایا اور کہا کہ اس رسالے میں اردو زبان و ادب اور مختلف موضوعات پر معلوماتی مضامین شائع ہوتے ہیں جو اس رسالے کو دیگر رسائل سے منفرد بناتے ہیں۔

◘

Dr. Abdul Hai,152, Priyar Hostel JNU, New Delhi - 110067

برطانیہ

'منٹو اور میراجی صدی سیمینار' میں گوپی چند نارنگ کا خطاب

لندن: یکم اگست (پریس ریلیز)، سعادت حسن منٹو اور میراجی بیسویں صدی کے عظیم ادیبوں میں سے تھے اور دونوں ہی غیر معمولی تخلیقیت سے سرشار تھے لیکن زندگی میں ان کی ناقدری کی گئی۔ ہم اپنے بڑے ادیبوں کا کیسا خیال رکھتے ہیں اور اُن سے کیا سلوک کرتے ہیں اس کی سب سے بڑی مثال منٹو اور میراجی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار عالم گیر شہرت یافتہ نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں منعقد 'منٹو اور میراجی صدی سیمینار' میں کیا۔ اپنے کلیدی خطبے میں پروفیسر نارنگ نے کہا کہ وہ لوگ جنھوں نے میراجی پر بہترین خاکے لکھے انھوں نے بھی میراجی کی شاعری پر نشتر زنی میں کوئی کمی نہیں کی۔ دونوں کو ان کی زندگی میں راندۂ درگاہ سمجھا گیا اور وہ کون سی ذلت اور رسوائی تھی جو اُن کے حصے میں نہیں آئی، لیکن آج ان دونوں کی غیر معمولی معنویت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج ادب کا پورا پیراڈائم بدل چکا ہے۔ جو لوگ تنقید کو حاشیائی کردار جانتے ہیں اُن کو یہ سمجھنے میں دقت ہوگی اگرچہ ادب تنقید یا نظریوں کے بل پر نہیں لکھا جاتا ہے لیکن تنقیدی تفاعل اندر ہی اندر ادبی فضا کو بدل دیتا ہے اور تخلیق کے خون میں بصیرت بن کر کارگر ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ جمالیاتی تعین قدر کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ آج منٹو اور میراجی کو بیسویں صدی کے اردو ادب میں نئی معنویت کے معماروں کا درجہ حاصل ہے۔ پروفیسر نارنگ نے بتایا کہ ساہتیہ اکادمی نے شافع قدوائی اور وارث علوی کے مونوگراف خصوصیت سے شائع کیے۔ بنیادی نوعیت کا کام پاکستان میں شیما مجید اور رشید امجد نے کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میراجی کے یہاں شعور سے زیادہ لاشعور کی کارکردگی کا عمل ہے۔ وہ بے لوث تخلیقیت کی مثال ہیں جس میں فطرت جنس کا اور جنس فطرت کا بھید بھرا استعارہ بن جاتی ہے۔ سچا آرٹ جادو کا سا دھوکا دیتا ہے۔ منٹو بھی نہ فحش نگار ہیں نہ عریانیت پسند۔ وہ عورت کے باطن کی کراہ، دردمندی اور ممتا کے فنکار ہیں۔ بٹوارے پر منٹو کی کہانیاں عالمی شاہکار بن چکی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 اگست 2012

خبر نامہ

اقلیتوں کے تعلیمی مسائل جلد حل ہونے کے امکانات قومی اقلیتی تعلیمی نگراں اسٹینڈنگ کمیٹی کی میٹنگ

نئی دھلی: مرکزی حکومت اقلیتوں کی تعلیمی اسکیموں کے نفاذ کے تعلق سے متعدد کوششیں کر رہی ہے۔ اس حوالے سے وزارت برائے فروغ انسانی وسائل نے حال ہی میں پانچ مختلف ذیلی کمیٹیاں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیرنگرانی تشکیل دی ہے۔ ان کمیٹیوں کی سفارشات پر غور وخوض کرنے نیز نفاذ کے عمل کو موثر بنانے کے لیے حکومت نے جامعہ ہمدرد کے سابق وائس چانسلر و ریٹائرڈ آئی اے ایس افسر سراج حسین کی سربراہی میں قومی اقلیتی تعلیمی نگراں اسٹنڈنگ کمیٹی بھی تشکیل دی ہے۔

اس کمیٹی کی پہلی میٹنگ 28 جولائی کو دہلی کے این سی ای آر ٹی کیمپس میں ہوئی، کونسل و نیوپا کے اشتراک سے منعقدہ اس میٹنگ میں اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کی ابتدائی تعلیمی صورتحال کے ساتھ اعلی تعلیم کی موجودہ صورتحال کا مکمل جائزہ لیا گیا، سروشکشا ابھیان کے ذریعے مسلمانوں کی خواندگی سے متعلق تمام تر تفصیلات میٹنگ کے دوران پیش کی گئیں اور مسلمانوں میں بڑھتے تعلیمی ڈراپ آوٹ کے رجحانات وان کے تناسب پر سخت تشویش کا اظہار کیا گیا، کمیٹی کے چیئرمین سراج حسین، قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، کمیٹی کے رکن مولانا ولی رحمانی، پی اے انعامدار، ڈاکٹر ظہیر قاضی، پروفیسر اختر الواسع و دیگر اراکین کی موجودگی میں این ایس ایس نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ 5ویں جماعت کے بعد سے ہی اسکولوں میں مسلم بچوں کا تناسب کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے اپر پرائمری درجات میں مسلم بچوں میں ڈراپ آوٹ کا تناسب دیگر طبقات کے بچوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ رپورٹ میں اس بات کو بھی اجاگر کیا گیا کہ مسلم بچیوں کے تعلیمی اندراج میں اضافہ ہوا ہے۔ میٹنگ میں اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ نیوپا (NUEPA) قومی وریاستی سطح کے علاوہ ضلعی سطح کے بھی اعداد وشمار منظر عام پر لائے، کمیٹی چیئرمین سراج حسین نے نیوپا کی ان کوششوں کو سراہتے ہوئے نیوپا سے گزارش کی کہ وہ ضلعی سطح پر بھی مسلمانوں کی تعلیمی صورتحال پر مبنی مونوگراف شائع کرے تاکہ مسلمانوں میں تعلیمی رجحان مزید فروغ پا سکے۔ کمیٹی رکن اصغر علی انجینئر و دیگر اراکین نے کہا کہ تعلیم کے ساتھ روزگار کے تئیں بھی مسلمانوں میں بیداری لانی ہوگی۔ تعلیمی بیداری مہم میں مسلمانوں کی تعلیمی فلاحی تنظیموں نیز سرگرم علما، ائمہ مساجد و دیگر سماجی شخصیات کو بھی شامل کرے تاکہ سروے شکشا ابھیان کے تحت بھی مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا ہو سکے۔ میٹنگ کا دوسرا سیشن مدارس کی تعلیمی صورتحال سے متعلق رہا۔ اس سیشن میں مدارس و اہل مدارس کے متعدد مسائل کو زیر بحث لایا گیا۔ کمیٹی اراکین نے اپنی رپورٹ کی بنیاد پر کہا کہ مدارس کی جدید کاری سے متعلق مرکزی حکومت کی متعدد کوششیں ہو رہی ہیں لیکن ان اسکیموں کا نفاذ بھی صحیح طریقے سے نہیں ہو رہا ہے۔ SPQM، جیسی اسکیم کا حوالہ دیتے ہوئے اراکین نے کہا کہ اس اسکیم کے نفاذ کو یقینی بنایا جائے۔ میٹنگ میں یہ سوال بھی زیر بحث رہا کہ غیر رجسٹرڈ مدارس کے اعداد وشمار کو بھی منظر عام پر لایا جائے۔

میٹنگ کے تیسرے اجلاس میں اقلیتی اداروں کو نہ ملنے والی NOC تعلیمی وظائف، وقف املاک پر تعلیمی اداروں کے قیام جیسے مسائل پر غور وخوض کیا گیا اوران مسائل کے تدارک کے لیے ماہرین کی جانب سے تجاویز پیش کی گئیں تاہم آئی ٹی آئی و پالیٹکنک جیسے اداروں کے قیام پر زور دیا گیا۔ کمیٹی چیئرمین سراج حسین نے کہا کہ آئندہ ایک میٹنگ وظائف کے تعلق سے یو جی سی کے ساتھ کی جائے گی تاکہ مولانا آزاد نیشنل فیلوشپ کے مسئلے کو حل کیا جا سکے۔

میٹنگ میں اردو تعلیم کا مسئلہ بھی خاصا زیر بحث رہا، تاہم اس بات پر زور دیا گیا کہ اگر مستقل اردو اساتذہ کی تقرری عمل میں نہیں لائی جاسکتی تو دیگر مضامین کی طرح اردو کے بھی پیرا ٹیچرز (Para Teacher) کا تقرر کیا جائے۔

کمیٹی چیئرمین سراج حسین نے کہا کہ کمیٹی جلد ہی اپنی دوسری میٹنگ منعقد کرے گی اور ماہرین کی مدد سے ایک جامع رپورٹ حکومت کے سامنے پیش کرے گی۔ مرکز و ریاست کے رشتوں کو اجاگر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ دونوں کے بہتر تال میل سے ہی اقلیتوں کی تعلیمی اسکیموں کو بہتر انداز میں نافذ کیا جاسکتا ہے۔

میٹنگ میں وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے ذمے داران کے علاوہ قومی اقلیتی کمیشن کے رکن سید امام، کمیٹی رکن ظفر جنگ، عمر پیرزادہ، ذکیہ صدیقی، پروفیسر محمد حلیم خان، خالد انور، مولانا محبوب الحق نے بھی شرکت کی۔ میٹنگ کا اختتام ڈاکٹر خواجہ اکرام کے شکریے کے ساتھ ہوا۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 31 جولائی 2012

قومی اردو کونسل میں امریکی طلبا کی آمد

ثقافتی اور تہذیبی تعامل کی پاسداری اردو زبان و ادب کا خاصہ ہے: ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین

نئی دہلی: ثقافتی اور تہذیبی تعامل کی پاسداری اردو زبان وادب کا خاصہ ہے۔قومی اردو کونسل نے اردو زبان وادب کے فروغ میں ثقافتی تعاون کو ایک اہم عنصر تسلیم کرتے ہوئے نہ صرف اپنے ماہنامے اردو دنیا کو عالمی معیار کا میگزین بنایا ہے بلکہ اس سلسلے میں ایک نئے باب کا آغاز کرتے ہوئے ہندوستان سے باہر اردو زبان کے

شائقین اور طالب علموں کو اپنے مشن کا حصہ مان کر بہت اہمیت دی ہے۔ان ابتدائی کلمات کے ساتھ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے امریکہ کی نارتھ کیرولائنا یونیورسٹی سے آئے طلبا کا خیر مقدم کیا۔انھوں نے ان سے اردو زبان وادب کی اہمیت پر تبادلہ خیال کیا اور کونسل کے ذریعے حال ہی میں شروع کیے گئے آن لائن اردو کورس کا تعارف بھی پیش کیا اور کہا کہ آپ سب لوگ کونسل کی ویب سائٹ سے استفادہ کر سکتے ہیں اور یہاں سے سینکڑوں کتابیں آپ کو ای بک کی شکل میں مفت مل جائیں گی اور آپ کونسل کی ویب سائٹ سے اردو زبان بھی مفت سیکھ سکتے ہیں۔انھوں نے تمام طلبا کی اردو زبان وادب کے تئیں محبت اور اردو سیکھنے کے جذبے کی ستائش کی ۔طالب علموں کا یہ بارہ رکنی وفد نارتھ کیرولائنا یونیورسٹی میں ہندی اردو کے پروفیسر افروز تاج اور جان کالڈویل کی سربراہی میں ہندوستان آیا ہوا ہے۔یہ تمام طلبا وہاں اردو زبان و ادب کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کے ساتھ بات کرتے ہوئے ان طلبا نے اردو لرننگ اور ہندوستان کے تعلق سے اپنے تجربات بیان کیے۔اس موقع پر پروفیسر افروز تاج نے ان طلبا کو ہندوستان کے دورے پر لانے کا مقصد بیان کیا اور یہ بتایا کہ یہ تمام طالب علم امریکہ میں اردو زبان سیکھ رہے ہیں اور انھیں ہندوستان کے تہذیب وتمدن سے کافی دلچسپی ہے اور جب تک یہ ہندوستان نہیں آتے اردو زبان وادب کی تہذیبی بازیافت نہیں کرسکیں گے۔پروفیسر جان کالڈویل نے بھی اردو درس و تدریس کے دوران آئے اپنے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔تمام طلبا نے اپنے تعارف پیش کیے اور اردو زبان و ادب سیکھنے کے تئیں اپنی دلچسپی کی وجوہات بیان کیں۔گفتگو کے اس سیشن میں پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر ابن کنول اور امریکہ کی واشنگٹن یونیورسٹی میں اردو کے استاد اور مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر محمد جہانگیر وارثی نے طالب علموں کے سوالوں کے جوابات دیے۔پروفیسر ابن کنول نے اردو زبان وادب کی معنویت اور اس کی تہذیبی شناخت پر روشنی ڈالی جبکہ پروفیسر عتیق اللہ نے اردو شاعری اور موجودہ دور میں اردو زبان کی مقبولیت کے حوالے سے گفتگو کی۔قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلیکیشن افسر نسیم احمد نے کونسل کی کار گزاریوں اور اس کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔قومی اردو کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر محترمہ شمع کوثر یزدانی نے بھی اظہار خیال کیا۔اس وفد میں شامل طالبہ اسول زپاتہ نے جو نارتھ کیرولائنا یونیورسٹی میں تیسرے سال کی طالبہ ہیں بتایا کہ انھیں اردو زبان بہت شیریں اور پیاری لگتی ہے اور وہ اردو زبان اچھی طرح سیکھ کر اردو ادب اور اردو کی اہم کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہتی ہیں تاکہ اپنی ریسرچ بہتر ڈھنگ سے مکمل کرسکیں۔ انھیں ہندوستانی فلمیں بہت پسند ہیں اور امراؤ جان، پاکیزہ، مغل اعظم، بول جیسی فلمیں دیکھ چکی ہیں ۔وہ ہندوستانی تاریخ کا بھی مطالعہ کر رہی ہیں اور ایشیا کی تاریخ کے حوالے سے بھی مطالعہ کرنا چاہتی ہیں اس سلسلے میں اردو کی تعلیم سے اپنے مشن کو پورا کرنے میں انھیں مدد ملے گی۔ ڈائرکٹر نے تمام طالب علموں کو کونسل کی اردو سیکھنے سکھانے کی کتابیں بطور تحفہ پیش کیں۔ ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کے شکریے کے ساتھ یہ پروگرام اختتام پزیر ہوا۔اس پروگرام میں ریسرچ آفیسر ڈاکٹر محمد کلیم اللہ، آر اے معید رشیدی اور آبگینہ عارف وغیرہ موجود تھے۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 8 اگست 2012

عربی زبان وادب کا اردو سے رشتہ اور امکانات: خواجہ اکرام الدین

نئی دهلی: قومی اردو کونسل نے عربی زبان کے فروغ کو اپنی اضافی ذمے داری تسلیم کرتے ہوئے، عربی زبان وادب سے متعلق ایک اہم میٹنگ کا انعقاد کیا۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ عربی زبان وادب کی اہم تصانیف کو اردو میں لائے جانے کا فیصلہ ہوا۔ پورے ہندوستان میں کونسل کے ایک سالہ عربی سرٹیفکیٹ، ڈپلومہ کورس کے تقریباً 247 سینٹر چل رہے ہیں یہ ایک سعی ہے اردو کے ذریعے عربی سیکھنے اور سکھانے کی دوسری جانب اردو جاننے والوں کے لیے دو سالہ ڈپلومہ ان فنکشنل عربک بھی چلایا جارہا ہے جس کے تقریباً 225 سینٹر چل رہے ہیں۔ قومی اردو کونسل کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اردو زبان کے فروغ کو وسیع تر کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ زبانوں کو شامل کیا جاسکے۔ کیونکہ اردو ہی ایک ایسی زباں ہے جس میں عربی، فارسی، انگریزی، ہندی، سنسکرت کے الفاظ کی شمولیت ہے۔ اس لیے اردو سے براہ راست وابستہ عربی زبان وادب کو

نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر اسلم اصلاحی کی صدارت میں قومی اردو کونسل نے عربی زبان کے موضوع پر کام کرنے کے لیے ایک پینل کی تشکیل کی ہے۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ ہمیں عربی پینل کے فروغ کے لیے اہم تجاویز درکار ہیں، عربی اور اردو کا رشتہ ناگزیر ہے ہم اسے نظر انداز نہیں کرسکتے۔ یہ پینل عربی زبان وادب کے موضوعات پر اردو میں کتابیں تیار کرنے پر غور کرے گا۔ یہ اس پینل کی پہلی میٹنگ ہے۔ آج کی اس اہم میٹنگ میں کچھ اہم تجاویز بھی سامنے آئیں جن پر مستقبل میں غور کیا جائے گا۔ ایک تجویز کے تحت اردو اور عربی کی ایک صوتیاتی لغت تیار کی جانی چاہیے۔ ہندوستان میں عربی مصنفین اور شاعروں کی ایک جامع انسائیکلو پیڈیا کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا۔ عربی اور اردو محاورات اور ان کے لسانی رشتے پر کام ہوا ہے، ضرب الامثال پر بھی کام ہونا چاہیے اور ان کے اردو متبادل محاوروں کی ایک جامع ڈکشنری تیار کی جائے۔ میٹنگ میں موجود عربی زبان کے ماہرین نے کونسل کی اس پیش رفت کی ستائش کی۔

آج کی اس میٹنگ میں پروفیسر اسلم اصلاحی، پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی، مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی، پروفیسر زبیر احمد فاروقی، مولانا اسید الحق قادری، ڈاکٹر رضوان الرحمٰن، ڈاکٹر پی کے حسین مداور، ڈاکٹر محمد اقبال، ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی نے شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 جولائی 2012

پیتل کی سامان سازی سے متعلق کورس

نئی دهلی: قومی پیشہ ورانہ تعلیمی لیاقتی خاکہ میں رنگ بھرنے کے لیے قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو طالب علموں کے لیے پیشہ ورانہ مہارت حاصل کرنے کے لیے مرادآباد میں ایک سالہ پیتل کی سامان سازی سے متعلق کورس کا نصاب تقریباً تیار کرلیا ہے۔ اس سلسلے میں پچھلے ماہ کونسل کے صدر دفتر میں پیتل سازی کی صنعت وحرفت کی تعلیم کے ماہرین کی دو میٹنگ کا بھی انعقاد کیا گیا۔ ان میٹنگوں میں سرکاری ITI اور غیرسرکاری ITI کے علاوہ مرادآباد کی سرکاری اور غیرسرکاری ایجنسیوں کے ماہرین کی رائے سے یہ نصاب تیار کیا گیا۔ اس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ (ITI، انجینئرنگ) ILO، سرکاری ITI کے علاوہ مرادآباد کی ایجنسیاں بھی شامل ہیں۔ ان ماہرین کی مدد سے کورس سے متعلق درسی کتابیں بھی تیار کرائی جارہی ہیں۔ امید ہے کہ نئے سال میں اس پیشہ ورانہ تعلیمی لیاقتی کورس کا آغاز ہوجائے گا۔

قومی اردو کونسل جموں وکشمیر میں Travel and Tourism کے ڈپلومہ کورس کے ساتھ ساتھ پیپرمیشی سے متعلق ڈپلومہ کورس شروع کرنے کا بھی ارادہ رکھتی ہے۔

موبائل وین پروگرام کا 16 واں مرحلہ

(بہار، جھارکھنڈ و بنگال)

(27 اگست 2012 تا 21 ستمبر 2012)

بھاگلپور	27 تا 28 اگست 2012
بانکا	29 تا 30 اگست 2012
دیوگھر	31 اگست تا 1 ستمبر 2012
دھنباد	2 تا 3 ستمبر 2012
آسنسول	4 تا 5 ستمبر 2012
رانی گنج	6 تا 8 ستمبر 2012
بردوان	9 ستمبر 2012
ہگلی	10 تا 11 ستمبر 2012
ہوڑہ	12 تا 13 ستمبر 2012
کولکاتہ	14 تا 19 ستمبر 2012
24 پرگنہ	20 تا 21 ستمبر 2012

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی

منٹو کے وکیل کی سالگرہ

نئی دھلی: ملک کے ممتاز کانگریس رہنما، معروف وکیل اور مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل کپل سبل نے اپنی وزارت کے تحت اردو کے مقتدر سرکاری ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کارکردگی کو جس طرح تقویت بخشی ہے اور اردو زبان وادب وتہذیب کی ترقی کے لیے جس خلوص اور ذاتی دلچسپی کا عملی ثبوت پیش کیا ہے، وہ پوری اردو دنیا پر روشن ہے۔ سبل صاحب کے والد

ہیرالعل سبل بین الاقوامی شہرت کے وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی روشن خیالی، سماجی خدمات اور اردو دوستی کے لیے بھی جانے جاتے ہیں۔ 97 سالہ بزرگ محترم ہیرالعل سبل کا اردو اور اردو والوں سے عملی رشتہ تقسیم وطن سے قبل اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں طور پر اس وقت درج ہوا تھا جب وہ لاہور کے ادبی اور تہذیبی حلقوں میں انتہائی معروف ومقبول تھے جب اردو کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو پر فحاشی کے الزام میں مقدمات جاری تھے، اس وقت لاہور کے نامور وکیل کی حیثیت سے ہیرالعل سبل نے منٹو مرحوم کی طرف سے کامیاب پیروی کی اور انھیں برطانوی قانون کے شکنجے سے آزاد کرایا تھا۔ بزرگ ہیرالعل سبل کی ذات گرامی فی الوقت پوری دنیائے اردو کے لیے خصوصی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ یہ اردو کے لیے خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ اردو کے عہد آفریں افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی صدی تقریبات کا سال ہے، دنیا کے ہر اس گوشے میں جہاں اردو والے موجود ہیں کروڑوں محبانِ اردو کے لیے یہ انتہائی فخر و مسرت کی بات ہے کہ ہمارے درمیان ایک ایسی باوقار ہستی موجود ہے جس کا عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو سے قریبی تعلق رہا ہے۔ ہم میں سے ہر اردو والا اس بات پر خوشی محسوس کرتا ہے کہ 16 جولائی 2012 کو محترم ہیرالعل سبل کی 98 ویں سالگرہ کے پرمسرت موقعے پر عالمی اردو ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی طرف سے چنڈی گڑھ میں واقع ان کی رہائش گاہ پر منعقد ایک خصوصی تقریب میں گلہائے محبت وعقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ موصوف کو کروڑوں اردو والوں کی جانب سے 'عالمی وکیل اردو' کا خطاب بھی پیش کیا جارہا ہے۔ محترم ہیرالعل سبل کو پیش کیے جانے والے خطاب کے ساتھ عالمی لفظ کا استعمال بے وجہ نہیں ہے۔ سبل صاحب نے نصف صدی سے زائد عرصے تک غیر منقسم برصغیر اور تقسیم کے بعد آزاد جمہوریہ ہند کی عدلیہ میں ایک انتہائی لائق اور کامیاب ایڈوکیٹ کی حیثیت سے جو شہرت اور کامرانی حاصل کی، اس کی بازگشت ملک و بیرون ملک دور تک گونجتی رہی ہے۔ آپ کی اعلیٰ ترین قانونی خدمات کے صلے میں انٹرنیشنل بار ایسوسی ایشن نے 1994 میں آپ کو Living Legend of the Law کے باوقار اور غیر معمولی اعزاز سے سرفراز کیا تھا۔ 2004 میں سماجی تنظیم روٹری کلب نے آپ کو پنجاب رتن ایوارڈ پیش کیا۔ 2006 میں جناب ہیرالعل سبل کی غیر معمولی قانونی وسماجی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے پدم بھوشن سے نوازا۔ ریسرچ کونسل آف پبلک سروسز نے سبل صاحب کو The Great Son of India کا خطاب دے کر اسم بامسمّیٰ کی مثال پیش کی۔ سبل صاحب 2 مرتبہ پنجاب و ہریانہ مشترکہ عدلیہ کے بعد حکومت پنجاب کے ایڈووکیٹ جنرل کے منصب پر نمایاں خدمات انجام دیں۔ اپنے شاندار کیریئر میں سبل صاحب نے حق و انصاف کی پاسداری، مظلوموں کی حمایت اور ملک کی سیکولر جمہوری اقدار کے فروغ کو ہمیشہ اولیت دی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 جولائی 2012

اردو میں سائنسی کتابوں کی اشاعت

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سنٹر فار پروموشن آف سائنس نے اردو زبان میں سائنس کی کتابوں کی طباعت واشاعت کے لیے حکومت ہند کے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی شعبے کے وگیان پرسار ادارے کے ساتھ ایک عہدنامہ تیار کیا ہے۔ سنٹر فار پروموشن آف سائنس کی ڈائریکٹر ڈاکٹر فاطمہ شجاعت اللہ نے بتایا کہ اس معاہدے کے تحت دونوں ادارے اردو میڈیم اسکولوں اور دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم کو عام کرنے کے مقصد سے اردو زبان میں سائنس کی امدادی اور نصابی کتب کی طباعت واشاعت میں ایک دوسرے کا تعاون کریں گے۔ عہدنامے پر وگیان پرسار کے ڈائریکٹر مسٹر سندیپ بروا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار گروپ کیپٹن (ریٹائرڈ) شاہ رخ شمشاد نے دستخط کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 اگست 2012

اقلیتوں کی تعلیم میں کمیشن کی دلچسپی

نئی دھلی: اقلیتوں کی تعلیمی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے اب قومی اقلیتی کمیشن نے پیش رفت شروع کردی ہے۔ مسلم اکثریتی علاقوں میں تعلیمی وسائل کی دستیابی اور اسکولوں کے قیام کو لے کر قومی اقلیتی کمیشن نے مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل اور ریاستی حکومتوں کو مسلم اکثریتی علاقوں میں اسکولی نظام میں بہتری اور انھیں ان کی زبان میں ہی تعلیم دینے کے لیے بہتر اقدامات کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ قومی اقلیتی کمیشن کے سربراہ وجاہت حبیب اللہ کے ذریعے بھیجے گئے مکتوب میں مسلم اکثریتی علاقوں میں اردو میڈیم اسکول کھولنے اور علاقے میں تعلیم کو فروغ دینے کی ہر ممکن کوشش کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ کمیشن کے ذرائع سے مل رہی خبروں کے مطابق ریاستی حکومتوں کے ایجوکیشن سکریٹریز کے نام لکھے گئے خطوط میں اقلیتوں کو تقسیم کی جانے والی اسکالرشپ کے نظام میں بھی شفافیت لانے پر زور دیا گیا ہے۔ اس تعلق سے قومی اقلیتی کمیشن تمام ریاستی سرکاروں نے ایجوکیشن سکریٹریز سے ملاقات کرکے اقلیتوں کی تعلیم پر تفصیلی بات چیت کرنے پر بھی غور کررہا ہے۔ کمیشن کی رکن سیدہ امام بلگرامی کے مطابق سب سے اہم مسئلہ اسکالرشپ سے فائدہ اٹھانے کا ہے۔ وظائف کی تقسیم کی صحیح طریقے سے تشہیر نہ ہونے اور وقت کی درجہ بندی بہتر نہ ہونے کی بنا پر عام طور پر وظائف سے فائدہ اٹھانا مشکل ہوجاتا ہے۔ کمیشن کا ماننا ہے کہ پسماندہ مسلمانوں

کی معاشی صورت حال بہتر کرنے کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ لازمی اس کی تعلیمی صورتِ حال کو بہتر کرنا ہے جس کے لیے بنیادی طور پر مسلمانوں کو ان کی مادری زبان میں بھی اچھی تعلیم فراہم کرنے کی ذمے داری سرکار کی ہے۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 2 اگست 2012

مادری زبان میں تعلیم کی سفارش

نئی دھلی: لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے اپنی 48 ویں رپورٹ مرکزی اقلیتی وزارت کو پیش کردی ہے جس میں اقلیتی فرقوں کو ان کی مادری زبان میں پرائمری سطح تک تعلیم فراہم کرنے، دوسری سطح تک اقلیتی زبانوں کی تدریس کو لازمی بنانے اور لسانی اقلیتوں کے طلبا کو ان کی پسند کی زبان کی تعلیم حاصل کرنے کی سہولت فراہم کرنے کی پرزور سفارش کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں لسانی اقلیتوں کے لیے اسکیم آف دی سیف گارڈس کے تحت اقلیتی زبانوں کے اساتذہ، نصابی کتب، تراجم اور دیگر چیزوں کی سہولیات فراہم کرنے کی سفارش کی گئی ہے جہاں لسانی اقلیت کی آبادی 15 فی صد یا اس سے زیادہ ہو۔ کمشنر نے اپنی تازہ رپورٹ میں یہ بھی سفارش کی ہے کہ اگر کسی ضلع کے کسی مقام پر لسانی اقلیت کی آبادی 60 فی صد ہے تو ان کی زبان کو اضافی انتظامی و سرکاری زبان بنائی جائے تاکہ اس زبان کے بولنے والوں کو اپنی زبان میں سرکاری کام کاج کا موقع ملے۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر ڈاکٹر نند لال جوتوانی نے یہ رپورٹ مرکزی اقلیتی امور کے وزیر سلمان خورشید کو ان کے دفتر جاکر پیش کی۔ اس موقعے پر وزیر مملکت ونسیٹ اینچ پالا، اقلیتی وزارت کے سکریٹری ڈاکٹر سرجیت مترا اور وزارت کے دیگر سینئر افسران موجود تھے۔ یہ رپورٹ اب صدر جمہوریہ کو پیش کی جائے گی جو اسے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پیش کرنے کی ہدایت دیں گے۔ اس 48 ویں رپورٹ میں جولائی 2010 سے جون 2011 تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس میں لسانی اقلیتوں کے مفادات کے متعلق اسکیم آف دی سیف گارڈس کے تمام ریاستوں اور مرکزی علاقہ جات میں عمل آوری کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے نیز 47 ویں رپورٹ پر ایکشن ٹیکن رپورٹ کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ واضح رہے تازہ رپورٹ میں ضلع اور تحصیل کی سطح پر لسانی اقلیتی زبان کو اضافی سرکاری زبان بنانے کی وکالت کرنے کے علاوہ انتظامی شکایات کو اقلیتی زبانوں میں حاصل کرے اور اس کا جواب ان کی زبان میں دینے، ریاستی سروس کمیشن کے تحت مقابلہ جاتی امتحان کا اہتمام اقلیتی زبان میں کرنے نیز لسانی اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے مناسب دفتری انتظام کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 28 جولائی 2012

دہلی اردو اکادمی کی ایوارڈ تقسیم

نئی دھلی: اردو زبان دہلی کی شناخت ہی نہیں کراتی بلکہ اردو دہلی کی روایت رہی ہے۔ اردو دہلی کی تہذیب ہی نہیں دہلی کی تاریخ و تعمیر ترقی میں اردو زبان نے ایک اہم کردار نبھایا ہے۔ پچھلے سالوں میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب محسوس کیا جانے لگا کہ اردو زبان دہلی سے ختم ہوجائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ اس شیریں اور مٹھاس بھری زبان کو بڑھاوا دینے کے لیے دہلی سرکار نے دوسری زبان کا درجہ دیا۔ دہلی سرکار اردو اکادمی کے ذریعے اردو زبان کو راجدھانی میں فروغ دینے کے لیے کام کررہی ہے لیکن اکادمی کو یہ ترقی کا سفر رکھنے نہیں دینا چاہیے بلکہ اس زبان کو دہلی میں مزید مقبول بننے کا سلسلہ مسلسل جاری رکھنا ہوگا۔ ان کی سرکار اس زبان کو فروغ دینے کے لیے بجٹ کی کمی نہیں ہونے دے گی۔ ان خیالات کا اظہار وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت نے اردو اکادمی کے زیر اہتمام دہلی سکریٹریٹ میں سالانہ ایوارڈ تقریب 2011 کے موقعے پر منعقد تقریب میں کیا۔ تقریب میں ملک کے مختلف شعبوں سے وابستہ نامور شخصیات میں تین کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ سمیت 10 ایوارڈ یافتگان کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر وزیر توانائی و خوراک رسد ہارون یوسف اور وزیر سماجی بہبود پروفیسر کرن والیہ بطور خاص موجود تھیں۔ وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت و دیگر کے دست مبارک سے سید وارث حسین علوی اور مظہر الحق علوی کو ان کی مجموعی علمی ادبی خدمات کے اعتراف میں 'کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ' 2011، اور سید محمد علوی کو ان کی طویل مدتی ادبی و شعری خدمات کے اعتراف میں کل ہند بہادر شاہ ایوارڈ دیا گیا۔ تینوں ایوارڈ یافتگان کو ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ روپے، اسناد و قومی نشان پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ دہلوی تہذیب و ثقافت کی نمائندہ شخصیت ڈاکٹر اسلم پرویز کو ان کی علمی و ادبی اور تصنیفی و تحقیقی خدمات کے اعتراف میں 'پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ 2011 پیش کیا گیا اور اس ایوارڈ کی رقم بھی ڈیڑھ لاکھ روپے ہی تھی۔ اس کے علاوہ محترمہ انور نزہت (اصل نام انوری بیگم) کو ان کی فکشن نگاری کے تئیں گرانقدر خدمات کے پیش 'ایوارڈ برائے تخلیقی ادب، ڈاکٹر مولا بخش اسیر کی تنقیدی و تحقیقی خدمات کے اعتراف میں 'ایوارڈ برائے تحقیق و تنقید'، علمی گھرانے سے تعلق رکھنے والے قمر سنبھلی (اصل نام سلطان الدین) کو ان کی شعری خدمات کے اعتراف میں 'ایوارڈ برائے شاعری'، اتر پردیش کے مردم خیز اور تاریخ ساز خطے امروہہ سے تعلق رکھنے والے مختلف اخبارات و رسائل میں صحافتی اور انتظامی امور پر مہارت رکھنے والے مودود صدیقی کو ان کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں 'ایوارڈ برائے اردو صحافت' تنقیدی اور تحقیقی مقالے پر مہارت اور شاعرانہ ہنر مندی کا کمال دکھانے والے ڈاکٹر اخلاق احمد آہن کو اردو ترجمہ کے تئیں بہترین خدمات کے اعتراف میں 'ایوارڈ برائے اردو ترجمہ' اور معروف مغنی خاندان میں پیدا ہوئے فن موسیقی اور گائیکی کے ممتاز و ماہر استاد چاند خاں سے تربیت یافتہ اساتذہ اقبال احمد خاں کو موسیقی کے میدان میں ان کی گراں قدر خدمات کے لیے 'غزل گائیکی ایوارڈ' پیش کیا گیا۔ ان تمام ایوارڈ یافتگان کو 50-50 ہزار روپے، اسناد اور قومی نشان سے پیش کیا گیا۔ وزیر توانائی ہارون یوسف نے کہا کہ اردو کی ترقی اور اس زبان کو عوام میں مقبول بنانے کے ساتھ روزگار سے جوڑنا سرکار کی اولین ترجیح میں شامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ وزیر اعلیٰ کی خواہش کے مطابق ہی اردو اساتذہ کی بحالی کے لیے آر آر میں تبدیلی کی جارہی ہے اور تعلیم کو فروغ دینے کے لیے آٹھویں کے تین اسکولوں کو 12 ویں تک اَپ گریڈ کیا جارہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسکولوں میں ابھی حساب و سائنس کے اساتذہ

کی بحالی میں رکاوٹ آرہی ہے لیکن آر آر میں تبدیلی سے یہ رکاوٹ دور ہوجائے گی۔ وزیر سماجی بہبود پروفیسر کرن والیہ نے اردو زبان سمیت تمام زبانوں کی حفاظت کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ وقت کی ضرورت ہے کہ ان زبانوں کو تحفظ دیا جائے۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین اختر الواسع نے کہا کہ اردو قلم و کتاب سے ہی تعلق نہیں رکھتی اور اردو زبان نے تمام شعبوں میں اپنا لوہا ہی نہیں منوایا بلکہ اردو کلاسیکی نے اردو زبان کو مزید خوبصورتی دی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پچھلے سالوں میں بہادر شاہ ظفر ایوارڈ ایک شخصیت کو دیا جاتا تھا لیکن وزیر اعلیٰ نے اکادمی کی سفارش پر اس مرتبہ یہی ایوارڈ تین شخصیات کو دینے کا فیصلہ کیا انھوں نے وزیر اعلیٰ سے اردو زبان کے فروغ کے لیے اکادمی کا بجٹ 10 کروڑ کرنے کی اپیل کی۔ پروفیسر اختر الواسع نے وزیر اعلیٰ سے مطالبہ کیا کہ جس طرح اساتذہ کی بحالی کا فیصلہ لیا گیا ہے اسی طرز پر سرکاری دفاتر میں اردو منتظمین کی تقرری کی جائے، ساتھ ہی اردو صحافیوں کو سہولتیں مہیا کرائی جائیں سکریٹری اردو اکادمی انیس اعظمی نے اپنے منفرد انداز میں سرکار کے تعاون سے اکادمی کی کارکردگی کو تفصیل سے بیان کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 جولائی 2012

گلزار دہلوی کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے

نئی دہلی: مشہور و معروف شاعر اور مجاہد آزادی پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کے 87 واں یوم پیدائش کے موقعہ پر انجمن تعمیر اردو دہلی اور شیام لال یادو میموریل ٹرسٹ نے کیلاش اسپتال آڈیٹوریم نوئیڈا میں

ایک تہنیتی جلسے اور محفل شعر وسخن کا اہتمام کیا۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی سید سبط رضی سابق گورنر اور سابق مرکزی وزیر نے کہا کہ گلزار دہلوی نے عمر بھر پیار، محبت، امن و آشتی اور وطن دوستی کا پیغام دیا۔ ہندوستان کے ثقافتی منظرنامے پر ان کی شخصیت اور کارنامے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ نوجوانی کے دور سے لکھنؤ میں بھی گلزار دہلوی کی تقریریں اور نظمیں سنتے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سیاست بھی سماج کا ایک اہم شعبہ ہے اور اس میں دلچسپی ایک مثبت رجحان ہے۔ گلزار دہلوی کی شخصیت میں شعر و ادب کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست سے دلچسپی بھی ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو ہے۔ انڈیا اسلامک کلچر سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے گلزار دہلوی سے اپنی طویل وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ گلزار دہلوی اُن کے اُن اساتذہ میں ہیں جن کا وہ بے حد احترام کرتے ہیں۔ کروڑی مل کالج دہلی میں اپنے طالب علمی کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ گلزار دہلوی جیسی شخصیات کے سبب اس دور میں اردو سے لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوا۔ اس موقعے پر ایم ایس قریشی نے گلزار دہلوی پر اپنا مضمون پڑھا۔ جلسے کی نظامت حسن ضیا نے کی۔ شیخ علیم الدین اسعدی اور راج یادو نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس کے بعد ایک محفل شعر وسخن کا اہتمام کیا گیا جس کی نظامت ملک زادہ جاوید نے کی۔

پریس ریلیز، دہلی علیم الدین اسعدی، 26 جولائی 2012

وارث علوی، محمد علوی اور مظہر الحق علوی کے اعزاز میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استقبالیہ جلسہ

نئی دہلی: عمیق مطالعہ بصیرت و بصارت کا ضامن ہے۔ میں نے لائبریریوں سے رشتہ قائم کیا، اور وہاں آنے والی ہر نئی کتاب کا مطالعہ بے حد ذوق وشوق سے کرنا اپنی زندگی کا اصول بنایا۔ میں نے جب تنقید کی دنیا میں قدم رکھا تو بے حد سنجیدگی سے لکھنا شروع کیا۔ لیکن میرا اپنا ایک اسلوب وضع ہوتا چلا گیا، جس میں ایک گہرا طنز تھا، ایک کاٹ دار نثر تھی لیکن کبھی بھی میں نے غیر سنجیدگی کو تنقید میں داخل نہیں ہونے دیا۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز نقاد و دانشور پروفیسر وارث علوی نے بزم جامعہ، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے منعقدہ استقبالیہ جلسے میں کیا۔ وارث علوی نے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ نئی اور علمی کتابوں کے مطالعے کا شوق لازم ہے۔ جلسے کی صدارت ممتاز نقاد پروفیسر شمیم حنفی نے کی۔ جب کہ پروفیسر وارث علوی، محمد علوی اور مظہر الحق علوی کا استقبال و خیر مقدم شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر خالد محمود نے اور شکریے کی رسم پروفیسر شہپر رسول نے ادا کی۔ اس موقع پر پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ شعبۂ اردو کے لیے یہ اعزاز ہے کہ اتنی اہم علمی شخصیات بیک وقت شعبۂ اردو اور جامعہ کی عزت افزائی کررہی ہیں۔ وارث علوی بحیثیت نقاد، محمد علوی بحیثیت شاعر اور مظہر الحق علوی ایک مترجم کی حیثیت سے بے پناہ شہرت رکھتے

ہیں۔ ان کی آمد سے یقیناً طلبا کو فیض پہنچے گا۔ محمد علوی نے اس موقع پر فرمایا کہ میری تعلیم جامعہ کے اسکول میں ہوئی اور میں نے اپنی شاعری کا آغاز جامعہ کے اسکول کے زمانے سے ہی کیا۔ آج میں شاعری کے حوالے سے جس مقام پر بھی ہوں اس کا بنیادی حوالہ جامعہ ہی ہے۔ اس موقعے پر مظہر الحق علوی نے کہا کہ اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا اور ان کا ترجمہ کرنا میرا بنیادی ذوق رہا ہے۔ اس زمانے میں ترجمے کو قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ آج بھی ترجمے کو ادب میں وہ مقام حاصل نہیں ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ترجمے کی وجہ سے ہی دنیا کی عظیم اور اہم کتابوں کا ہم اپنی زبان میں مطالعہ کرسکتے ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی نے صدارتی خطبے میں علوی برادران کی علم دوستی، کشادہ قلبی، مہمان نوازی اور ادب پروری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان حضرات سے میرے گذشتہ پچاس ساٹھ برسوں سے تعلقات ہیں۔ انھوں نے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر خالد محمود اور بزم جامعہ کے کنوینر ڈاکٹر ندیم احمد کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک تاریخی لمحہ ہے کہ ہم ایک ایسی عظیم علمی و ادبی شخصیات کے ساتھ جمع ہیں۔ اس استقبالیہ جلسے کے دیگر اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں مقتدر شخصیات وطلبا موجود تھے۔

پریس ریلیز پروفیسر شہزاد انجم، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، 17 جولائی 2012

رونق اکادمی کی تشکیل

چھتیس گڑھ: 11 مئی 2012 کو اردو دنیا کے مقبول ادیب و اردو میں افسانچے کے موجد سعادت حسن منٹو کی سو سالہ سالگرہ کے موقعے پر ملک کے تمام افسانچہ نگاروں کے تعاون سے کل ہند افسانچہ اکادمی کی تشکیل کی گئی۔ تمام افسانچہ نگاروں نے اتفاق رائے سے رونق جمال کو کل ہند افسانچہ اکادمی کا صدر چن لیا ہے۔ رونق جمال نے افسانچے کے سپہ سالار ڈاکٹر ایم اے حق کو جنرل سکریٹری کی ذمے داریاں سونپی ہیں آج حق افسانچے کا مقبول نام ہے۔ دونوں نے رائے مشورہ کرکے جناب جوگندر پال کو سرپرست اعلیٰ، رتن سنگھ، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور افتخار امام صدیقی کو سرپرست مقرر کیا ہے۔ ایڈوائزری بورڈ میں محمد بشیر مالیر کوٹلوی ڈاکٹر

اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر عظیم راہی، عارف خورشید، محترمہ صادقہ نواب سحر کو رکھا گیا ہے۔ اگلے ماہ تک ملک میں صوبائی افسانچہ اکادمیاں قائم کردی جائیں گی اور دسمبر میں درگ چھتیس گڑھ میں ملک گیر سطح پر دو روزہ سیمینار منعقد کیا جائے گا جس میں افسانچے پر مقالے پڑھے جائیں گے۔ افسانے پر ورک شاپ ہوگا اور افسانچہ خوانی ہوگی عالمی سطح پر افسانہ نمبر بھی شائع کیا جائے گا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر ایم اے حق، چھتیس گڑھ، 28 جون 2012

وہاب اشرفی میموریل ریسرچ اینڈ ایجوکیشنل سنٹر، بہار کا قیام

پٹنہ: وہاب اشرفی کی ادبی وراثت کے تحفظ اور توسیع کے سلسلے میں گزشتہ روز وہاب اشرفی کی قیام گاہ اشرفی ہاؤس ہارون نگر پٹنہ میں ایک نشست کا انعقاد ڈاکٹر قاسم خورشید کی صدارت میں کیا گیا۔ وہاب اشرفی کے فرزندان جناب شکیل اشرفی، ڈاکٹر افروز اشرفی، جناب انجم اشرفی اور جناب شہیر اشرفی نے اس میٹنگ میں شرکت کی اور کئی اہم فیصلے لیے۔ سید شہیر اشرفی نے مشورے کے بعد اپنے فلیٹ میں باضابطہ طور پر 'وہاب اشرفی میموریل ریسرچ اینڈ ایجوکیشنل سنٹر، بہار' قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر سید افروز اشرفی نے بتایا کہ سید وہاب اشرفی کی تمام کتابیں، فلمیں، تصویریں اور دوسری یادگاریں، یہاں رکھی جائیں گی۔ اس ادارے میں باضابطہ طور پر مینیجنگ ڈائرکٹر، سکریٹری، جوائنٹ سکریٹریز، ورکنگ سکریٹری، اسسٹنٹ ڈائریکٹر، ایسوسی ایٹ سکریٹری، کیئر ٹیکر وغیرہ کے ساتھ ہی دوسرے کئی ارکین ہوں گے۔ وہاب اشرفی سے متعلق لگاتار تحقیق کے کام کیے جائیں گے۔ افروز اشرفی نے مزید فرمایا کہ ہماری کوشش ہوگی کہ ہر سال ان کے نام پر ایوارڈ دیے جائیں۔ پٹنہ کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی ان پر پروگرام منعقد کیے جائیں۔ اس انسٹی ٹیوٹ کو گلوبل سطح پر ایک پہچان دی جائے گی۔ میٹنگ میں سرپرست کے طور پر ڈاکٹر شکیل احمد ممبر پارلیامنٹ، ڈاکٹر مناظر حسن ممبر پارلیامنٹ، ڈاکٹر سید عبید اللہ اعظمی ممبر پارلیامنٹ، پروفیسر گوپی چند نارنگ، اور ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کے نام کی تجاویز کے ساتھ مجلس عاملہ کی تشکیل دی گئی جس میں پروفیسر شمشاد حسین، شفیع جاوید، پروفیسر لطف الرحمٰن، شفیع مشہدی، پروفیسر امتیاز احمد، ڈاکٹر قاسم خورشید، پروفیسر عبدالواسع، ڈاکٹر وکیل اشرفی، سید شکیل اشرفی، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ڈاکٹر کہکشاں پروین، سکریٹری جناب سید افروز اشرفی، جوائنٹ سکریٹریز، سید انجم اشرفی، سید شہیر اشرفی، مینیجنگ ڈائریکٹر، پروفیسر محمود عالم، اسسٹنٹ ڈائریکٹر حسن احمد بنائے گئے۔ اس میٹنگ میں وہاب اشرفی کے دنیا بھر میں پھیلے مداحوں کی سہولت کے لیے باضابطہ طور پر ان کے فرزند نامور انگریزی نقاد تخلیق کار ڈاکٹر سید افروز اشرفی کو ادبی وارث بھی قرار دیا گیا اور تمام محبان سے گزارش کی گئی کہ وہاب اشرفی کے سلسلے میں کسی بھی طرح کی اطلاع یا سہولت کے لیے ان سے رابطہ 09934768855, 09431826709 اور 0556492741 نمبروں پر کیا جاسکتا ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں ڈاکٹر قاسم خورشید نے فرمایا کہ یہ انتہائی مسرت کا مقام ہے کہ وہاب اشرفی جیسی بین الاقوامی شہرت یافتہ شخصیت کی ادبی خدمات کو نسلوں میں منتقل کرنے کے لیے ان کے لائق فرزندان نے فوری طور پر عملی اقدامات کیے ہیں۔ اس میٹنگ میں سید شکیل اشرفی، سید افروز اشرفی، سید شہیر اشرفی، سید انجم اشرفی، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، جناب ابوالکلام عزیزی، محمد شکیل الدین، سید عبید اللہ سبیلی کے علاوہ دوسرے کئی لوگ موجود تھے۔

پریس ریلیز، ایس، اے سبیلی، پٹنہ 23 جولائی 2012

کلیم الدین احمد کی اقبال شناسی پر توسیعی خطبہ

پٹنہ: شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے اردو ادب کے مشہور ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد پر ایک توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب شمبھو ناتھ نے کی۔ پروگرام کا افتتاح پروفیسر اعجاز علی ارشد ڈین اسٹوڈنٹس ویلفیئر پٹنہ یونیورسٹی نے کیا۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اشرف جہاں نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ کلیدی خطبہ پروفیسر عبدالحق سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی نے پیش کیا جس کا موضوع تھا 'کلیم الدین احمد کی اقبال شناسی'۔ پروفیسر حق نے کہا کہ یہ موضوع تلوار کی دھار پر گزرنے کے مترادف ہے لیکن اشرف جہاں کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے اس موضوع پر لکھنا ضروری ہوگیا۔ انھوں نے کلیم الدین احمد کے حوالے سے اس حقیقت کو بیان کیا کہ ''فکر کی گہرائی سے ہی شعر میں عظمت پیدا ہوتی ہے۔'' مقالہ کی علمی گہرائی اور مقالہ نگار کے پڑھنے کے انداز نے سامعین پر کیفیت سی طاری کر دی تھی۔ وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی نے خواہش ظاہر کی کہ اردو زبان جو ہندوستان میں رابطے کی سب سے بڑی زبان ہے صرف شعر و شاعری تک محدود نہ رہے بلکہ اس زبان میں سائنس وغیرہ کی کتابیں بھی لکھی جائیں۔ انھوں نے اعلان کیا اردو ڈپارٹمنٹ میں ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے نام پر ایک چیئر (Chair) کا قیام عمل میں آئے گا۔ وائس چانسلر کے اس اعلان کو پرجوش تالیوں سے حمایت ملی۔ مہمان خصوصی پروفیسر شمشاد حسین سابق وائس چانسلر مگدھ یونیورسٹی نے خاص انداز میں کلیم الدین احمد اور سر محمد اقبال کی شاعری پر اپنے نظریات کا اظہار کیا۔ کاشی ودیا پیٹھ سے پروفیسر رفیع اللہ، بہار یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر توقیر عالم نے بھی اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر اسرائیل رضا نے نظامت کی جب کہ ایم عظیم اللہ نے ایک نظم کے ساتھ اظہار تشکر کیا۔

پریس ریلیز، کامران غنی، پٹنہ، 24 جولائی 2012

دھلی:

محترمہ ناہید افروز کبیر کا توسیعی خطبہ

نئی دھلی: ''آسٹریلیا میں اسلام افغان چرواہوں کے ذریعے پہنچا۔ آسٹریلیا کے ریگ زاروں میں اونٹوں کے ذریعے نقل وحمل کے وسائل کے فروغ میں ان افغانوں کا اہم رول رہا۔ یہ لوگ وہاں خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے۔ آسٹریلیا میں بنیادی طور پر اسلام انہیں کے ذریعے پہنچا۔'' ان خیالات کا اظہار ممتاز اسکالر اور سماجی علوم کی ماہر محترمہ ناہید افروز کبیر نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے میر انیس ہال میں ایک توسیعی خطبے میں کیا۔ ''آسٹریلیا میں مسلمان: ایک تاریخی تناظر'' کے موضوع پر اس خطبے کا اہتمام شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کیا تھا۔ پروفیسر اخترالواسع، صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز نے مہمان مقرر کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر ناہید افروز کبیر بنگلہ دیش نژاد آسٹریلوی ہیں انھوں نے 1996 میں اپنے علمی سفر کا آغاز کیا لیکن بہت جلد اپنی محنت، لگن اور برطانیہ، امریکہ اور آسٹریلیا میں مسلم نوجوانوں کے حوالے سے اپنے کام کے سبب علمی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر لی۔ ان دنوں وہ ہندوستانی مسلم نوجوانوں سے متعلق ایک پروجیکٹ پر کام کر رہی ہیں اور اسی حوالے سے ان دنوں وہ ہندوستان کے مختلف شہروں کا سفر کر رہی ہیں۔ توسیعی خطبے کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رجسٹرار پروفیسر ایس ایم ساجد نے کی۔ انھوں نے اس اہم خطبے کے انعقاد پر شعبہ اسلامک اسٹڈیز کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ دنیا میں مسلمانوں کو سمجھنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے اور مسلمانوں کے بارے میں عام طور پر جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں انھیں تحقیق کے

ذریعے دور کیا جانا چاہیے۔ خطبے میں اسلامک اسٹڈیز کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ کے علاوہ جامعہ اور جامعہ کے باہر سے بھی متعدد اہم لوگوں نے شرکت کی۔ توسیعی خطبات سیریز کے انچارج ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق نے نظامت کے فرائض انجام دیے جب کہ شعبے کے سینئر استاذ ڈاکٹر اقتدار محمد خاں نے مہمان اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، ذہین اختر ندوی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 24 جولائی 2012

آسنسول کی قدیم اردو لائبریری

آسنسول: مولانا ابوالکلام آزاد اردو لائبریری آسنسول کو 1928 میں اس وقت کے چند سماجی کارکنان اور علم دوست حضرات نے قائم کیا تھا جسے آسنسول میں ایک ورثہ کی حیثیت حاصل ہے۔ پہلے یہ ینگ مین مسلم ویلفیئر سوسائٹی کے نام سے قائم کیا گیا اور علاقے میں ریڈرشپ پیدا کرنے کے مقصد سے اس وقت کے اردو کے یہ جانباز سپاہی جہانگیری محلہ قبرستان کے ایک کونے میں اس کے لیے جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے جب مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم ہوئے تو یہاں کے ذی شعور لوگوں نے اس سوسائٹی کا نام بدل کر مولانا آزاد اردو لائبریری میں تبدیل کر دیا۔ اس لائبریری کو اپنی اس طویل مدت کے دوران اگر کبھی خوشوار لمحات ملے تو وہ اس کے ابتدائی دور میں ہے۔ اس کے بعد ایک اور خوشگوار لمحہ اس وقت آیا جب مقامی پولس انتظامیہ بالخصوص آسنسول نارتھ تھانہ کے افسر انچارج سادھن بنرجی اور آسنسول کے اس وقت کے ایڈیشنل ایس پی باشب بیدیہ نے اسے جھونپڑی سے اٹھا کر ایک پختہ عالیشان عمارت میں منتقل کر دیا۔ آج دنیا کے بدلتے رنگ اور تفریح کے نئے نئے وسائل کی وجہ سے اس لائبریری کو ایک بار پھر اپنے قارئین کی تلاش ہے۔ لائبریری میں 1952 سے مستقل آنے والے قاری محمد یوسف نے کہا کہ اس لائبریری کی طرف اردو کے بڑے لوگوں کو دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ یہاں اب کوئی نہیں آتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کے بجائے ایک جگہ مل جل کر اسی لائبریری میں آئیں اور نئی دنیا کے مزاج و ماحول کے مطابق اسے سنوارنے اور سجانے کی طرف عملی قدم اٹھائیں۔ محمد یوسف کی یہ باتیں نہایت اہم ہیں۔ آیئے اب اس لائبریری کی داستان لائبریری کی زبانی ہی سنیں کہ اس نے کیسے کیسے نشیب و فراز دیکھے اور یہ اردو لائبریری ہم اردو والوں سے کیا تقاضہ کر رہی ہے۔

روزنامہ 'آزاد ہند' کولکاتہ، 17 جولائی 2012

جنوبی دہلی میں عربی سائن بورڈ

نئی دہلی: جنوبی دہلی کے مالویہ اسمبلی حلقے میں بتایا جاتا ہے کہ غیر مسلم بھی روزگار کی خاطر عربی سیکھنے میں دلچسپی لے رہے ہیں، اور وہ لوگ بھی جو اردو میں بات کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے اب بصد خلوص عربی پر توجہ دے رہے ہیں۔ عربی کے فروغ سے خوش اردو ادب کی نمائندہ تنظیم شناخت کے مشیر خاص انجینئر افسر حسین عارف خان نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا یہاں عربی کے فروغ میں روزگار کا دخل سب سے اہم درجہ رکھتا ہے اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے کسی بھی زبان کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ پریس انکلیو روڈ اور بالخصوص گاندھی پارک، حوض رانی سے متصل آبادی میں غیر مسلموں کے چائے خانوں، پھلوں کی دکانوں، ٹورسٹ دفاتر، کھانے کے ہوٹلوں، اور کیمسٹوں پر عربی کا واضح انداز میں استعمال کیا جانا اور کمروں کے خالی ہونے کی نشاندہی میں (سکنہ ایلجار) جیسے جملوں کا عربی میں تحریر کیا جانا عربی سے روزگار کے جڑے ہونے کی دلیل ہے۔ اتنا ہی نہیں گیسٹ ہاؤس کی طرز پر خالی جگہ اور گھر کے استعمال کی اشیا کا پیغام (مفروشات غرف) وغیرہ کا غیر مسلموں کی دکانوں کے دروازوں پر لکھا ہونا عربی کی ضرورت کو تسلیم کراتا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 جولائی 2012

کلیاتِ غنی کی اشاعت

راجستھان: اپنے دور کے امیر خسرو، اردو زبان کے شاعر، ہندی کوی اور فارسی کلام کے مجموعۂ سخن 'کلیاتِ غنی' کا کمپوز شدہ مسودہ مسلسل دو سال کی تحقیق، ترتیب، تدوین اور تزئین کے بعد طباعت اور اشاعت کے مرحلوں سے گزر کر بفضل حق تعالیٰ حسن زیب کتاب کی شکل میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس مبارک موقعے پر 'بزم غنی' بیاور کے زیر اہتمام 'کلیات غنی' کی اشاعت کے کارنمایاں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں معاونین و محسنین حضرات کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ایک تقریب برائے اظہار تشکر منعقد کی گئی۔ محمد علی میموریل سینئر سکنڈری اسکول، بیاور، ضلع اجمیر (راجستھان) کے اسمبلی ہال میں مورخہ 23 جون 2012 بروز سنیچر کو منعقدہ تقریب اظہار تشکر میں مہمان خصوصی ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نیازی، چیئرمین راجستھان اردو اکادمی، جے پور اور جناب خدا داد خان مونس، سابق ناظم، درگاہ خواجہ صاحب، اجمیر شریف اور بحیثیت صدر، ڈاکٹر جگمل سنگھ، صلاح کار، ہندی بھاشا وکاس پریشد، بھارت سرکار، نیز اردو ہندی کی قابل قدر شخصیات نے شرکت کی۔ ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نیازی نے ماسر عبدالغنی کو غیر معمولی صفات کا حامل بتاتے ہوئے انھیں 'راجستھان رتن' کے خطاب سے نوازے جانے کی پرزور حمایت کی اور بزم غنی کو مکمل تعاون کی یقین دہائی کراتے ہوئے حوصلہ افزائی کی۔

پریس ریلیز، عبدالجبار خلجی، بزم غنی بیاور، اجمیر، 3 جولائی 2012

راجستھان:

گرم کنڈہ میں اردو میڈیم ایم پی سی، بائی پی سی میں انٹرمیڈیٹ کالج کی منظوری دی گئی

10 آگست 2012 رایلسیما کے ضلع چتوڑ میں پہلی مرتبہ انٹرمیڈیٹ اردو میڈیم کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے طلبا وطالبات کے لیے حکومت کی جانب سے منظوری دے دی گئی، جس میں خصوصی طور پر سائنسی گروپ خاص کر ایم پی سی اور بائی پی سی میں آج تک ضلع چتوڑ میں کوئی گورنمنٹ کالج موجود نہیں تھا اس لیے تمام

ضلع کے اردو طلبا اور والدین حکومت کے اس فیصلے پر جناب این کرن کمار ریڈی اور این کشور کمار ریڈی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور کالج ڈولپمنٹ کمیٹی کے اراکین ڈی امجد علی خان اور سکریٹری محمد ضمیر خان اور دیگر اراکین طلبا و طالبات کے والدین سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اس اردو میڈیم کالج میں داخلہ دلا کر اردو دوستی کا ثبوت پیش کریں۔ جناب محمد نقی اللہ خان نے کہا کہ خاص کر کالج میں طلبا کے تعلیمی معیار اوران کی ہمہ جہتی ترقی پر مکمل توجہ دینے کی کوشش کی جائے گی۔

پریس نوٹ: نقی اللہ خان نقی، گرم کنڈہ 13 اگست 2012

کرناٹک:

بنگلور میں اردو اساتذہ کا اجلاس

بنگلور: کرناٹک اردو اکادمی بنگلور میں ریاست کے

مختلف اضلاع سے آئے ہوئے اساتذہ کرام کا ایک اجلاس بنام 'اردو تحریک' منعقد ہوا۔ اس موقعے پر تمام اردو اساتذہ نے کرناٹک اردو اکادمی کے چیئرمین حافظ کرناٹکی سے اردو سے متعلق مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کیا، اساتذہ کے مسائل سننے کے بعد حافظ کرناٹکی نے کہا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ زبان ہی سے کسی بھی قوم کی پہچان بنتی ہے کیونکہ یہی قومی ثقافت کا چہرہ ہوتی ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ تمام حضرات قوم کے نونہالوں کی تعلیم کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ فی الوقت یہاں پر آپ لوگوں کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ لوگ اردو زبان کی تعلیم و درس اور اپنے طالب علموں کی قابلیت بڑھانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ 16 جولائی 2012 سے ایک مرکزی ٹریننگ پروگرام شروع ہو رہا ہے۔ آپ حضرات اس میں حصہ لیں۔ تاکہ طریقۂ تدریس کے جدید ترجحان سے واقف ہوسکیں۔ کرناٹک اردو اکادمی کے رجسٹرار جناب ایس مرزا اعظمت اللہ نے کہا کہ یہ ہماری دیرینہ خواہش تھی کہ ہمارا ہر رسالہ ہر اسکول تک پہنچے۔ ہمارے اساتذہ بھی تخلیق کار بنیں اور ان کی تخلیقات اکادمی کے رسالوں میں شائع ہوں۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور، 11 جولائی 2012

مہاراشٹر:

رسم الخط زبان سے وابستہ تہذیب وثقافت کی ترجمانی کرتے ہیں

ممبئی: تاریخ آدمیت کے قدیم دور میں اپنے خیالات وجذبات کا اظہار صرف بول کر کیا جاتا تھا اور اس دور میں انسانوں کی قوت یادداشت کو بہت اہمیت حاصل

تھی۔ لکھنے اور پڑھنے کی روایت انسانی تاریخ میں بہت بعد میں نظر آتی ہے اور کسی بھی زبان کا رسم الخط صرف زبان سے ہی نہیں بلکہ زبان سے وابستہ مخصوص تہذیب وثقافت کی ترجمانی کرتا ہے۔ معروف سنسکرت اسکالر پروفیسر کے کے چترویدی نے 'قدیم ہندوستان میں تحریر نویسی کی تاریخ' کے موضوع پر تتھو بودھا سیریز کے تحت پبلک لیکچر میں اظہار خیال کرتے ہوئے مزید کہا کہ دنیا کے مختلف حصوں اور ہمارے ملک کے بعض حصوں میں اب بھی ایسی کئی بولیاں ہیں جو صرف بولی جاتی ہیں لکھی نہیں جاتیں۔ انھوں نے کہا کہ رسم الخط کے سلسلے میں اب تک کی تمام تر ترمیمات اور اصلاحات کے باوجود کسی بھی زبان کے متعلق پورے وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ لکھے ہوئے حروف جذبات وخیالات کی ویسی ہی ترجمانی کرنے پر قادر ہیں جو کہ لکھنے والے کا مقصد اور مدعا رہا ہو۔ اس پروگرام کی صدارت ممبئی یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے سابق صدر اور ہندی کے معروف اسکالر پروفیسر رام جی تیواری نے فرمائی۔ انھوں نے اپنے مختصر صدارتی خطبے میں سنسکرت اور دیوناگری میں تحریر نویسی کے متعلق چند اہم نکات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر صاحب علی کی مخلصانہ کوششوں سے اس طرز کے علمی وادبی پروگرام شعبہ اردو کی شناخت بن گئے ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ مختلف زبان اور ادب کے سمجھنے اور سمجھانے کے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے پروفیسر صاحب علی شعبے کی جانب سے مختلف زبانوں کے درمیان تقابلی مطالعے کی کوئی ایسی سبیل نکالیں گے جس سے زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو مزید فائدہ ہوگا۔ پروفیسر تیواری نے کہا کہ اس نوعیت کے پروگرام سے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کی روایت کو مزید تقویت ملتی ہے۔

پریس ریلیز، صاحب علی، ممبئی 16 جولائی 2012

مہاراشٹر کے ہر شہر میں اردو گھر تعمیر کیا جائے گا

ممبئی: 17 جولائی کی شام وائی بی چوان پرتشٹھان ہال میں ایک پروقار تقریب میں اردو اکادمی نے گزشتہ 2 سال کے انعامات تقسیم کیے۔ اس موقعے پر ریاست مہاراشٹر کے ادیبوں، افسانہ نگاروں، صحافیوں، شاعروں، اساتذہ اور متعدد شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 2010-2009 کے لیے تقسیم کردہ ایواڈ توصیفی اسناد اور نقد رقم پر مشتمل تھے۔ ریاست کے وزیر اعلیٰ پرتھوی راج چوہان نے اپنے خطاب میں اردو زبان وادب اور صحافیوں کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ''اردو زبان ایک مذہب اور ایک قوم کی نہیں بلکہ پورے ملک کی زبان ہے۔'' انھوں نے اردو اکادمی کو ایک کروڑ روپے کا سالانہ فنڈ دینے کا بھی اعلان کیا۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ''ریاست مہاراشٹر کے ہر شہر میں اردو گھر تعمیر کیا جائے گا۔'' سامعین کی تالیوں کی گونج میں وزیر اعلیٰ نے یہ بھی کہا کہ اردو اور مراٹھی کو قریب لانے کی جو بھی کوششیں ہوسکتی ہیں وہ یقینی

رکن انقلاب عبدالحئی انصاری، وزیر اعلیٰ سے صحافت کا ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے۔ درمیان میں عارف نسیم خان کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

طور پر عمل میں لائی جائیں گی۔ انھوں نے بڑے خوشگوار انداز میں کہا کہ اردو زبان کو فروغ دینا ہے اور ہماری کوشش ہوگی کہ اردو جاننے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ساتھ ہی انھوں نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ جلد ہی شیواجی مہاراج کے سیکولر کردار کو نمایاں کرنے کے لیے کتاب شائع کی جائے گی۔ جلسے میں ریاست کے مختلف اضلاع سے ادیبوں، شاعروں اور دیگر فنکاروں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ریاستی وزیر برائے اقلیتی امور محمد عارف نسیم خان نے کہا کہ ''آزادی کے بعد یہ پہلا موقع ہوگا جب ریاست میں اردو اکادمی کے لیے ایک کروڑ روپے کا فنڈ مہیا کرایا جائے گا۔'' اردو کی مخالفت کرنے والوں کو ہدف تنقید بناتے ہوئے عارف نسیم خان نے کہا کہ ''یہ جوڑنے والی زبان ہے توڑنے والی نہیں۔'' انھوں نے وزیر اعلیٰ کے وعدے کو دہراتے ہوئے جہاں یہ کہا کہ ریاست کے ہر شہر میں اردو گھر بنایا جائے گا اور اس کے لیے قطعہ اراضی کی تلاش جاری ہے، وہیں یہ بھی بتایا کہ اقلیتی ترقیاتی محکمہ نے اردو اسکولوں کو بنیادی سہولت مہیا کرانے کے لیے ہر سال 2 لاکھ روپے دینے کی اسکیم شروع کی ہے۔ مہاراشٹر ایسا کرنے والی ملک کی پہلی ریاست ہے۔'' انعامات کی تقسیم کے آغاز سے قبل مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں نعیم فراز، سندر مالیگانوی، ڈاکٹر راحت اندوری، شبینہ ادیب، مدن موہن دانش اور قیصر خالد نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ نظامت کے فرائض نظر بجنوری نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جولائی 2012

مغربی بنگال:

اردو اساتذہ کی تقررہ کا مسئلہ

کولکاتا: سرکاری اسکولوں میں شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کی خالی پڑی اردو اساتذہ کی اسامیوں پر تقرری کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اردو اکادمی نے حکومت کو میمورنڈم دینے کی بات کہی۔ پریس کانفرنس میں صحافیوں سے خطاب کرتے ہوئے اردو اکادمی کے چیئرمین

منال شاہ قادری نے کہا کہ مغربی بنگال کے شہر کے اردو اسکولوں میں شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کے عہدے خالی ہیں۔ جس کی وجہ سے اسکول انتظامیہ کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اسکولوں میں خالی جگہ ہونے کے باوجود اردو داں ملازمت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اساتذہ اور مسلم تنظیموں کی جانب سے کئی مرتبہ مطالبہ بھی کیا گیا مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس مرتبہ اردو اکادمی حکومت کو میمورنڈم پیش کرنے جا رہی ہے۔ امید ہے ممتا بنرجی اس پر ضرور غور کریں گی۔

روزنامہ 'آزاد ہند' کولکاتہ، 13 جولائی 2012

اردو طلبا کی حوصلہ افزائی

کولکاتہ: حلیمن میموریل مادھیامک سکشا کیندر پیل خانہ، ہوڑہ میں جناب اختر جاوید کے زیر صدارت ہائر سکنڈری امتحانات میں بالخصوص اردو مضمون میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہونے والے طلبا و طالبات کی حوصلہ افزائی کے لیے جلسۂ تقسیم انعامات کا انعقاد کیا گیا۔ نظامت کے فرائض جناب اسمٰعیل پرواز نے انجام دیے۔ جلسے میں انجمن ترقی اردو کے ضلع ہوڑہ کے سکریٹری نے انجمن سرگرمیوں سے واقف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ انجمن ترقی 110 سالہ لسانی تحریک ہے جو ملک گیر سطح پر اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے کام کرتی ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے مدھیامک اور ہائر سکنڈری کے طلبا و طالبات کی حوصلہ افزائی کے لیے انھیں انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ امسال خادم اردو الحاج جناب ایم اے قاسم علیگ کی قیادت میں ایک وفد ضلع حکام DM سنگھا مترا گھوش سے ملا۔ ND کالج ٹکیہ پاڑہ میں اردو شعبۂ قائم ہونے پر ان کو مبارکباد دی۔ لال بابا کالج، وجئے کرشنا گرلس کالج، اور الوبیڑیا کالج میں اردو کا شعبہ قائم کرنے کا مطالبہ کیا۔ علاوہ ازیں اہل اردو کے ضلع ہوڑہ میں اقامتی درس گاہ اور ٹیکنیکل کالج قائم کرنے کا بھی مطالبہ کیا نیز ضلع لائبریری میں دوبارہ شعبۂ اردو کھولنے کا مطالبہ کیا DM نے جائز مطالبات کو تسلیم کیا اور ان مطالبات پر غور وخوض کرنے کے بعد اسے عملی جامہ پہنانے کا یقین دلایا۔ ڈاکٹر واصف اختر (صدر انجمن ترقی اردو ہوڑہ) نے کہا کہ DM کو ٹیکنیکل کالج کے لیے جگہ کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ انھوں نے اہل اردو سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ضلع ہوڑہ اردو کے جو مسائل ہیں اسے پیش کریں اور انجمن ترقی اردو کی تحریک میں شامل ہوکر اسے تقویت بخشیں۔ جناب محمد صدیق جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو مغربی بنگال نے کہا کہ شہر ہوڑہ عرصہ دراز سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ مقابلے کے دور میں ضلع ہوڑہ کا ایک نوجوان WBCS کے مقابلہ جاتی امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرکے اہل ہوڑہ کا نام روشن کیا ہے۔ انھوں نے طالب علموں کو مشورہ دیا کہ آپ مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری کریں صدر جلسہ جناب اختر جاوید نے اردو مضمون میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہونے طالب علموں کو مبارکباد پیش کی اور انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں کو سراہا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' کولکاتہ، 14 جولائی 2012

اعزاز و اکرام:

گوپی چند نارنگ

نئی دھلی: پاکستان کے یوم آزادی کے موقعے پر صدر پاکستان کی جانب سے اردو زبان و ادب کی اعلیٰ خدمات کے لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو 'ستارۂ امتیاز' کے قومی اعزاز سے سرفراز کیا گیا ہے۔ خیال رہے کہ ہندوستان کی فلمی دنیا سے دلیپ کمار کو 'نشان امتیاز' اور سیاسی شخصیات میں مرارجی ڈیسائی کو نشان پاکستان سے نوازا جا چکا ہے۔

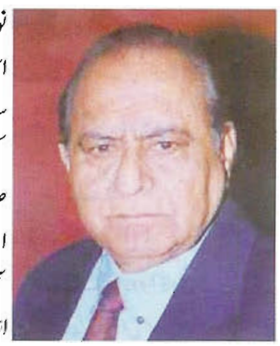

اس بار چونکہ سعادت حسن منٹو کی پیدائش کی صدی کا سال ہے، ان کو اور جوش ملیح آبادی کو بعد ازمرگ 'نشان امتیاز' جیسے اعلیٰ اعزازات دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بعد از مرگ اعزاز پانے والوں میں شہنشاہ غزل مہدی حسن کا نام بھی ہے۔ گوپی چند نارنگ کی غیر معمولی ادبی خدمات کا اعتراف اس سے پہلے بھی 1977 میں کیا جا چکا ہے اور اقبال صدی کے موقعے پر انھیں صدر پاکستان کا تمغۂ امتیاز عطا کیا گیا تھا۔ ان دنوں وہ امریکہ میں ہیں۔ انھوں نے ایوارڈ کے لیے حکومت پاکستان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ اردو زبان اور ہندستان کا اعزاز بھی ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ وہ اپنے کس کام کے لیے یاد کیا جانا پسند کریں گے تو انھوں نے کہا کہ اس احساس کو عام کرنے کی ضرورت ہے کہ اردو کا تعلق ہندوستان کی مٹی سے ہے اور ہندوستان پر اردو کا خاص حق ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، 15 اگست 2012

ادیبوں اور فنکاروں کو اعزاز

بھوپال: روٹری کلب کی سماعت گاہ میں تہذیبی، ادبی اور ثقافتی ادارے 'سب رنگ' نے فنون لطیفہ اور ادب و شعر سے وابستہ آٹھ مقتدر ہستیوں کا ان کی طویل خدمات کے اعتراف میں اعزاز کیا۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر آفاق احمد نے کی جب کہ مہمان خصوصی پدم شری منظور احتشام تھے۔ جن شخصیتوں کے اعتراف خدمات کے لیے اس تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا ان میں مدن موہن جوشی (صحافت اور سماجی خدمات)، جناب ظفر نسیمی (شاعر)، بیگم سکندر بخت آف محمد گڑھ (موسیقی و ثقافت)، محترمہ تیج سدھو (آرٹ کرم)، بنک چترویدی (ادب)، مہتاب عالم (میڈیا)، مکیش ورما (افسانہ نگار) اور حمید اللہ ماموں (اسپورٹس) شامل تھے۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے مدن موہن جوشی نے کہا کہ اس تقریب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اسٹیج پر پروفیسر آفاق احمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ اعزاز یافتگان میں صرف شاعر یا ادیب نہیں ہیں بلکہ مختلف فنون و ادب اور زبانوں کی اہم شخصیات شامل ہیں اور اس طرح ادب و ثقافت اور فنون لطیفہ کی ایک کہکشاں سج گئی ہے۔ دیگر اعزاز یافتگان نے بھی سب رنگ کی کاوشوں کو سراہا۔ سب رنگ کے سرپرست ڈاکٹر شفیع ہدایت قریشی دیتاوی نے شکریہ ادا کیا۔ سکریٹری شایان قریشی نے سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کی۔ صدر سید رئیس الحسن سالک نے استقبال کیا۔ نظامت بدر واسطی نے کی۔

روزنامہ 'ندیم' بھوپال، 16 جولائی 2012

صالح منیر

بنگلور: کرناٹک اردو اکادمی کے لائبریری ہال میں معروف بزرگ شاعر، ادیب و کہنہ مشق صحافی جناب صالح منیر کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ جلسے میں صالح منیر کے علاوہ، جناب اسجد نواز ریسیڈنٹ ایڈیٹر راشٹریہ سہارا، بنگلور، کرناٹک اردو اکادمی کے چیئرمین جناب حافظ کرناٹکی، اکادمی کے رجسٹرار ایس مرزا عظمت اللہ، جناب سید رفیع اللہ، اقلیتی بہبود کے سکشن آفیسر وغیرہ موجود تھے۔ نظامت جناب شفیق عابدی نے کی۔ مرزا عظمت اللہ نے مہمانوں کا استقبال کیا اور جلسے کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ جناب خلیل فتح نے اپنے خطاب میں کہا کہ اکادمی نے صحافیوں کا اعزاز کرکے اردو دنیا میں ایک بہت اچھا قدم اٹھایا ہے۔ جناب فیاض قریشی نے جناب صالح منیر کی صحافتی خدمات پر روشنی

ڈالی۔ جناب اسعد نواز نے کہا کہ جناب صالح منیر صحافت کی ایک بلند ترین شخصیت کا نام ہے، ان کی انگلیاں تھام کر ایک نسل نے چلنا سیکھا۔ جناب صالح منیر نے اعزاز کے جواب میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ملک کے مختلف علاقوں میں مختلف زبانوں کے درمیان میل جول کو زبان اردو نے برقرار رکھا۔ مختلف زبان کے بولنے والوں کو ایک کڑی میں پرودیا ہے۔ جناب نیر ربانی نے سپاس نامہ پڑھ کر سنایا۔ صالح منیر کے اعزاز میں پانچ ہزار روپے نقد، سپاس نامہ، شال، گل ہار اور مومنٹو پیش کیا گیا۔

روز نامہ 'سالار' بنگلور، 12 جولائی 2012

ثروت خان

اودے پور: راجستھان اردو اکادمی، جے پور کی جانب سے ڈاکٹر ثروت خان کو ان کی اردو نثر کی خدمات کے اعتراف میں صوبہ کے وزیر اعلیٰ جناب اشوک گہلوت نے اکادمی کے سالانہ جلسہ میں 'احترام الدین شاغل ایوارڈ' سے نوازا۔ جے پور کے عظیم الشان رویندر منچ میں منعقد ہونے والے اس جلسے میں صدر جلسہ محترمہ بینا کاک وزیر سیاحت، فن، ثقافت اور آثار قدیمہ، ممبر پارلیامنٹ جناب اشک علی ٹاک جناب مہیش جوشی، لوک سبھا نمائندے، صدر مدرسہ بورڈ، راجستھان کے علاوہ راجستھان کی سبھی اکادمیوں کے چیئرمین، ادبا، شعرا، دانشوران کے علاوہ متعدد طلبا، طالبات اور اساتذہ حضرات نے شرکت کی۔ اس ایوارڈ کے ملنے کی خوشی میں میواڑ کے قلم کاروں کی تنظیم 'ادبی سنگم' کے سبھی ممبران ڈاکٹر ثروت خان کو دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

بذریعہ ڈاک، مشتاق چنچل، (صدر ادبی سنگم) اودے پور 20 جون 2012

رسم اجرا

جہانِ سائنس

نئی دھلی: انجمن تعمیر اردو دہلی کے زیر اہتمام ایک تقریب کے دوران ممبر پارلیمنٹ و سابق ڈپٹی چیئرمین راجیہ سبھا کے. رحمان خاں نے کہا کہ مذہب اور سائنس میں حالانکہ بظاہر تضاد نظر آتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے یہ صرف 'کمیونی کیشن گیپ' ہے۔ یہ دوری ہماری کم علمی کی وجہ سے ہے، جس پر ہمیں نظر ثانی کی ضرورت ہے، اگر اردو میڈیم اسکولوں کے علاوہ مدارس میں سائنس کی کتابیں مہیا کر دی جائیں تو علما اور سائنس کے درمیان فاصلہ کم ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں محمد نسیم اختر (سابق ٹیکنیکل آفیسر، CSIR، نئی دہلی)

کی تصنیف کردہ کتاب 'جہانِ سائنس' کا اجرا کرنے کے بعد بطور مہمانِ خصوصی اپنی تقریر میں کیا، انھوں نے کہا کہ محمد نسیم اختر کی یہ کوشش ملّت کے لیے بڑا تحفہ ہے۔ پروگرام کی صدارت گلزار دہلوی نے کی۔ جبکہ مہمانانِ ذی وقار کے طور پر مرکزی وزیر قانون سلمان خورشید، پروفیسر اختر الواسع، وائس چیئرمین اردو اکادمی، دہلی، پروفیسر عتیق اللہ، ایمیریٹس فیلو پروفیسر، پروفیسر ایم اے فریدی، ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی، سائنسداں، حسن جاوید خاں ایڈیٹر 'سائنس رپورٹر'، چودھری متین احمد ایم ایل اے و چیئرمین دہلی وقف بورڈ، ڈاکٹر نریندر ناتھ ایم ایل اے، سابق وزیر، ڈاکٹر تابش مہدی، عظیم اختر، انجم عثمانی، دوردرشن اور منظور عثمانی وغیرہ نے شرکت کی۔ وزیر قانون اور اقلیتی اُمور سلمان خورشید نے محمد نسیم اختر کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے سائنس کے موضوع پر جو کتاب لکھی ہے وہ قابل تعریف ہے کیونکہ آج اردو زبان کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ انھوں نے 'جہانِ سائنس' کے تعلق سے کہا کہ مصنف نے اردو تہذیب و ادب اور سائنس کو ایک صف میں لانے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ وہی قومیں آگے بڑھتی ہیں جن کے یہاں تحقیق کا جذبہ ہوتا ہے۔ انہوں نے قرآن پاک کے حوالے سے سائنس کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مذہب کو سائنس کا حریف نہیں سمجھنا چاہیے۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں۔ انھوں نے اہم سائنسی مضامین کے ساتھ ساتھ مسلمان سائنسدانوں کی خدمات سے بھی روشناس کرایا ہے۔ ہمیں سائنسی فکر اور سائنسی سوچ کے فروغ کے لیے کام بھی کرنا چاہیے۔ پروفیسر اختر الواسع نے انجمن تعمیر اردو کو کتاب کے اجرا کی تقریب منعقد کرانے پر مبارکباد دی۔ پروفیسر عتیق اللہ تابش نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے سائنسی علوم کے 'جہانِ سائنس' کے مصنف کو مبارکباد پیش کی۔ صدارتی تقریر میں انجمن تعمیر اردو کے جنرل سکریٹری گلزار دہلوی نے ایک نظم ستاروں سے آگے پیش کی۔ سابق ممبر اردو اکادمی، محمد نسیم اختر کی ستائش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ان کی کتاب بہت مقبول ہوگی اور اسکولوں کے طلبہ کی تعلیم و تربیت کا بڑا ذریعہ ثابت ہوگی۔ چودھری متین احمد نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ مصنف نے جو کوشش کی ہے اس سے سائنسی مزاج فروغ پائے گا۔ ڈاکٹر نریندر ناتھ، سابق وزیر نے کہا کہ سائنس، ٹکنالوجی ایک ایسا موضوع ہے جو ہر روز نئی نئی باتیں سامنے لاتا ہے۔ محمد خلیل نے کہا کہ ناواقفیت کی بنا پر سائنس ہمیں مشکل لگتی ہے، یہ کتاب اس مشکل کو آسان کرے گی۔ عظیم اختر نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ جو کوشش محمد نسیم اختر نے کی ہے، اسے انہیں آگے بھی جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ عظیم اختر نے پروفیسر اختر الواسع صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کتاب اردو اکادمی، دہلی اور NCPUL کثیر تعداد میں خرید کر بچوں کو تقسیم کرائے۔ نیز دیگر ریاستوں میں بھی اردو اکیڈمیاں اور اردو ادارے اس کی تقسیم کی ذمہ داری قبول کریں۔ اس سے قبل خیر مقدمی کلمات اور اظہارِ تشکر ادا کرتے ہوئے کتاب کے مصنف محمد نسیم اختر نے کہا کہ کتاب 'جہانِ سائنس' کا مقصد تجارتی یا ذاتی تشہیر نہیں ہے بلکہ یہ کتاب اردو میڈیم اسکولوں اور دینی مدارس کے طلبہ، مسلم اداروں اور عام اردو داں حلقوں میں سائنسی تعلیم کو فروغ دینے، سائنسی طرزِ فکر پیدا کرنے اور سائنسی معلومات فراہم کرنے میں کارآمد ثابت ہوگی۔

پریس ریلیز نسیم اختر، دہلی 25 جولائی 2012

النور انٹرنیشنل

امروھه: ہاشمی ڈگری کالج میں النور انٹرنیشنل کے تازہ شمارے کا رسم اجرا بدست ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی عمل میں آئی۔ ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے بتایا کہ ایک عرصے سے نور امروہوی امریکہ سے یہ ادبی پرچہ نکال رہے ہیں۔ یہ سووینئر دراصل مشاعرہ اور کوی سمیلن ہے جو 30 جون کو امریکہ میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس مشاعرے کے ذریعے انھوں نے گنگا جمنی تہذیب کو پیش کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور اس میں کامیاب بھی ہو رہے ہیں وہ ایک زمانے سے دیار غیر میں اردو کے چراغ روشن کر رہے ہیں یہ نئی نسل کو اردو زبان سے جوڑنے کی ایک مہم ہے جسے وہ بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ شوق امروہوی اور افسانہ نگار شکیل جاوید نے کہا کہ نور امروہوی آندھیوں میں چراغ جلا رہے ہیں۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 20 جولائی 2012

اخبار 'الہلال' کی رونمائی

امروھه: اردو زبان کے نمائندہ اخبار 'الہلال' کے 100 سال پورے ہونے پر امروہہ کے معروف شاعر امین عالم رابن امروہوی نے اس اخبار کی رونمائی اردو

زبان سے وابستہ لوگوں کو کرائی اور اردو زبان سے منسلک تنظیموں سے درخواست کی کہ اس سال کو الہلال صدی کے طور پر منایا جائے۔ ایک مقامی اسٹوڈیو میں دی گئی اس رونمائی تقریب میں شہر کی کئی علمی ادبی شخصیات نے حصہ لیا اور امین علم رابن کی اس درخواست کی تائید بھی کی۔ شاعر اقبال رابن امروہوی نے اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے اس بابت اپنے بیان میں کہا کہ بھارت رتن مولانا ابوالکلام آزاد کی زیرنگرانی شائع ہونے والے اردو زبان کے اخبار 'الہلال' نے جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کیا اور اس اخبار میں مولانا کی تحریر نے عوام میں جوش اور ولولہ پیدا کر دیا تھا، 1927 کے جدید ایڈیشن دکھاتے ہوئے امین عالم نے کہا کہ 15 سال بعد ان ایڈیشن میں ادارہ کی جانب سے نئی تقنین یعنی ٹائپ کا استعمال ہونے لگا تھا، امین عالم نے ہمدرد سے درخواست کی کہ اس سال کو الہلال صدی کے طور پر منائے جانے میں ہمدرد کوئی پہل کریں کیونکہ الہلال کی اشاعت میں بھی ہمدرد نے ہی پہل کی تھی اور اس اخبار کو مالی تعاون دے کر اس کو شائع کرانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس موقعے پر موجود انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری شوق امروہوی نے الہلال صدی منانے پر اردو اکادمی اتر پردیش اور دلی سے درخواست کرتے ہوئے کہا کہ ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو اخبارات نے جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اس میں الہلال پیش پیش رہا ہے، اس موقعے پر امین عالم نے اخبار کو دستاویز کی شکل میں انجمن ترقی اردو کو سونپ دیا تا کہ یہ اخبارات نئی نسل کے لیے محفوظ ہو جائے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، 7 اگست 2012

وفیات:

ڈاکٹر شریف احمد

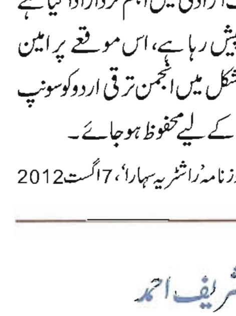

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے سابق صدر و ہر دل عزیز استاذ ڈاکٹر شریف احمد کا 20 جولائی کو طویل علالت کے بعد دوپہر تقریباً 2 بجے دہلی کے ہارٹ اینڈ لنگز اسپتال میں علاج کے دوران انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 81 سال تھی۔ ان کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ کے علاوہ 2 بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ ان کی تدفین مہندیان کے قبرستان میں ہوئی۔ ڈاکٹر شریف احمد کا تعلق اتر پردیش کے قصبہ امروہہ سے تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم امروہہ میں ہوئی اس کے بعد وہ مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ممبئی چلے گئے اور وہیں سے بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور بمبئی یونیورسٹی میں بحیثیت استاذ مقرر ہوئے اور ریڈر بھی رہے۔ 1964 میں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے منسلک ہوگئے۔ یہاں اس وقت ان کے ساتھیوں میں ڈی یو کے شعبہ اردو کے بانی خواجہ احمد فاروقی، ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر فضل الحق، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، وغیرہ شامل تھے۔ وہ دہلی یونیورسٹی کی ہر دلعزیز شخصیت تھے اور ان دنوں دریا گنج علاقہ میں مقیم تھے۔ دو مہینے قبل انھیں ممبئی میں دل کا دورہ پڑا تھا اور نانا وتی اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ دہلی میں انھیں دوسرا دل کا دورہ پڑا اور ہارٹ اینڈ لنگز اسپتال میں داخل کرایا تھا۔ ان کے انتقال سے پوری ادبی دنیا میں غم کی لہر دوڑ گئی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 جولائی 2012

عبدالرشید

ممبئی: ممتاز اردو صحافی عبدالرشید کا ممبئی کے مضافات کرلا نہرو نگر میں حرکت قلب بند ہونے کے سبب انتقال ہوگیا۔ عبدالرشید گزشتہ 2 ماہ سے نمونیا کی وجہ سے صاحب فراش تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 76 برس تھی۔ مرحوم نوجوان صحافیوں کی ہمیشہ رہنمائی کرتے تھے ان کی حوصلہ افزائی کے سبب کئی نوجوان ملک کے مختلف اخبارات میں آج صحافتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کا تعلق بہار کے مشہور شہر بہار شریف سے تھا جہاں کے محلّہ خانقاہ میں آج بھی ان کا خاندان آباد ہے۔ عبدالرشید کی تعلیم کلکتہ یونیورسٹی میں ہوئی۔ گریجویشن کرنے کے بعد وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے اور عرصہ تک کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے سرگرم رکن بھی تھے۔ عبدالرشید 1960 کے قریب ممبئی آگئے اور یہاں اس وقت کے مشہور روزنامہ 'خلافت' میں بطور نیوز ایڈیٹر ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد 23 ستمبر 1965 کو اپنا اخبار روزنامہ 'اردو رپورٹر' شائع کرنا شروع کیا جو آفسیٹ مشین پر شائع ہونے والا پہلا اردو روزنامہ تھا خاص طور پر ان کی تحریر کردہ سرخیوں کی وجہ سے بے حد مقبول ہوا۔ انھوں نے ہندی کا ایک ہفتہ وار اخبار 'مدھیہ کال' بھی شائع کیا تھا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 22 جولائی 2012

ہاجرہ بانو

نئی دھلی: قدیم دہلی کے تاریخی علاقہ بلیماران کی معروف شخصیت و سماجی کارکن محمد سلیمان دہلوی کی اہلیہ و انڈو۔قطر اردو مرکز کی بانی ممبر اور گزشتہ 2 دہائیوں سے بھی زائد عرصے سے قطر اردو ریڈیو سروس میں اناؤنسر، نیوز کاسٹر اور ادبی پروگراموں کی پروڈیوسر، ہاجرہ بانو (64) کا طویل علالت کے بعد دوحہ کے الخود حماد اسپتال میں 31 جولائی کو انتقال ہوگیا۔ مرحومہ مشہور عالم دین اور مجاہد آزادی رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی پوتی تھیں اور ان کی پرورش ان کے ماموں اور مشہور ماہر تعلیم و صحافی مولانا عزیز الرحمٰن لدھیانوی کے زیر سایہ ہوئی تھی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 اگست 2012

سعید اختر

کٹک: اڑیسہ کے سب سے بزرگ شاعر جناب سعید اختر کا 1 جون بروز جمعہ 91 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ 2 جون بروز سنیچر قدم رسول کٹک میں ان کی تدفین ہوئی۔ موصوف کی پیدائش 30 نومبر 1921 کو ہوئی تھی۔ انتقال سے دو ماہ قبل تک بالکل ٹھیک تھے، لیکن عارضۂ قلب و جگر میں مبتلا ہو کر دو مہینے کے اندر ہی داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ان کا ضخیم مجموعۂ کلام 'تخیل کی دسترس' زیر طبع ہے۔ ان کا ذکر شعرا اڑیسہ کا تذکرہ 'آبِ خضر' (مولفہ کرامت علی کرامت)، نئے تنقیدی مسائل اور امکانات (کرامت علی کرامت)، اڑیسہ میں اردو (حفیظ اللہ نیولپوری) اور 'ساغرِ جم جام سفال' (اسلم بدر) میں موجود ہے۔ ان کا بچپن اور بڑھاپا کٹک میں گزرا اور ملازمت کا ایک طویل عرصہ جمشید پور میں۔ انھوں نے دونوں جگہ شعر و ادب کی خدمت میں اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ مشاعرے منعقد کر کے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ ایک زمانے میں مشرقی ہند کے مشاعروں میں چھائے ہوئے تھے۔ 9 جون 2012 کو فیضان ادب (کٹک) کی جانب سے ان کی رحلت پر ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت سید منور احمد قاسمی (سابق سکریٹری اڑیسہ اردو اکادمی) نے فرمائی۔ سعید رحمانی مدیر 'ادبی محاذ'، ناظم قمر، اثر نظامی، نور الٰہی ناطق، محمد مرشد وغیرہ نے مرحوم کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا اور ڈاکٹر اختر حسین شافی نے ان کی ادبی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی۔ ان کی یادگار میں کٹک میں 'گلشنِ سعید اختر' کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی گئی جس کا مقصد اڑیسہ میں اردو شعر و ادب کا فروغ اور اردو تعلیم کو عام کرنا ہے۔

بذریعہ ڈاک، کرامت علی کرامت، کٹک، اڑیسہ، 24 جولائی 2012

خراج عقیدت

پروفیسر سید مظفر اقبال

پٹنہ: بزرگ ادیب و شاعر پروفیسر ڈاکٹر سید مظفر اقبال (سابق صدر شعبۂ اردو، ڈین فیکلٹیز آف ہیومنٹیز، ممبر سنڈیکیٹ، تلکا مانجھی، بھاگلپور یونیورسٹی، کے ناگہانی سانحہ ارتحال پر سینئر جرنلسٹ افتخار عظیم چاند، مقالہ نگار محمد نسیم احمد قریشی، انشائیہ نگار ڈاکٹر محمد مظاہر الحق، نوجوان شاعر ڈاکٹر پرویز قیصر مائل، افسانہ نویس محمد توحید انور (ببلو)، وغیرہ نے اپنے شدید رنج وغم اور گہرے صدمے کا اظہار کرتے ہوئے موصوف کے اہل خانہ سے اظہارِ تعزیت کی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر سید مظفر اقبال گزشتہ 6 سال (سن 2006) سے مستقل علیل چل رہے تھے اور صاحبِ فراموش تھے، مورخہ 26 جون 2012 بروز منگل، بہ وقت 4 بجے سہ پہر اپنی زندگی کی آخری سانس لی اور بھاگلپور میں اس دارفانی کو خیرباد کہہ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمیں روتا بلکتا چھوڑ کر دارالبقا کی جانب کوچ کر گئے اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے (اناللہ وانا الیہ راجعون) مورخہ 27 جون بروز چہارشنبہ بعد نماز ظہر ان کی تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ 'آسماں تری لحد پر شبنم افشانی کرے' آمین۔ پروفیسر سید مظفر اقبال کئی کتابوں کے مصنف و مرتب تھے (1) بہار میں اردو نثر کا ارتقا (2) تنقیدی مضامین (مجموعہ) اور مثنوی سوز و گداز (ترتیب) خاص اور مقبول ہیں۔ جناب پروفیسر مظفر اقبال کی گرانقدر ادبی خدمات کے اعتراف میں 'میرا اکادمی' لکھنؤ اور دوسری اکادمیوں نے انھیں اعزازات وانعامات سے سرفراز کیا ہے۔

بذریعہ ڈاک، محمد نسیم احمد قریشی، پٹنہ، 28 جون 2012

شعری بھوپالی، کیف بھوپالی، شفا گوالیاری اور عبدالقوی دسنوی

بھوپال: اقبال لائبریری کی ادبی تنظیم کوثر چاند پوری کلچرل فورم نے اپنی ادبی روایت قائم رکھتے ہوئے 15 جولائی کو کیف بھوپالی، شعری بھوپالی، شفا گوالیاری اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے ایامِ وفات پر تقریب خراج عقیدت منعقد کی۔ پروفیسر محمد نعمان خان نے دہلی سے تشریف لا کر بطور مہمانِ گرامی شرکت فرمائی۔ سہ ماہی 'انتساب' کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر سیفی سرونجی کی صدارت میں پروفیسر اطہر راہی نے 'کیف بھوپالی کی غزلیات'، رہبر جونپوری نے 'شفا گوالیاری، ذرات سے صفات تک' اقبال مسعود نے 'دبستانِ بھوپال کا مہکتا ہوگا گلاب' رشید انجم نے 'اردو علم و ادب اور درس و تدریس کے وٹ ورکش'، پروفیسر عبدالقوی دسنوی' اور شعری اکادمی کے سربراہ مقبول واجد نے 'روایت در روایت کا شاعر شعری بھوپالی' عنوانات کے تحت فکری اور تحقیقی مضامین پڑھے اور پروفیسر ارجمند بانو افشاں نے قوی صاحب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ نظامت کے فرائض بدر واسطی نے اپنے مخصوص ادبی و شعری انداز میں انجام دیے۔ کیف صاحب کی صاحبزادی پروین کیف اور صاحبزادے شاہد کیف و پوتے فاضل کیف کے علاوہ شفا گوالیاری کے دونوں صاحبزادے حمید شفائی اور جمیل شفائی، نعیم کوثر اور دیگر ادیب، شاعر اور شاعرات بھی بطور خاص موجود تھے۔ پروفیسر محمد نعمان خان نے اس موقعے پر کہا کہ اسلاف کو یاد کرنا اور ان کے کارناموں کا ذکر کرنا خوش بختی ہے اور یہ ہمارے لیے اور آنے والی نسلوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ ڈاکٹر سیفی سرونی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اقبال لائبریری کے فیض سے میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری پائی۔ انھوں نے کوثر چاند پوری کلچرل فورم کی کارکردگیوں کی ستائش بھی کی۔

بذریعہ ڈاک، اقبال لائبریری، بھوپال 16 جولائی 2012

شہزاد احمد شہزاد

امروہہ: فروغ اردو فاؤنڈیشن کی جانب سے مشہور شاعر شہزاد احمد شہزاد کے سانحہ ارتحال پر ایک تعزیتی نشست کا اہتمام مرتضیٰ شجاع سکندر امروہوی کی صدارت میں ڈاکٹر نشتر امروہوی کی رہائش گاہ پر کیا گیا۔ نشست میں سوسائٹی کے عہدیداران نے شاعر شہزاد احمد شہزاد کے سانحہ ارتحال پر شدید رنج وغم کا اظہار کیا۔ سوسائٹی کے سکریٹری ڈاکٹر نشتر امروہوی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شہزاد احمد شہزاد کی موت سے شاعری کا ایک اہم باب ختم ہوگیا۔ آپ کا نام شہزاد احمد اور شہزاد تخلص تھا۔ آپ کی ولادت 16 اپریل 1932 کو ہوئی۔ اور یکم اگست 2012 کو آپ کا انتقال ہوا۔ آپ نے تمام مضامین کو اپنی شاعری میں نظم کیا ہے۔ ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ رومانی مباحث کو ایک نئے انداز میں نظم کرنے میں مہارت رکھتے تھے ان کی شاعری کا سکہ تا دیر چلتا رہے گا۔ ڈاکٹر رضی امروہوی نے کہا کہ آج پوری دنیا انھیں منفرد لب و لہجے کے شاعر کی حیثیت سے جانتی اور مانتی ہے۔ سوسائٹی کے صدر مرتضیٰ شجاع سکندر امروہوی نے کہا کہ شہزاد کا شمار پاکستان کے عظیم شعرا میں ہوتا تھا جو گزشتہ کئی دہائیوں سے اپنے قلم کا معقول استعمال کر کے ادب میں اپنا منفرد مقام بنائے ہوئے تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 اگست 2012

ڈاکٹر کنول ڈبائیوی

نئی دہلی: معروف قومی شاعر اور محقق ڈاکٹر کنول ڈبائیوی کی اٹھارہویں برسی کے موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحق نے فرمایا کہ کنول ڈبائیوی کی ادبی و تحقیقی خدمات قابل تحسین ہیں۔ مرحوم نے قومی و ملی معاملات کی ترجمانی کے لیے زندگی وقف کی تھی۔ پروفیسر عتیق اللہ نے انھیں ایک بے لوث ادبی خدمت گزار قرار دیتے ہوئے ان کی ادبی تصنیفات کا تفصیل سے جائزہ لیا اور کہا کہ ان کی وطن پرستی قابل رشک ہے۔ ان کے یہاں حالی و چکبست کا انداز نظر آتا ہے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر محمد شاہد حسین نے لوک ادب پر ان کے تحقیقی کام کو سراہتے ہوئے کہا عوامی ڈرامائی روایات پر کنول ڈبائیوی کا کام نہایت وقیع اور بنیادی ہے، جس میں سوانگ، رہس، خیال اور بھگت کا تفصیلی ذکر شامل ہے، کنول ڈبائیوی سے پہلے کسی نے اس طرح کا تحقیقی کام نہیں کیا۔ معروف شاعر پروفیسر شہپر رسول نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ کنول ڈبائیوی مرحوم صاحب نظر بزرگ تھے، بحیثیت انسان اور ادیب و شاعر ان پر یہ مصرع صادق آتا ہے: نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ۔ وہ بہت خاموشی کے ساتھ نہایت سنجیدہ اور وقیع ادبی کام مرتے دم تک کرتے رہے، سوانگ نوٹنکی پر ان کی تحقیقی کوشش سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ پروفیسر قاضی عبیدالرحمان ہاشمی نے کہا کہ انھوں نے اقبال کی روایت کو آگے بڑھایا۔ پروفیسر ابن کنول نے کنول ڈبائیوی کی شخصیت کے بعض پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ اس موقع پر ڈاکٹر محمد اکمل شاداب اور ڈاکٹر ابوشہیم خان نے بھی کنول ڈبائیوی کی شاعری پر اظہار خیال کیا۔

پریس ریلیز، ابن کنول، نئی دہلی، 5 اگست 2012

پروفیسر وہاب اشرفی

(1)

گورکھپور: معروف نقاد پروفیسر وہاب اشرفی کے انتقال پر ملال پر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی میں ایک

تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت شعبہ کے سابق صدر ڈاکٹر محمد رضی الرحمٰن نے کی اور نظامت کا فریضہ اردو کی اسکالر سیدہ خاتون نے انجام دیا۔ جناب صدر نے اپنے تعزیتی کلمات میں کہا کہ پروفیسر وہاب اشرفی کا انتقال ایسے وقت میں ہوا ہے جب اردو کی ادبی دنیا بڑی شخصیتوں سے خالی ہوتی جارہی ہے۔ لہٰذا ان کی غیر موجودگی سے اردو والوں کو اپنی کم مائیگی کا احساس کچھ اور ہوا ہوگا۔ بنیادی طور پر پروفیسر وہاب اشرفی ایک کامیاب استاد اور موجودہ وقت کے نامور نقاد تھے۔ مولانا اطہر قاسمی استاد باب العلوم نے کہا کہ ایسی شخصیتیں ایک زمانے کے بعد جنم لیتی ہیں انھوں نے شاگردوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی ذہنی اور قلمی تربیت کی۔ زمانے کے اعتبار سے ایک بڑا کام ہے۔ ڈاکٹر مشیر احمد نے کہا کہ پروفیسر وہاب اشرفی ایک کامیاب استاذ اور عہد حاضر کے نظریہ ساز نقاد تھے۔ بالخصوص بہار میں اور بالعموم اردو دنیا میں آپ کے کام کو سراہا گیا۔ آپ نے اردو کی خدمت تاعمر کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ساجد حسین انصاری ریسرچ اسکالر اشفاق احمد وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 جولائی 2012

(2)

نئی دھلی: اردو زبان وادب کے ممتاز نقاد اور دانشور **پروفیسر گوپی چند نارنگ** نے وہاب اشرفی کی رحلت پر اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ وہ اردو زبان و ادب کے ایک بلند پایہ نقاد اور محقق تھے۔ وہ ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ اور اپنی تحریروں میں تابندہ رہیں گے۔ ان کے جانے کا غم ہمیشہ رہے گا۔ انھوں نے اپنے ذاتی مراسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ایک اور بہترین دوست کھو دیا۔ انھوں نے کہا کہ وہاب اشرفی نقاد اور محقق ہی نہیں تخلیق کار بھی تھے۔ وہ زندگی کے آخری دنوں میں بھی متحرک اور فعال رہے۔ وہ بہادر انسان تھے۔ انھوں نے کبھی خرابی صحت کی پروا نہیں کی اور مسلسل لکھتے رہے۔

شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے منعقدہ تعزیتی جلسے میں صدر شعبہ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ پروفیسر وہاب اشرفی کا شمار عہد حاضر کے ممتاز ناقدین، محققین، مورخین اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ ان کے علمی وادبی کارناموں کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ شعبۂ اردو کے اساتذہ اور طلبہ پروفیسر وہاب اشرفی اور اشفاق محمد خاں کے سانحہ ارتحال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں۔ اس تعزیتی جلسے میں پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے پروفیسر وہاب اشرفی کی سادگی، منکسرالمزاجی کا ذکر کرتے ہوئے انھیں صاحب بصیرت شخص قرار دیا۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے وہاب اشرفی کی خدمات اور شخصیت دونوں کو متاثر کن بتایا۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے اشفاق محمد خاں کی علمی خدمات کا اعتراف کیا اور کہا کہ وہ تمثیلی مشاعرے کے بہترین اداکار تھے۔ پروفیسر شہناز انجم نے دونوں علمی وادبی شخصیات کے بارے میں اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دونوں حضرات سادہ دل، نیک اور مخلص انسان تھے۔ پروفیسر شہپر رسول نے وہاب اشرفی کو ایک رہنما اور ان کے علمی اور ادبی تنوعات کو مشعل راہ قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اشفاق محمد خاں بہت ہی شفیق بزرگ تھے۔ دونوں حضرات کا گزر جانا ہمارے لیے بڑا نقصان ہے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے وہاب اشرفی کی گوناگوں علمی وادبی خدمات کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ ایک متنوع، ہمہ جہت اور غیر معمولی ذہن ودل کے انسان تھے۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے اشفاق محمد خاں کو مرنجاں مرنج، دوستوں کا دوست اور اپنے سے لاپروا اور دوسروں کا خیال رکھنے والا شخص بتایا۔ انھوں نے وہاب اشرفی کو ایک فعال اور فیض رساں شخصیت قرار دیا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر میں انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی صدارت میں منعقد تعزیتی نشست میں شرکا نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ انجمن کے نائب صدر سید شریف الحسن نقوی نے کہا کہ وہاب اشرفی کے ساتھ میرا رابطہ ان دنوں سے تھا جب میں دہلی اردو اکادمی کا سکریٹری تھا۔ انھوں نے قابل قدر علمی کارنامے انجام دیے ہیں۔ اردو ادب کے ایڈیٹر ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ وہاب اشرفی ان لوگوں میں سے تھے جو علمی مشاغل میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی نے کہا کہ وہاب اشرفی جب بھی دہلی تشریف لاتے تو دہلی کے ادبی حلقوں سے برابر رابطہ قائم کر کے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم علیل ہونے کے سبب اس نشست میں شریک نہیں ہو سکے لیکن انھوں نے ٹیلی فون پر وہاب اشرفی کو خراجِ عقیدت پیش کیا پروفیسر قدوائی نے بھی وہاب اشرفی کی خدمات کا تذکرہ کیا۔

آن لائن اردو اخبارات اردو نیٹ جاپان کے مدیر اعلیٰ ناصر ناکاگاوا اور بیورو چیف برائے ہندوستان کامران غنی نے مشترکہ بیان میں بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب، ناقد اور محقق پروفیسر وہاب اشرفی کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے ان کے انتقال کو اردو زبان وادب کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ ناصر ناکاگاوا نے کہا کہ وہاب اشرفی جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جولائی 2012

(3)

نئی دھلی: قومی اردو کونسل کے سابق وائس چیئرمین چندر بھان خیال، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر مولا بخش، پروفیسر توقیر احمد خاں، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بھی وہاب اشرفی کے انتقال پر شدید غم کا اظہار کیا اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 جولائی 2012

(4)

نئی دھلی: شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر حسین الحق، پروفیسر عتیق اللہ، انیس اعظمی، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، پروفیسر خالد محمود، مشرف عالم ذوقی، پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر محمد کاظم نے بھی پروفیسر وہاب اشرفی کے سانحۂ ارتحال پر اظہار تعزیت کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جولائی 2012

(5)

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر وہاب اشرفی کے سانحہ ارتحال پر تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر محمد زاہد، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر امتیاز احمد اور دیگر نے ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔

روزنامہ 'خبر جدید' 19 جولائی 2012

(6)

ہزاری باغ: ہزاری باغ میں ظہیر غازی پوری نے شدید رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی موت سے ادبی تنقید کا ایک باب خاموش ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر زین رامش نے وہاب اشرفی کو ادب کا ایک رہنما بتایا اور ان کی موت کو ادب کا بڑا خسارہ قرار دیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 17 جولائی 2012

□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو صرف ونحو

مصنف: اقتدار حسین خاں
صفحات: 136
قیمت: -/38 روپے

ایک معلم کی زندگی (حصہ اول)

مصنف: عبدالغفار مدہولی
صفحات: 478
قیمت: -/126 روپے

ایک معلم کی زندگی (حصہ دوم)
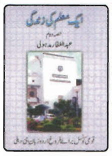
مصنف: عبدالغفار مدہولی
صفحات: 479
قیمت: -/126 روپے

آثار الصنادید (جلد اول)

مصنف: سید احمد خاں
مرتب: خلیق انجم
صفحات: 400
قیمت: -/232 روپے

شہیدان آزادی (جلد اول)
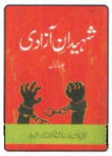
چیف ایڈیٹر: پی. این. چوپڑا
صفحات: 570
قیمت: -/113 روپے

شہیدان آزادی (جلد دوم)
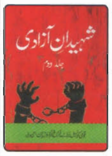
چیف ایڈیٹر: پی. این. چوپڑا
صفحات: 480
قیمت: -/100 روپے

آثار الصنادید (جلد دوم)

مصنف: سید احمد خاں
مرتب: خلیق انجم
صفحات: 310
قیمت: -/230 روپے

بادشاہ

مصنف: میکاؤلی
مترجم: ڈاکٹر محمود حسین
صفحات: 199
قیمت: -/90 روپے

آزادی
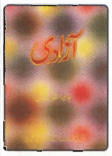
مصنف: جان اسٹوارٹ مل
مترجم: سعید انصاری
صفحات: 184
قیمت: -/52 روپے

آثار الصنادید (جلد سوم)

مصنف: سید احمد خاں
مرتب: خلیق انجم
صفحات: 428
قیمت: -/255 روپے

سر سید احمد خان
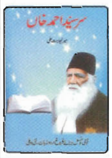
مصنف: میر نجابت علی
مترجم: سید ابوالحسنات
صفحات: 24
قیمت: -/7 روپے

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان
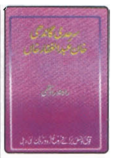
مصنف: راجندر اوتھی
مترجم: منظور عثمانی
صفحات: 78
قیمت: -/21 روپے

تذکرۃ البلاد والحکام

مصنف: میر حسین علی کرمانی
مترجم: شفیع احمد شریف شفیع
صفحات: 385
قیمت: -/126 روپے

اقبال اور بچوں کا ادب
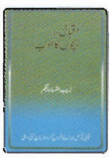
مصنفہ: زیب النساء بیگم
صفحات: 216
قیمت: -/60 روپے

رتن ناتھ سرشار

مصنف: پریم پال اشک
صفحات: 108
قیمت: -/17 روپے

جان کمپنی سے جمہوریہ تک جدید ہندوستان کی کہانی
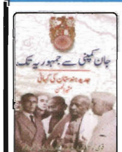
مصنف: مشیر الحسن
مترجم: مسعود الحق
صفحات: 345
قیمت: -/114 روپے

بچوں کے حالی

مرتبہ: صالحہ عابد حسین
صفحات: 63
قیمت: -/14 روپے

پریم چند

مصنف: ڈاکٹر قمر رئیس
صفحات: 69
قیمت: -/31 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com

URDU DUNIYA Monthly, September 2012, Vol.14, Issue: 09
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2011-13
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication : 24/8/2012
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

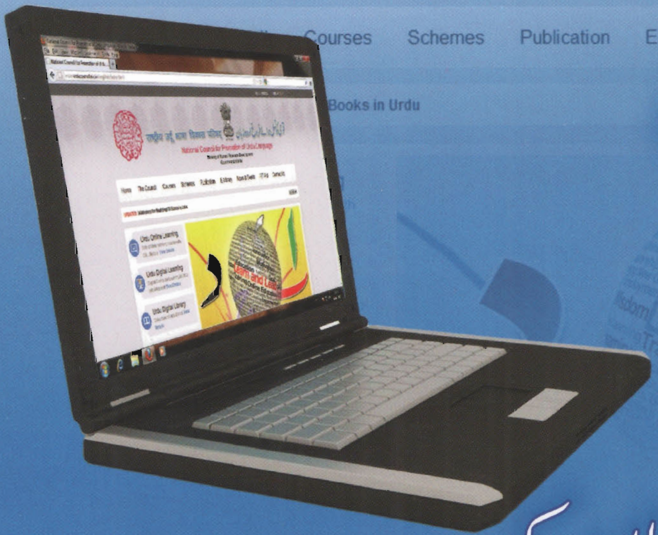

اب گھر بیٹھے سیکھیں اردو زبان
اور وہ بھی اپنے کمپیوٹر پر
بغیر کسی استاد کے بالکل مفت
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے
آن لائن اردو لرننگ کورس کی مدد سے

کمپیوٹر سیکھنا اب ہوگا آسان
ہر گھر میں پہنچا
ڈیجیٹل کمپیوٹر لرننگ پروگرام

کونسل کی بہترین مطبوعات
وہ بھی بغیر کسی پریشانی کے بالکل مفت
اب دستیاب ہیں
آپ کے اپنے کمپیوٹر پر

لوگ ان کریں ...

www.urducouncil.nic.in

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor :Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000